ہو جاتا۔

اول خان کے نوادرات کے ذخیرے سے دستیاب ہونے والی انگوٹھیوں کی کارکردگی میرے لیے آزمودہ تھی۔ ہم لوگ چائے نوشی سے فارغ ہوئے تھے کہ حامد نے دفتر میں آکر بخشی کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔ اول خان نے اٹھ کر دراز بند کی اور ہم اس کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

میرا خیال تھا کہ بھارتی فوج کے ریٹائرڈ میجر بخشی کو ایس ٹی ایف کی روایات کے مطابق کسی خالی کوٹھری میں بند کیا گیا ہوگا لیکن میں اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی دفتر تھا۔ میز کے پیچھے پڑی ہوئی بڑی سی کرسی خالی تھی۔ میجر بخشی ملاقاتیوں والی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایس ٹی ایف کے دو سیاہ پوش اہل کار مسلط تھے جن سے وہ نالاں نظر آرہا تھا۔

اس نے ہمیں بہت غور سے دیکھا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔

اول خان اس پر کوئی خاص توجہ دیے بغیر گھومنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ میں نے پہلو میں پڑی ہوئی کرسی سنبھال لی تاکہ کسی حد تک بخشی کے چہرے کا جائزہ لیتا رہوں۔ وہ میز کے ایک سرے پر اول خان کے روبہ رو موجود تھا۔ حامد دونوں ماتحتوں کے ساتھ دیوار کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بخشی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ ضروری مذاکرات کرنے تھے۔" اول خان نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر خشک لہجے میں کہا "تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میجر بخشی نے بے بسی سے اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں پھر کہا "یہ کوئی سرکاری دفتر معلوم ہوتا ہے۔ شاید تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں تمہارے ملک میں مہمان سفارت کار ہوں۔ مجھے ویانا کنونشن کے تحت یہاں بہت سے تحفظات اور سہولتیں حاصل ہیں۔ تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ مجھ سے کوئی شکایت ہے تو میرے سفارت خانے سے رجوع کرو اور مجھے ناپسندیدہ قرار دے کر یہاں سے نکال دو۔ اس سے آگے تمہاری ہر حرکت غیر قانونی ہوگی۔"

"تمہیں قانون پڑھانے کے لیے نہیں لایا گیا۔" اول خان کا اشارہ پا کر میں نے سخت لہجے میں کہا "تمہیں اگر قانون کی ابجد سے بھی واقفیت ہے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ شرفا کو فون پر قتل و خوں ریزی کی دھمکیاں دینا کس قدر سنگین جرم ہے۔"

"میں نے کسی کو کوئی دھمکی نہیں دی۔" اس نے ہڑبڑاتے ہوئے، مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"میرا نام مظہر ہے۔" میرے وہ الفاظ اس کے اعصاب کے لیے بم ثابت ہوئے۔ وہ کرسی میں یوں اچھلا جیسے اچانک کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "آج صبح سویرے تم نے مجھے دھمکیاں دی تھیں۔ ان کے جواب میں تم اس وقت یہاں نظر آرہے ہو۔ یہ اظہر ہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اول خان کی طرف اشارہ کیا "چاہو گے تو روی بھی یہاں آجائے گا۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس نے اپنے نچلے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "میں کسی اظہر یا مظہر کو نہیں جانتا۔ روی میرے مرنے والے دوست کا بھائی ہے مگر مجھے اس سے بھی کوئی پرخاش نہیں ہے۔ میں کسی کو فون پر کیوں دھمکیاں دوں گا؟"

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر تمہاری آواز پہچان لی گئی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور ٹہلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بوکھلا کر اپنی کرسی چھوڑ دی۔ گفتگو شروع ہونے کے بعد اس کا خوف دھیرے دھیرے دہشت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

میں اس کے سامنے کھڑا، چند ثانیوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر یکایک میرا داہنا ہاتھ گردش میں آیا۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ بھرپور طمانچہ اس کے بائیں رخسار پر پڑا اور وہ اپنا توازن کھو کر کرسی سمیت فرش پر گر گیا۔

طمانچہ کھا کر اس کے منہ سے چند مہمل آوازیں نکلی تھیں پھر وہ پھٹ پڑا "یہ ظلم اور زیادتی ہے۔ تم مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے..."

"شٹ اپ!" میں نے دہاڑ کر اسے ڈانٹا پھر اس کی قمیص کا کالر کھینچ کر اسے فرش سے اٹھنے میں مدد دی۔ پہلی مار کھا کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔

"تت... تم... مظہر نہیں ہو۔" وہ خوف زدہ آواز میں ہکلایا "تمہاری آواز بدلی ہوئی اور کچھ جانی پہچانی سی ہے۔"

"ہاں!" میں نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹی "اب تمہارا دماغ صحیح سمت میں چل رہا ہے۔ صبح میں نے تمہاری آواز پہچان کر اپنی آواز بدل لی تھی۔ ذہن پر تھوڑا سا زور دو گے تو تمہیں ریٹائرڈ کرنل جمال دستی یاد آجائے گا۔ تمہیں آخر دنوں میں اس پر شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ ڈبل ہے۔ تم اور اوبرائن اسے گھیرنا چاہ رہے تھے۔ وہ تم سے کھیل رہا تھا۔ وہ سب میرے ہی روپ تھے۔"

Downloaded from https://paksociety.com

میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ میرے خاموش ہونے پر اس کے ہونٹوں سے پھنسی پھنسی، سرگوشیانہ آواز برآمد ہوئی "تم ڈینی ہو؟ اس کا مطلب ہے کہ میرے شبہات روزِ اول ہی سے درست تھے۔"

"اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ تم کہاں ہو۔ یہ کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے۔ یہ کمرا تمہارا مقبرہ بھی بن سکتا ہے۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لینے کے بعد تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

"تھوڑا سا تعاون!" میں نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہمیں معلوم ہے کہ تم بڈھے ہو۔ آوارگیوں کی وجہ سے تمہاری ہڈیوں کا گودا بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتے۔ بولتے رہو گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اڑنے یا مکاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا حشر کرشن کمار اور ہری چند سے بھی زیادہ خراب ہوگا۔ ہم تمہیں سسکا سسکا کر مار ڈالیں گے۔"

"تمہارے تیور خراب ہیں۔" وہ اپنے بائیں رخسار کو سہلاتے ہوئے بولا "تم نے مجھے بتایا ہے کہ تم ہی ڈینی ہو۔ یہ تمہاری نیت کی خرابی کی نشانیاں ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔ میں کچھ بھی کرلوں، تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔"

میں نے اسے پوری بات کہہ لینے کا موقع دیا پھر زبان کھولی "ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم نے ہٹ دھرمی نہ دکھائی تو تم زندہ رہو گے۔ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ ہم خاموشی سے تمہیں آزاد کردیں گے۔"

"میں کیسے مان لوں؟ تم آج تک صرف اس وجہ سے زندہ ہو کہ تمہاری کوئی تصویر ریکارڈ پر نہیں ہے۔ کوئی تمہیں دیکھ کر ڈینی کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا۔ تم ایسے آدمی کو کیوں زندہ چھوڑو گے جو تمہیں پہچاننے کے قابل ہو چکا ہو۔"

"یہ پرامن بقائے باہمی کا سودا ہوگا۔" اس کے اٹھائے ہوئے مضبوط نکتے پر چند ثانیوں تک غور کرنے کے بعد میں نے زبان کھولی "تم مجھے بھولے رہو گے، میں تمہیں نظرانداز کرتا رہوں گا۔ جس دن تم نے میرے خلاف زبان کھولی، موت کہیں نہ کہیں سے تم پر ٹوٹ پڑے گی۔"

"تمہارے لیے میں دشمن ہوں... دشمنوں میں بھی شاید ایک نمبر دشمن۔ میں تمہارے قبضے میں آیا ہوا ہوں۔ تمہیں میری زندگی سے کیا محبت ہو سکتی ہے۔ تم مجھے کیوں زندہ رہنے دو گے؟ تم کیوں مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہے ہو؟"

وہ بدکا ہوا تھا اسے راہِ راست پر لانے کے لیے یقین دلانا ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے زندہ رکھنے کے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں جلال کے فلسفے نے سر ابھارا اور میری زبان خود بہ خود چل پڑی۔

"تم ہمارے گلے کی ہڈی ہو۔" میں نے کہا "تمہیں نگلا جا سکتا ہے نہ اگلا جا سکتا ہے۔"

وہ خاموش اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری طرف سے مزید وضاحت کا منتظر ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اس خبیث کو ایک بھاری سی گالی دے کر اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھا "اس بات کو یوں سمجھ لو کہ تم کتنے ہی بدمعاش اور موذی سہی، یہاں اپنے ملک کے ایک اہم سفارتی افسر ہو۔ تمہیں مار دیا گیا تو نئی دہلی میں اس کا ردِعمل ہوگا۔ تمہاری برادری کے لوگ تمہارے رتبے کے کسی پاکستانی افسر کو مار ڈالیں گے۔ یہ سودا بہت مہنگا ہوگا۔ یہ خطرہ ہم مول لے سکتے ہیں اور نہ نئی دہلی والے ایسی کوئی حماقت کریں گے۔ آپس کی دیرینہ دشمنی کے باوجود یہ خوف دونوں کے سفارتی عملے میں چھپے ہوئے سرکاری جاسوسوں اور مخبروں کی زندگی کا ضامن ہے۔ اب تمہیں یقین آجانا چاہیے کہ تم زندہ رہو گے۔"

"تم بہت خوں خوار اور درندہ صفت دشمن ہو۔ تمہاری شہرت خراب ہے۔ دشمن ہاتھ آجائے تو تم اسے بے رحمی سے ادھیڑ ڈالتے ہو۔ تمہاری زبان سے زندگی کی یہ سب یقین دہانیاں عجیب محسوس ہو رہی ہیں۔" وہ میری طرف سے شدید بے اعتمادی میں مبتلا تھا۔

"میں اتنا سفاک نہیں ہوں۔ تمہیں مارنا ہوتا تو میں اسی وقت تمہارا خاتمہ کردیتا جب میں جمال دستی بن کر تمہارے بہت قریب ہو گیا تھا۔ جس خوف نے اس وقت مجھے تمہارے خون سے دور رکھا وہی اندیشہ اب بھی تمہاری زندگی کا ضامن ہے۔"

اس کا دہانہ خشک ہو رہا تھا اس نے تھوک نگل کر بولنے کی کوشش کی تو اس کے الفاظ کا تلفظ بگڑا ہوا تھا "تم پر اعتبار کرنا مشکل ہے پھر بھی تم پوچھ لو۔ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مجھے آدمی کے بدلے آدمی چاہیے۔ شیام کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے براہِ راست سوال کیا۔

"تو کیا تم میرے بجائے اسے مارنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو؟" اس نے میرے سوال پر چونک کر پوچھا۔

"تمہیں اپنی زندگی کے سوا کسی اور چیز سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے سرد مہری سے کہا "شیام یہاں کوئی سفارتی افسر نہیں ہے۔ وہ یہاں کا شہری ہے۔ اس نے

Downloaded from https://paksociety.com

کوئی غداری کی ہے تو اس کو سزا ملنی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا۔"

"اس نے کسی سے غداری نہیں کی۔ وہ سب آپس کی باتیں تھیں۔ کرشن کو ہمیشہ سے دھڑکا رہتا ہے کہ روی کسی بھی وقت اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔ اس ڈر کی وجہ سے اس نے شیام کو موہن ہاؤس میں ڈالا ہوا تھا۔ کرشن کمار کا وہ ڈر بالکل صحیح تھا۔ شیام نے خبر دی ہے کہ اسے روی نے ہی تمہارے ہاتھوں مروایا تھا۔ اس نے کرشن کمار کے ساتھ اپنے سالے سے بھی بے وفائی کی۔۔۔"

"آپس کی ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ وہ ایسی ذاتی باتیں تم تک کیوں پہنچاتا تھا؟" میں نے پیچیدہ ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ماروتی کے لچھن اچھے نہیں ہیں مگر وہ کرشن کمار کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ میں نے جب بھی اس سے قریب ہونے کی کوشش کی' اس نے مجھے انکل کہہ کر میرے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ اس خوب صورت ناگن کی وجہ سے میں نے کرشن کمار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی کو اس گھر کی نگرانی پر لگادے۔ اس نے شیام کو وہاں بھیج دیا۔ وہ اپنی خبریں مجھے دیتا تھا۔ میں کرشن کمار سے بات کرلیا کرتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اور کرشن کمار کے درمیان گہرے مراسم تھے؟" میں نے طنز سے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو کہ جب سیکرٹ ایجنٹ اپنے ملک سے باہر رہ کر ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان کیسی گہری دوستیاں ہوجاتی ہیں۔" اس نے اس مرتبہ کھلے دل سے جواب دیا "یہ دوستیاں عمر بھر کام آتی ہیں۔ کبھی کبھی لے ڈوبتی ہیں۔" کرشن کمار یہاں اپنا کام کررہا تھا۔ اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ہمارا تعلق ماروتی اور شیام سے آگے کچھ نہیں تھا۔"

"تم کرشن کمار سے لاتعلق تھے تو وہ یہاں کس کی ہدایات پر کام کررہا تھا؟"

"اس سوال کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس کی ٹوہ لینے کی کوشش نہیں کی۔" بخشی کا بایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر ایک مرتبہ پھر وہ رخسار سہلانے میں مصروف ہوگیا جو طمانچے کی زد میں آیا تھا۔

"تم انل بسواس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے توقف کے درمیان سگریٹ سلگانے کے بعد اچانک پوچھ لیا۔

اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تیر رہی تھی "تمہارے دشمن تم سے بلاوجہ خائف نہیں رہتے۔ تم بہت باخبر معلوم ہوتے ہو۔ وہ انڈین سیکرٹ سروس کا ایک سینیر افسر ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا تمہیں بھی معلوم نہیں کہ کرشن کمار اسی کے لیے کام کررہا تھا؟" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ترش ہوگیا۔

"مجھے انل بسواس کی صحیح پوسٹنگ کا علم نہیں ہے۔ اگر وہ را کے پاکستان ونگ کا سربراہ ہے تو پھر کرشن کمار اسی کو جواب دہ ہوگا۔" وہ وہی بات کہہ رہا تھا جو جلال نے مجھے پورے وثوق سے بتائی تھی۔

انل بسواس کے بارے میں بخشی کے آخری جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی مزاحمتی قوت دم توڑ چکی تھی۔ بس وہ اپنی پیشہ ورانہ فطرت سے مجبور ہوکر ہر جواب میں آڑ موڑ سے کام لے رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ آس اس نکتے سے بندھی تھی کہ میں نے جمال دستی کے روپ میں اس سے بہت قریب ہوتے ہوئے اس کی جان لینے کی کوشش نہیں کی تھی تو اصل روپ میں سامنے آنے کے بعد بھی میں اس کی جان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی وہ ضمانت مل جانے کے بعد بخشی مجھ سے پوری طرح تعاون کررہا تھا۔

بخشی جن دنوں کراچی میں پیش آنے والے واقعات میں پوری طرح ملوث تھا' میں نے اس وقت اس کی طرف سے چشم پوشی اختیار کرلی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ ان دنوں تقریباً گوشہ نشین تھا۔ وہ اپنی کسی نئی سرگرمی کے نتیجے میں سزا کا مستحق نہیں تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرکے اسے چھوڑ دیتا تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ میری قید میں رہتے ہوئے جو وعدے کرتا' آزادی مل جانے کے بعد انہیں سرے سے فراموش کردیتا اور اپنے تجربات کو را کے ریکارڈ کا ایک حصہ بنوا دیتا۔ اس کی ایسی کوئی حرکت مستقبل میں ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔

"باتوں کے جال میں تم نے میرے ایک سوال کو ابھی تک الجھایا ہوا ہے۔" میں نے اس سے ہونے والی ساری گفتگو کو اپنے ذہن میں دہراتے ہوئے خشک لہجے میں کہا "میرے ہر سوال کا جواب دیے بغیر تم آزادی حاصل نہیں کرسکو گے۔"

"اب کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے تمہیں ہر بات بتادی ہے۔ کرشن کمار کے مشن کے بارے میں مجھے تفصیل کا علم نہیں ہے۔"

"مشن خفیہ ہوتے ہیں۔" کرشن کمار کا ذکر نکل آنے پر میں نے وہی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لیکن قریبی لوگ بھانپ لیتے ہیں کہ کون کیا کررہا ہے۔ تم نے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"بھارت میں آباد ہندو ہی نہیں' مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اب اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ دو قومی نظریہ غلط تھا۔ اس کی بنیاد پر خون کے دریا بہا کر برصغیر کو تقسیم کرنا اس سے بھی بڑی غلطی تھی۔ یہ زمین ہمیشہ سے ایک تھی اور اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ یہاں بھیجے جانے والے ہر خفیہ مشن کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔ مقصد حاصل کرنے کے طریقے حکومتوں کے آنے جانے سے بدلتے رہتے ہیں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"یہ اکھنڈ بھارت کا پرانا نعرہ ہے۔ اس کے ذریعے ہندو پورے علاقے پر اپنا راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔" اول خان نے کہا۔

"برصغیر ہمیشہ سے غیر مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے۔" اس نے اپنے الفاظ کی حمایت میں وہ زہریلا مواد اگلنا شروع کردیا جو نہ جانے کب سے اس کے ذہن میں پک رہا تھا "چھوٹے موٹے رجواڑوں کو چھوڑ کر محمود غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک' مسلمانوں نے اس خطے پر راج کیا۔ یہ راج اکثریت کے بل پر نہیں ملا تھا۔ آج بھی وہی حکومت کرتا ہے جو طاقت ور ہوتا ہے۔ طاقت کی پوجا برصغیر کے رہنے والوں کے خمیر اور مزاج میں شامل ہے۔ بھارت ایک تھا' اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس پر کون حکومت کرتا ہے۔ جس میں طاقت اور صلاحیت ہوگی' وہی اکھنڈ بھارت کو چلائے گا۔ جب باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان صدیوں حکومت کرگئے تو اکھنڈ بھارت میں بسنے والے کروڑوں مسلمان دوبارہ اپنے بزرگوں کے وارث کیوں نہیں بن سکتے؟"

"تم اکھنڈ بھارت بنا کر خاموشی سے مسلمانوں کی بالادستی قبول کرلو گے؟" اول خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم برا نہ مناؤ تو مجھے کہنے دو کہ تم جیسے تنگ نظر سب کچھ گڈمڈ کردیتے ہیں۔ اکھنڈ بھارت کو اسلام اور مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اسلام اسی خطے کا مذہب ہے۔ یہ باہر سے آیا اور پھر یہاں پھیلتا چلا گیا مگر یہاں بسنے والے سارے مسلمان بغداد اور مدینے سے نہیں آئے۔ وہ پرانے زمانوں سے یہاں بسے ہوئے آریاؤں' دراوڑوں اور دوسری قوموں کی اولادیں ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا اور بڑوں کے مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوگئے۔ یہ سلسلہ دس بیس پشتوں سے یوں ہی چلا آرہا ہے۔ کبھی کسی نے مذہب کی بنا پر زمین کی تقسیم کا نعرہ نہیں لگایا تھا۔"

"اپنی یہ بکواس بند کرو" اول خان نے غصے میں اس کی بات کاٹ دی "تمہاری یہ رٹی رٹائی تقریر سادہ لوح دیہاتیوں کو گمراہ کرسکتی ہے۔ ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تم لوگوں نے حقائق کو اسی طرح مسخ کیا ہوا ہے۔"

"تم نے چھیڑا ہے تو پھر مجھے اپنی بات پوری کرنے دو" میجر بخشی نے ڈھٹائی سے اصرار کیا اور اپنی بات جاری رکھی "ہماری اصل لڑائی صرف پاکستان سے ہے۔ جب امریکا میں مسلمان رہتے ہیں' چین میں رہتے ہیں تو اکھنڈ بھارت میں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"دو قومیں اور دو ملک" اول خان نے اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو پوری طاقت سے فضا میں لہرا کر کہا۔

"یہ غلط ہے۔ ملک قوموں سے نہیں بنا کرتے۔ مسلمان ایک قوم ہیں تو پھر بنگلہ دیش کیوں بنا؟ تم ایران' افغانستان اور عراق سے کیوں نہیں مل جاتے۔ یہاں سے ترکی اور پھر افریقہ کے ساحل تک سب ہی مسلمان ہیں۔ انہیں ملا کر ایک ملک کیوں نہیں بنا دیتے؟"

"اب تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گا" اول خان کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے مکا تان کر اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"ایک جبڑا ڈینی نے ہلایا ہے' دوسرا تم توڑ دو۔ میں بھارتی ہوں۔ تم میری آواز کو کچل سکتے ہو۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ہر ایک یہی سوال کرتا نظر آئے گا۔ تم کس کس کے جبڑے توڑو گے؟ مخالف کی بات سننے اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کا حوصلہ پیدا کیے بغیر تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"اسکالر بننے کی کوشش مت کرو" میں نے بخشی کو ڈانٹا "ہم تمہارے نظریات سننے کے لیے تمہیں یہاں نہیں لائے۔ تم سے جو پوچھا جارہا ہے' اس کا جواب دو۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر بولو گے تو میں بھی تم پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"شاید تمہاری پوچھ گچھ ختم ہوچکی ہے۔ اب مجھے جانے کی اجازت دے دو۔ میں نے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے کہ میری گاڑی باہر موجود ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ شیام کہاں روپوش ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

"تم ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہو" میجر بخشی نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اس کا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں لی مارکیٹ کے گلزار ہوٹل میں مل جائے گا۔ روکے کے گھر سے بھاگ کر وہ سیدھا وہیں پہنچا تھا۔ وہ ہوٹل میر اپنے اصل نام سے ہی ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ہوٹل کا پتا اور فون نمبر کیا ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"اس سے آگے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس نے خود مجھے فون کیا تھا۔ میرے لیے وہ کبھی بھی اتنا اہم نہیں رہا کہ میں

Downloaded from https://paksociety.com

اس کی نقل و حرکت سے ہر وقت باخبر رہنے کی کوشش کروں۔ وہ کوئی سستا، رہائشی ہوٹل ہوگا۔ آسانی سے مل جائے گا۔"

"اب شاید بخشی کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اسے بخش دینا چاہئے!" میں نے اول خان سے کہا۔

"کسی احتیاط کی ضرورت نہیں" اول خان دیوار کے قریب کھڑے ہوئے حامد سے مخاطب ہو کر بولا "بلکہ بہت احتیاط سے بخشی کو یوں سلا دو کہ اسے ہمیشہ کے لیے یادِ ماضی سے نجات مل جائے۔ وہ اب اس کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔"

"کک... کیا کہہ رہے ہو تم؟" میجر بخشی بوکھلا کر مدافعانہ انداز میں اپنی کرسی سے اٹھ گیا "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ ڈیڑھ نے مجھ سے معافی کا وعدہ کیا تھا۔"

"خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے نرمی سے اسے سمجھایا "یہ تمہیں بے ہوش کر کے کہیں پہنچا دیں گے۔"

"اب بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت ہے!" وہ گھبرایا ہوا تھا "مجھے معلوم ہے کہ میں اسپیشل ٹاسک فورس کے کسی اڈے پر ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خاموشی سے اپنی گاڑی میں گھر لوٹ جاؤں گا۔"

"یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا" اول خان نے بے رخی سے کہا "ایس ٹی ایف کے اس اڈے کا محل وقوع بہت اہم ہے۔"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ حامد اور اس کے دو ساتھیوں نے میجر بخشی کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ اس نے وحشت زدہ آوازوں میں چیخنا چلانا اور مچلنا شروع کر دیا۔ اس کا مقابلہ تین صحت مند اور توانا جوانوں سے تھا۔ اس کی ایک نہ چل سکی اور وہ تینوں اسے اٹھا کر اس کمرے سے نکل گئے۔ اول خان نے بھی کرسی چھوڑی اور ہم دونوں وہاں سے نکل کر اس کے دفتر میں آ گئے۔

"تم نے حامد کو سمجھا دیا تھا کہ بخشی کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟" میں نے اول خان سے تصدیق چاہی۔

"اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اب یادِ ماضی کا کوڑا استعمال کر کے اسے یاددہانی کرا دی ہے۔ وہ مارشل آرٹس میں مہارت رکھتا ہے۔ تربیت کے دوران میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ کھیل میں اپنے حریف کے سر کے کن حصوں پر ضرب لگانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایسی ضرب سے یادداشت ختم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

"یہ کوئی یقینی طریقہ نہیں ہے" میں نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اندازے کی ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو مشق بے سود ثابت ہوگی۔"

"میں اس امکان سے غافل نہیں ہوں" اول خان نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کی بے ہوشی زیادہ طویل نہیں ہوگی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ ہوش میں آئے گا تو اندازہ ہو جائے گا کہ ضرب کس حد تک کارگر رہی ہے۔ اطمینان کیے بغیر ہم اسے آزاد نہیں کریں گے۔"

"یہ دیکھنا تمہارا کام ہے۔ ہمارے پورے منصوبے میں یہ کارروائی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے میں نے فون اپنی طرف سرکا لیا اور گولڈن فارمیسی کا نمبر ملایا۔ اس وقت دوپہر ہونے والی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ جہانگیر اپنی دکان پر پہنچ چکا ہوگا۔ اس نے دوسری گھنٹی بجنے پر ریسیور اٹھا لیا۔

"تمہاری آواز بہت تروتازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صبح ٹھنڈے پانی سے نہا کر دکان پر آئے ہو؟" میں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ... بہت اچھا ہوا کہ تم نے فون کر لیا۔ میں پریشان تھا کہ اب تم سے کیسے رابطہ ہوگا؟"

"کیوں؟ کیا سلمٰی نے تمہارے فون کرنے پر کوئی پابندی لگا دی ہے؟" میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ بے چاری کیا پابندی لگائے گی، دراصل ہماری فون نمبروں والی ڈائری گم ہو گئی ہے، اسی وجہ سے میں رات کو فون نہیں کر سکا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم تمہارے گھر سے بہت مشکل سے زندہ بچ کر لوٹے ہیں۔ میری گاڑی میں دو سوراخ ہو چکے ہیں۔ وہ گولیاں ہمارے سروں میں بھی پیوست ہو سکتی تھیں۔"

جہانگیر کے اس انکشاف نے مجھے حیران کر دیا "اتنی رات گئے تم ہمارے گھر کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟"

"یوں سمجھ لو کہ شامت نے دھکا دیا تھا۔ تم دونوں کھانا چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ سلمٰی نے بار بار افسوس کیا تو میری کھوپڑی سنک گئی۔ تھوڑی سی ترنگ بھی تھی۔ ہم دونوں کھانا لے کر تمہارے گھر پہنچے تھے مگر وہاں رکنے سے پہلے ہی ہماری گاڑی پر دو بے آواز فائر ہوئے اور ہم بوکھلا کر بھاگ نکلے۔"

"اوہ! تو وہ تمہاری گاڑی تھی" میں نے دانت پیس کر کہا "ہم سب پریشان ہیں کہ ہمارے گھر کے پاس مشتبہ گاڑی کیا کر رہی تھی۔ وہ کسی شریف آدمی کے گھر کھانا پہنچانے کا کون سا وقت تھا...؟ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم دونوں کو رات فاقے سے گزارنی پڑی ہوگی۔"

"بس نشے کی جھونک میں کچھ زیادہ ہی ہمدردی ابھر آئی تھی" وہ میرے غصے کا برا منائے بغیر بولا "سلمٰی نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی تھی مگر مجھ پر معلوم تھا کہ میں ہر وقت

Downloaded from https://paksociety.com

تمہارے دروازے پر دستک دے سکتا ہوں۔ میں چل پڑا' یہ بتاؤ کہ وہ فائر کس نے کیے تھے؟"

"آئندہ بھول کر بھی ایسی حماقت نہ کرنا۔ آج کل ہماری چھت پر دو بے خطا نشانہ لگانے والے پہرے داری کرتے ہیں۔ انہوں نے گاڑی کا ہی نشانہ لیا تھا۔ تم کو زد میں لے لیتے تو ذرا سوچو کہ کیا ہوا ہوتا؟"

"چھوڑو یار! میرے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ اب کان پکڑتا ہوں کہ رات میں کبھی تمہاری طرف نہیں آؤں گا۔"

اول خان حیرت سے منہ پھاڑے میری یک طرفہ گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر اسے بتایا کہ رات گئے بلکہ صبح سویرے نظر آنے والی مشتبہ کار میں جہانگیر ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ وہ بات سن کر اول خان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ یہ غنیمت ہوا تھا کہ اس کے مامور کیے ہوئے پہرے داروں کے نشانے سچے تھے۔ ان سے اندازے کی ذرا سی بھی غلطی ہوئی ہوتی تو ایک المناک سانحہ رونما ہو سکتا تھا۔

"اب زیادہ ڈھنڈورا نہ پیٹو اور پہلے اپنا نمبر لکھوا دو" ریسیور میں جہانگیر کی خفت آمیز آواز ابھری۔

میں نے اپنے گھر کا نمبر دہراتے ہوئے کہا "نمبر نوٹ کر لو مگر میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں۔ کہیں اور سے بول رہا ہوں۔ میں نے ایک ضروری کام سے تمہیں فون کیا تھا۔ پتا نہیں تم وہ کام کر بھی سکو گے یا رہ جاؤ گے۔ اب تم کو کوئی ذمے داری سونپنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑے گا۔"

"رات کی اور بات ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ نشہ زیادہ ہو جائے تو عقل چوپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ دن میں' میں بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ مجھ سے زیادہ نخرے نہ کرو اور کام بتاؤ۔ کوئی ڈھنگ کا کام ہوا تو میں اسی وقت کر گزروں گا" وہ جوش میں آکر رکے بغیر بولتا چلا گیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے تمہیں اپنی دکان سے اٹھ کر جانا ہو گا۔" میں نے اس پر واضح کیا۔

"پہیلیاں نہ بجھواؤ' کام بتاؤ۔ ضرورت ہوئی تو میں تھوڑی دیر کے لیے دکان پر تالا بھی ڈال سکتا ہوں۔ دونوں ملازموں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اپنے ساتھ جلوس لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے اسے ڈانٹ دیا "لی مارکیٹ تمہاری دکان سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں گلزار ہوٹل پہنچ کر تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں شیام نامی شخص کس کمرے میں مقیم ہے۔"

"یہ تو کوئی کام ہی نہ ہوا۔ میں دس منٹ میں دیکھ آتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ گلزار ہوٹل میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"شیام کو معلوم نہ ہو سکے کہ تم اس کے بارے میں کچھ پوچھنے آئے تھے" میں نے اسے تاکید کی۔

فون پر جہانگیر کے ہنسنے کی آواز ابھری "میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اسی سے پوچھنے پہنچ جاؤں۔ چھوٹے ہوٹل کے کسی بیرے کے لیے پچاس روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا کھایا پیا تک معلوم ہو جائے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"بس پھر ابھی نکل جاؤ۔ میں پندرہ منٹ بعد تمہیں فون کروں گا۔ ہوٹل تمہاری دکان کے آس پاس ہی ہونا چاہیے۔"

میں نے فون بند ہی کیا تھا کہ اول خان بول پڑا "تم نے جہانگیر کو بلاوجہ ہی ملوث کر لیا۔ مجھے اس پر بھروسا نہیں ہے۔"

"تم اس کے ماضی سے لاعلم ہو اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ ایسے معاملات میں وہ ویرا اور سلطان شاہ کے کان کتر سکتا ہے۔"

"وہ لی مارکیٹ میں ہی بیٹھا ہوا ہے۔ شیام کا پتا چلا لے گا اور وقت بچ جائے گا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے تو میں ابھی کسی کو وہاں روانہ کیے دیتا ہوں۔ اسے ہوٹل سے نکال کر خاموشی سے یہاں پہنچا دیا جائے گا۔"

"پھر جہانگیر کی تصدیق کا انتظار نہ کرو۔ کسی کو بھیج دو" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "وہ کمرے میں نہ ہوا تو کسی نہ کسی وقت وہیں لوٹے گا۔ تمہارا آدمی ہوٹل کے آس پاس رک کر اس کا انتظار کر سکتا ہے۔ ہمیں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

حامد مصروف تھا۔ میجر بخشی کے قصہ نمٹے بغیر اسے کسی اور کام میں الجھانا مناسب نہیں تھا۔ اول خان نے گھنٹی بجا کر اپنے اردلی کو طلب کیا اور اس کے ذریعے ستار نامی کسی ماتحت کو دفتر میں بلوا لیا۔ ایس ٹی ایف کے بیشتر اہل کاروں کی طرح ستار بھی مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر نمودار ہونے والی' بالوں کی سفیدی اس کی ڈھلتی ہوئی عمر کی چغلی کھا رہی تھی ورنہ وہ اپنی صحت کے اعتبار سے جوان نظر آرہا تھا۔ اس نے دروازے سے اندر گھستے ہی اول خان کو فوجی انداز میں سلیوٹ کیا اور پھر اس کی میز کے سامنے پہنچ کر مودب انداز میں رک گیا۔

"لی مارکیٹ کے گلزار ہوٹل میں شیام نامی ایک شخص مقیم ہے" اول خان نے مختصر اور نپے تلے الفاظ میں اسے بتایا "خاموشی سے اسے اٹھا کر یہاں لانا ہے۔ ایم ٹی سیکشن والوں سے ڈاج سیمت گاڑی لے کر ابھی روانہ ہو جاؤ۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"یس سر!" اس نے ایڑیاں بجا کر کہا پھر پوچھا "سر! مار پیٹ، ٹوٹ پھوٹ کے لیے کوئی حکم؟"

"ضرورت کے تحت سب جائز ہوگا۔ ایریٹس ساتھ لے لینا تاکہ دیر ہونے کی صورت میں ریڈیو روم کو اطلاع دے سکو۔"

وہ ایڑیاں بجا کر پلٹا اور اول خان کے دفتر سے نکلتا چلا گیا۔ میری نگاہیں دروازے تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ اسپیشل ٹاسک فورس والوں کی زندگی بھی بہت عجیب اور قابلِ رشک تھی۔ وہ ویرانوں میں زندگی گزارتے تھے۔ گھر بار اور بال بچوں سے دور رہ کر دن رات خطرات سے کھیلتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک فرض ہی زندگی تھی اور فرض ہی تفریح۔ کرنے کو کچھ نہ ہو تو ان کے لیے ڈیوٹی کے اوقات مقرر تھے جن میں وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے کیمپ کی مختصر سی دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور کام نکل آتا تھا تو دن، رات یا موسم کی پروا کیے بغیر وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔

"جہانگیر کا گلزار ہوٹل جانا ضروری نہیں تھا لیکن اس بہانے اس سے تمہاری بات ہوگئی" اول خان کہہ رہا تھا۔

"اس احمق نے بہت بڑا عقدہ حل کردیا۔ وہ مشتبہ کار رہ رہ کر میرے ذہن میں چبھ رہی تھی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس وقت تم اسے فون نہ کرتے تو شاید یہ الجھن کئی دنوں تک برقرار رہتی۔ پتا نہیں اس کی گم شدہ فون ڈائری کب ملتی ہے۔ خوف کی وجہ سے وہ تمہارے گھر کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے تیر کر آنے والی گولیاں بڑے بڑے سورما کا پتا پانی کرسکتی ہیں۔"

"نشے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی کے ذہن پر جو دھن سوار ہوجائے وہ اسے بورا کرکے رہتا ہے۔ سلمٰی نے اسے خیال دلایا کہ ہم اس کے گھر سے بھوکے واپس گئے ہیں اور وہ وقت کی پروا کیے بغیر دو بھوکوں کو کھانا پہنچانے پر تل گیا۔"

"بھوکے!" اول خان ہنس دیا "وہ سمجھ رہا ہوگا کہ روئے زمین پر تم دونوں کا اس رات کا رزق اسی کے گھر میں اتارا گیا ہے۔ شراب کی ان خوبیوں اور خامیوں پر تم ہی روشنی ڈال سکتے ہو۔ میں نے کبھی چکھی اور نہ میں نشے کے اثرات سے واقف ہوں۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ نشہ بھنگی کو بادشاہ اور بادشاہ کو بھنگی بنا سکتا ہے۔ اس سے بچنا ہی سب سے بہتر ہے۔"

وقت بہت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اول خان کا اردلی اس کی عادات سے واقف تھا۔ اپنے افسر کو فرصت میں دیکھ کر وہ دوبارہ چائے لے آیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اول خان کو جلال کا خیال آگیا۔ ہماری توقعات کے برعکس اس نے اول خان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد حامد نے دفتر میں آکر اطلاع دی کہ میجر بخشی کے سر کے عقبی حصے پر لگائی جانے والی ضرب کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس کی یادداشت ماؤف ہوکر رہ گئی تھی۔ اول خان نے اپنا دفتر چھوڑنے کے بجائے بخشی کو حامد کے ساتھ وہیں بلوالیا۔

"بعض اوقات یادداشت عارضی طور پر ناکارہ ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ بحال ہوجاتی ہے۔ میں نے ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے اندیشہ ظاہر کیا "دیکھنا ہوگا کہ حامد کا وار کتنا کامیاب رہا ہے۔"

میجر بخشی دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے سے ساری بشاشت رخصت ہوچکی تھی۔ اس کا چہرہ سیاٹ تھا، آنکھیں بالکل ویران نظر آرہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں لاتعلقانہ انداز میں یوں حرکت کررہی تھیں جیسے اجنبی چیزوں کو دیکھ رہی ہوں۔

"میجر بخشی!" اول خان نے آزمانے کے لیے اسے پکارا۔ وہ چونک کر اول خان کی طرف متوجہ ہوا اور بڑھتا چلا آیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اول خان نے اسے ہدایت دی "اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے دفتر کے بجائے یہاں کیا کررہے ہو؟"

"مجھے نہیں پتا۔ کچھ یاد نہیں آرہا کہ دفتر کہاں ہے اور میں کہاں ہوں، تم کون ہو؟" اس نے الجھے الجھے لہجے میں کہا۔

"تمہیں اپنا نام معلوم ہے؟" اول خان نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرکے نرمی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر کچھ اور یاد نہیں آرہا" اس کی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی رمق نظر آئی۔ وہ اپنی بھوؤں پر زور دے کر تیوریوں میں بل ڈال ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی وہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی۔ وہ تھک کر جھنجلا گیا۔ اس کی آنکھیں بے رونق ہوگئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے بے اختیار اپنی کنپٹیاں بھینچ لیں "او بھگوان! ہر طرف اندھیرا اور سناٹا ہے۔ کچھ یاد نہیں آتا میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے، اسے توڑ دو۔"

وہ کسی گہری اذیت میں مبتلا تھا۔ اس کے اوپری ہونٹ کی جلد اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں۔

"تم روی، جگدیش، انل بسواس، کرشن کمار، ہری چند اور شیام میں سے کس کس کو جانتے ہو؟" اول خان کی آواز گونجی۔

Downloaded from https://paksociety.com

"چپ رہو۔۔۔ اب چپ رہو۔ اجنبی نام میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں' مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اول خان کی نگاہوں میں' اس کے لیے رحم کا جذبہ عود کر آیا "اسے لے جاؤ" اس نے حامد کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اور بے ہوش کر کے اس کی گاڑی سمیت کسی پتھریلے ساحل پر چھوڑ آؤ۔ گاڑی دور ہو اور یہ پتھروں پر پڑا ہوا ہو۔ سمجھنے والے سب کچھ سمجھ لیں گے مگر دوسروں کو یہ معلوم ہو گا کہ دیران ساحل کی سیر کرتے ہوئے بخشی پتھروں پر گرا اور سر پر چوٹ آنے سے بے ہوش ہو گیا۔"

"او کے سر!" حامد نے کہا اور بخشی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے کرسی سے اٹھالیا۔ اس کے لب خاموش تھے مگر اس کی آنکھیں کربناک انداز میں نیم وا تھیں۔ حامد اسے دھیرے دھیرے باہر لے گیا۔

"بظاہر حامد کامیاب رہا ہے" میں نے خوش ہو کر کہا "اب یہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔"

"اس کا قصہ نمٹ گیا۔ تم جلال سے کب بات کرو گے؟" اول خان نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر پوچھا۔

میں نے جیب سے موبائل فون نکال کر اس کا پاور سوئچ آن کر دیا اور کہا "اس کا فون نہ آیا تو میں گھر سے بات کروں گا۔" میرے ذہن میں یہ بات چبھ رہی تھی کہ جلال نے اس وقت تک اول خان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اول خان کی لاعلمی میں مجھ سے کسی موضوع پر بات کرنے کا خواہاں تھا۔ ایسی صورت میں اسٹیشن فور سے اسے فون کرنا مناسب نہیں تھا۔

اول خان اپنے کاموں سے فارغ ہو چکا تھا۔ میجر بخشی کو حامد کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ ستار' شیام کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ دفتر سے اٹھ گیا۔ اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ جہانگیر ہوٹل سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میری کال کا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں نے چلتے چلتے' اول خان کے فون پر اس کا نمبر ملالیا۔

وہ اپنی دکان پر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ہوٹل پہنچنے کے بعد شیام اپنے ضروری کاموں کے لیے صرف دو تین بار تھوڑی دیر کے لیے ہوٹل سے نکلا تھا ورنہ مسلسل اپنے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ناشتا اور کھانا بھی اس نے کمرے میں ہی منگوایا تھا۔

میں نے اسے بہت معمولی سا کام سونپا تھا جسے اس نے خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ برسوں پر محیط' ایک طویل وقفے کے بعد ایسا کام کرنے میں جہانگیر کو ایسا طف آیا تھا' وہ شیام کے بارے میں مزید بہت کچھ کرگزرنے پر آمادہ تھا۔

میں چند فقروں میں اسے ٹال کر اول خان کے ساتھ دفتر سے نکل آیا۔ باہر میجر بخشی کی گاڑی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ حامد چند منٹ کے اندر ہی اسے لے کر اسٹیشن فور سے روانہ ہو چکا تھا۔ ان لوگوں میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے میں کسی قدر تاخیر ہو سکتی تھی۔ فیصلوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں پوری فورس بہت زیادہ مستعد تھی۔ چند ثانیوں بعد ہم بھی واپسی کا سفر طے کر رہے تھے۔

ہماری گاڑی اسٹیشن فور اور چھاؤنی کی حدود سے کچھ ہی دور نکلی تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کی تو لائن پر جلال موجود تھا "تم کہاں غائب ہو؟" اس نے میری آواز سنتے ہی شکوہ کیا "اپنے گھر پر موجود نہیں ہو اور موبائل شاید بند کیا ہوا تھا۔ یہ میری پانچویں کال ہے۔ ہر بار ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی۔"

"بس' ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ موبائل واقعی بند تھا۔ تمہاری طرف خیریت تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت ہی ہے۔ میں اپنی بات بعد میں سناؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ کس چکر میں مصروف تھے۔"

"میجر بخشی ہمارے گلے پڑ گیا تھا۔ اس کا قصہ نمٹا رہا تھا۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا تھا۔ مجھے جواب دیتے ہوئے یہ اندازہ تھا کہ جلال میری زبان سے میجر بخشی کا نام سنتے ہی اچھل پڑے گا۔

"وہ کیسے گلے پڑ گیا؟" جلال کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی "میں نے تمہیں اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"ہم اسے بھولے ہوئے تھے مگر اس نے آج صبح فون کر کے مجھے دھمکیاں دی تھیں۔"

"میری مس ویرا لائیڈ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا۔

"تم نے بخشی کا ذکر کیا ہوتا تو وہ کچھ بتاتی۔ تم نے میرے بارے میں دریافت کر کے فون بند کر دیا تھا۔ اگر تمہیں میرے بیان پر یقین نہیں ہے تو تم اول خان سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ وہ پورے واقعات سے باخبر ہے۔"

"مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہم جدھر سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں' وہیں پھنس جاتے ہیں" اس کی آواز میں بے چارگی جھلکنے لگی "مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ میں اپنے آدمیوں کے تحفظ کے لیے ایسے ہر تصادم سے بچتا ہوں۔ تم نے بخشی سے زیادہ چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی؟"

"ہم جب [illegible] آتا۔ ہم

Downloaded from https://paksociety.com

اس کی یادداشت صاف کرکے آرہے ہیں۔"

"اوہو... یہ برا ہوا۔ اب دیکھ لینا' نئی دہلی سے جلد ہی ایسی کوئی خبر آجائے گی۔"

وہ اس واقعے کا پورا پس منظر جانے بغیر نتائج پر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ میں نے اسے تحمل سے پوری تفصیل سننے کا مشورہ دے کر اپنی کہانی شروع کردی۔ وہ درمیان میں ضمنی سوالات بھی کرتا رہا۔ جن کے نتیجے میں وہ موضوع خاصا طول پکڑ گیا۔ جب میں اپنی بات مکمل کرکے خاموش ہوا تو وہ اس بات سے متفق ہوچکا تھا کہ ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

"یہ ناگزیر خطرہ تھا جو تمہیں مول لینا پڑا۔ اب میری آرزو ہے کہ بخشی کو کچھ بھی یاد نہ آسکے اور اس کے بڑے اس کے سر میں آنے والی چوٹ کو ساحل کی تفریح کے دوران میں پیش آنے والے حادثے کا نتیجہ سمجھتے رہیں ورنہ پھر کوئی بے گناہ پاکستانی افسر عتاب میں آجائے گا۔"

"میرے ساتھ اول خان نے بھی یہی کوشش کی ہے مگر یہ بات کوئی ہضم نہیں کرسکے گا کہ بخشی موہن ہاؤس والوں سے تعزیت کرنے کے بعد دفتر لوٹنے کے بجائے ویران ساحل پر بکھرے ہوئے پتھروں پر ٹہلنے پہنچ گیا۔"

"یہ اندیشہ اپنی جگہ برقرار ہے" اس نے اعتراف کیا "وہ دفتر میں کسی نہ کسی کو اپنی سرگرمیوں سے ضرور باخبر رکھتا ہوگا۔ اس شخص کو معلوم ہوگا کہ بخشی کو صبح سویرے شیام کے ذریعے پیغام ملا اور بخشی نے اظہر اور مظہر کو چیلنج دے ڈالا۔"

"مجھے کسی اور کا خدشہ نہیں ہے۔ اس نے صبح چار بجے کے قریب اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا۔ پھر وہ گھر سے ہی موہن ہاؤس روانہ ہوگیا۔ وہاں سے واپسی پر وہ دھرلیا گیا۔ اسے دفتر میں اپنے کسی افسر یا ماتحت سے ملنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ فون پر کسی کو اپنی کارگزاریوں کی تفصیل سنانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ فوری طور پر شاید کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکے کہ بخشی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"اگر تم نے پہلے سے یہ سب سوچا ہوا تھا تو پھر میں بھی پرامید رہوں گا کہ تمہاری کارروائی کا کوئی جواب نہیں آئے گا۔"

"ساری باتیں پہلے سے طے شدہ نہیں تھیں۔ واقعات رونما ہونے کے ساتھ ساتھ فیصلے ہوتے رہے۔ اسے ساحل پر ڈلوانے کا فیصلہ اول خان نے مشورے کے بغیر اور اچانک کیا تھا۔ یہ بات مجھے ابھی ابھی سوجھی ہے کہ بخشی کو کسی سے تفصیلی بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مزید کچھ اچھے پہلو خود بہ خود سامنے آتے چلے جائیں۔"

"اسلام آباد خبروں کا گڑھ سمجھا جاتا ہے مگر یہاں سناٹا ہے۔ تم کراچی میں بیٹھ کر خبروں کو جنم دے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ بخشی کے دفتر میں ابھی تک کسی کو علم نہیں ہوا کہ اس پر کوئی افتاد آپڑی ہے۔ انہیں پتا چل جاتا تو انڈین ہائی کمشنر کے دفاتر میں کھلبلی مچ جاتی۔"

"وہ جگدیش موہن کی تعزیت کے لیے گیا تھا۔ اس کی ارتھی شام کو اٹھائی جائے گی" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "انڈین قونصلیٹ والے سمجھ رہے ہوں گے کہ اس نے اپنے ذاتی مراسم کی بنا پر آخری رسوم کی ادائیگی تک رکنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"پھر تو انہیں رات گئے ہی ہوش آئے گا۔ اس سے پہلے وہ اطمینان سے بیٹھے رہیں گے۔"

"میرا اندازہ ہے کہ اس سے پہلے پولیس بخشی تک پہنچ جائے گی۔ تم کو انڈین ہائی کمیشن کے ابتدائی ردعمل پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ اس سے پتا چلے گا کہ وہ معاملات کو کس رخ پر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"چیٹر چھاڑ میں پہل بخشی نے کی مگر ایسے تصادم کے لیے یہ وقت بہت ناموزوں ہے۔ تم بھارت جانے کا قصد کیے بیٹھے ہو۔ میری خواہش ہے کہ تم جلد از جلد وہاں پہنچ جاؤ۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں کوئی تلخی یا کشیدگی پیدا ہوئی تو تمہیں روانگی کا ارادہ ملتوی کرنا ہوگا۔"

"اب بخشی کو رونا بے سود ہے۔ اسے بھول جاؤ اور نئے واقعات کا انتظار کرو۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں میری تلاش کیوں تھی۔"

"میں تمہیں جگدیش موہن کی خودکشی سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ تم پہلے ہی اس واقعے سے باخبر ہو۔"

"وہ ایک الگ کہانی ہے۔ جگدیش نے ماروتی کی کج روی سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی ہے اور روی موہن اپنی جان بچانے کے لیے کسی اچانک بیماری کا بہانہ کرکے شہر کے کسی اسپتال میں پناہ گزین ہے۔ بخشی اس سے بھی بہت بدظن تھا۔" جگدیش کا ذکر آنے پر مجھے چند فقروں میں اصل کہانی دہرانی پڑی۔ جلال کے لیے وہ ایک نیا موضوع تھا۔ اس پر نت نئے واقعات منکشف ہورہے تھے۔ اس نے سوالوں کا سلسلہ شروع کردیا۔

بات سے بات نکلتی رہی اور مجھے شیام کا ذکر بھی کرنا پڑا۔ بخشی والی گڑبڑ میں کلیدی کردار اسی نمک حرام کا تھا۔

"اس کے بارے میں زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں" جلال نے فیصلہ کن آواز میں مشورہ دیا "بعض اوقات دو ٹکے کے آدمی اپنے ذرا سے لالچ کے لیے کوئی قیامت برپا

Downloaded from https://paksociety.com

کردیتے ہیں۔ بخشی کو شیام نے ورغلایا تھا۔ اپنے مالک کو دغا دینے والے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔"

"آج میں تمہاری زبان سے پہلی بار کوئی سخت فیصلہ سن رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اول خان چھوٹے گناہ گاروں کا خون بہانے سے ڈرتا ہے۔ شیام نے خود اپنے کسی بڑے جرم کا اعتراف نہ کیا تو اول خان اسے مارنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔"

"اسے سمجھاؤ کہ جب کسی گلتے ہوئے عضو کی وجہ سے انسان کی جان پر بن آئے تو ایسے عضو کی پرورش نہیں کی جاتی۔ بے رحمی سے عضو کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ آدمی لنگڑا یا لولا ہو جائے گا۔"

"اس وقت وہ ڈرائیونگ میں مصروف ہے۔ تم کسی وقت فون کر کے اسے خود ہی یہ بات سمجھا دینا۔ میری نظروں میں شیام بھی کرشن کمار کا ساتھی ہے۔ اسے مارنے کے لیے اس کا یہی ایک جرم کافی ہے۔ کرشن کمار اپنا الّو سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ عیب داروں کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا۔"

"میری ایک اور بات گرہ سے باندھ لینا" گفتگو کے دوران میں شاید جلال کو کوئی نئی بات یاد آگئی "بھول کر بھی امیگریشن کے ذریعے بھارتی سرحد عبور نہ کرنا۔ بھارت جانے کے لیے کھلی سرحد کا تھوڑا سا خطرناک حصہ ہی بہتر رہے گا۔"

"اول خان بلاوجہ ہی ہمارے پاسپورٹ اور ویزا کے لیے پریشان ہو رہا ہے" میں نے کہا۔

"صرف شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوالو۔ ان کا ریکارڈ یہیں رہتا ہے۔ تمہیں ویزا لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اول خان کو بتا دوں گا۔ ایسے کام دو نمبر ہوں گے اور ایسے بے داغ ہوں گے کہ ان پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

"میں ایک بار ان کی سرزمین پر پہنچ جاؤں تو مجھے پاسپورٹ اور ویزا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ بھارت میں پاکستانی کے بجائے بھارتی بن کر رہنا بہت آسان ثابت ہوگا۔ پاسپورٹ ہوا تو مسائل پیدا کرتا رہے گا" میں نے کہا۔

"کسی دوسرے ملک میں غیر قانونی طور پر رہنا اتنا آسان نہیں ہے" میرے کانوں میں اس کی ناصحانہ آواز آئی "دسیوں ایسے مسائل پیدا ہوں گے کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔ کہیں قانون کی گرفت میں آگئے تو تمہاری کوئی داد و فریاد تک نہیں سنی جائے گی۔"

"جب پاسپورٹ بنوانا ہے تو پھر قانونی طریقے سے سرحد کیوں نہ پار کی جائے؟"

"ویزا لینے اور سرحد عبور کرنے کے لیے تمہیں تصویروں کے ساتھ اپنے سارے کوائف دینے ہوں گے جو انڈین ریکارڈ کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ میں تمہیں ریکارڈ سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ کسی ریکارڈ کے بغیر اصل جیسا ویزا لگے گا۔ امیگریشن کی مہریں لگی ہوں گی۔ امرتسر پہنچنے کے بعد تم ڈنکے کی چوٹ پر خود کو پاکستان کہہ سکو گے کوئی تمہاری سفری دستاویزات پر شبہ نہیں کر سکے گا۔"

"ابھی وہ مرحلہ دور نظر آرہا ہے" میں نے ہنس کر جواب دیا "وقت آئے گا تو دیکھ لیا جائے گا۔"

"پاسپورٹ تم بنوالو۔ باقی کام چند گھنٹوں میں ہو جائیں گے" اس نے اصرار کیا "یہاں رہ کر تم سنپولیوں کا سر کچلتے کچلتے تھک جاؤ گے۔ نئی دہلی جا کر انل بسواس کو ہمیشہ کی نیند سلا دو۔ برسوں کے لیے چین ہو جائے گا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اوبرائن ڈی ہنٹ کے متعلق بھی ایسی ہی خوش فہمیاں تھیں۔ اس کو کراچی میں اس بری طرح خوف زدہ کیا گیا کہ ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے بھی نئی دہلی میں پناہ لی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ میں ان ہی دنوں رستم ایرانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر بھاری معاوضہ دے کر رستم کے آدمیوں کے ذریعے اوبرائن کو نئی دہلی میں مروا دیا۔

اوبرائن نئی دہلی میں بظاہر ایک حادثے کا شکار ہو کر مرا تھا۔ وہ رستم کے آدمیوں کی منصوبہ بندی تھی مگر کسی کام نہ آسکی۔ اوبرائن کی موت کے بعد امریکیوں کی سرگرمیاں ماند ضرور پڑیں تھیں مگر ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ پھر اوبرائن کی جگہ جان اسمتھ آگیا اور امریکیوں نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھانا شروع کر دیا۔

جلال، انل بسواس کے بارے میں ایسی ہی خوش فہمیوں کا اظہار کر رہا تھا مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے اس کی بات سن لی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر جلال نے ذرا سے توقف کے بعد کہا "اگر تم گھر جا رہے ہو تو وہاں پہنچ کر مجھے فون کر لینا۔ میں تمہیں اور اول خان کو تفصیل سے ہر بات سمجھا دوں گا۔ تم جب چاہو گے، بے فکری سے بھارت کے سفر روانہ ہو جاؤ گے۔"

"ابھی میں گھر کا رخ نہیں کروں گا" میں نے اسے ٹالنے کی نیت سے کہا "جب بھی وقت ملا، تم سے بات ہو جائے گی۔"

اول خان راستے میں مجھے اتار کر اپنے گھر جانے کا ارادہ کر کے اسٹیشن فور سے نکلا تھا مگر گلشن اقبال پہنچ کر اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ انجن بند کر کے میرے ساتھ ہی اتر گیا۔ گھر میں سب ہی بے چینی کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ فون کر کے ہمیں کچھ

Downloaded from https://paksociety.com

بتاتے رہنا لیکن تم اپنا موبائل ہی بند کر کے بیٹھ گئے" مجھ سے سامنا ہوتے ہی ویرا نے لڑاکا انداز میں کہا "تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میں تمہارے ساتھ جانے پر اصرار کرتی ہوں۔"

"دل کھول کر لڑ لینا مگر ڈینی کو گھر کے اندر تو پہنچنے دو" اول خان نے محظوظ ہوتے ہوئے میری سفارش کی۔

"تم ہر وقت ڈینی کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہو" ویرا مجھے بھول کر اول خان کی طرف متوجہ ہو گئی "یہ تمہارے ساتھ مل کر ہمیں بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ اسے احساس نہیں ہوتا کہ ہم سب اس کی طرف سے کتنے فکر مند رہتے ہیں۔"

"فکر مند ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر رسی کھیلنا فکر مندی کی نشانی ہے تو اس میں، میں بھی تمہارا شریک تھا" سلطان شاہ نے انکشاف کیا۔

"خدا کا خوف کرو ویرا!" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "رسی کھیل کر فکر مندی کا احسان جتا رہی ہو۔"

"وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تاش کا پیکٹ سلطان شاہ نے نکالا تھا" ویرا نے کھسیا کر کہا۔

"یہ باتیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کے دشمن کا کیا بنا!" ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد غزالہ نے پوچھا۔

"وہی ہوا جو ہم نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ وہ ہوش و حواس میں ہے مگر اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہے" غزالہ ہماری باتوں میں بہت کم دخل انداز ہوتی تھی۔ میں نے اس کا صبر آزمانے کے بجائے فوراً ہی جواب دے ڈالا۔

"یہ کیسے ممکن ہوا؟" ویرا نے حیرت سے پوچھا "سر کے کسی حصے پر ایسی نپی تلی ضرب لگانا بہت مشکل کام ہے۔"

"اسٹیشن فور پر اس فن کا ایک ماہر موجود ہے" اول خان نے جواب دیا "یہ کام اسی نے کیا ہے۔"

"اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے تو وہ شہر میں بھٹکتا پھرے گا۔ اسے کہاں چھوڑا گیا ہے" وہ سوال بھی ویرا نے کیا تھا۔

"وہ بہت کچھ بھول چکا ہے مگر اپنا نام جانتا ہے" مجھے خاموش پا کر اول خان نے ہی بتایا "ہم نے اس پر زیادہ وقت برباد نہیں کیا۔ یہ اندازہ اس کے ساتھی لگا سکیں گے کہ اسے کیا کچھ یاد رہا ہے۔ وہ بیشتر باتیں فراموش کر چکا ہے۔"

"دیکھنا ہو گا کہ جلال اس واقعے پر کس ردِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے" سلطان شاہ نے کہا۔

"اس سے بات ہو گئی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ بخشی کی دھمکی کے بعد کوئی محدود جوابی کارروائی ضروری ہو گئی تھی" میں نے جواب دیا "بخشی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس سے بات کی جاتی تو شاید اس کا مشورہ کچھ اور ہوتا۔"

"روی اسپتال میں ہے یا اس نے ارادہ ملتوی کر دیا؟" غزالہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے بارے میں صحیح علم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے ارادہ ملتوی نہیں کیا ہو گا۔ بخشی کی دھمکی سے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔"

جو لوگ اس مہم میں ہمارے ساتھ شریک نہیں تھے ان کے ذہنوں میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے جن کے جواب دینے کی ذمے داری اول خان نے سنبھال لی تھی اس دوران میں جب جہانگیر کا لطیفہ سامنے آیا تو سب ہی ششدر رہ گئے۔ یہ بات کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی کہ صبح سویرے ایس ٹی ایف کے پہریداروں کی فائرنگ کی زد میں آنے والی کار جہانگیر کی ہو سکتی تھی۔

"وہ دیوانہ ہے" ویرا اضطراری انداز میں بولی "سلمٰی نے اس کی بسیار نوشی پر قابو نہ پایا تو وہ کسی دن شہر میں آوارہ گردی کرتا ہوا مارا جائے گا اور وہ بیٹھے بٹھائے بیوہ ہو جائے گی۔"

ویرا کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ میں غصے کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "پی لینے کے بعد وہ خود گھر میں محصور ہو جاتا ہے۔ کسی قیمت پر باہر نہیں نکلتا۔ رات کو اس کی ذہنی رو ہم دو بھوکوں کی طرف بھٹک گئی تھی اور وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔"

"پھر بھی اسے کم پینی چاہیے۔ وہ روز ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہو گا" ویرا نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

"خوب! یہ تم کہہ رہی ہو" سلطان شاہ نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا "وہ بے چارہ تم سے بہت پیچھے ہے۔ تمہارا تو خون بھی اب سرخ کے بجائے سنہرا ہو چکا ہو گا۔ جس کو دیا جائے گا، وہ جھوم جھوم کر اپنی جان دے دے گا۔"

"مجھے اس سے مت ملاؤ" ویرا نے اس پر آنکھیں نکالیں "میں جو کچھ کرتی ہوں اپنی حد میں رہ کر کرتی ہوں۔ تم میں سے کسی نے آج تک مجھے بہکتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔ پی کر سرور میں آنے اور دھت ہو جانے میں بہت فرق ہے۔"

"تمہاری بتائی ہوئی ان باریکیوں سے ہم میں سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچے گا" سلطان شاہ نے کہا "ڈینی تمہاری برادری سے نکل چکا ہے۔ یہ باتیں کسی وقت جہانگیر کو بتانا۔ وہ تمہاری بے تکی باتیں بھی بہت دھیان سے سنتا ہے۔"

ویرا نے جھلا کر اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ہلکا پھلکا گیس لائٹر سلطان شاہ پر پھینک مارا۔ وہ ویرا کے ایسے کسی جواب کے لیے تیار تھا۔ اس نے لائٹر لپک کر احترام سے میری

Downloaded from https://paksociety.com

طرف بڑھادیا۔ میں نے بے پروائی سے اسے سینٹر ٹیبل پر ڈال دیا۔

ہمارے گھر پہنچنے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حامد کا فون آیا۔ وہ اپنی رپورٹ دینے کے لیے اول خان کی تلاش میں تھا جب کہ اول خان اس کا فون آنے سے چند ہی منٹ پہلے ہمارے پاس سے اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میں نے اس سے میجر بخشی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ساحل کے مطلوبہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ٹکراؤ ایک پولیس پارٹی سے ہوگیا جس کی سربراہی کوئی نیا اے ایس آئی کررہا تھا۔

حامد نے اسے ایس ٹی ایف کا حوالہ دیا اور اپنا شناختی کارڈ بھی دکھایا لیکن وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر محکمے میں نیا ہونے کے باعث ایس ٹی ایف کے وجود' افادیت اور اہمیت سے بالکل بے خبر تھا۔ اس نے بخشی کے بے ہوش وجود کو اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دیکھ کر حامد کو اپنی ساتھ پولیس اسٹیشن چلنے پر مجبور کیا۔ وہ حامد کے لیے نیا تجربہ تھا۔ وہ بھی اڑ گیا اور تکرار بڑھنے لگی۔

حامد کے ساتھ واپسی کے لیے فورس کی ایک گاڑی اور تین مسلح آدمی بھی تھے۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے۔ بات زیادہ بڑھ جانے پر حامد کو دونوں گاڑیوں سمیت تھانے جانا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی مسئلہ حل ہوگیا۔ ایس ایچ او نے خود اپنے دفتر سے باہر آکر حامد سے اپنے ماتحت کی بے خبری پر معذرت کی اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اپنا کام پورا کرنے کے ارادے سے گیا تھا۔ اس ناخوش گوار واقعے کے نتیجے میں بات کھل چکی تھی۔ حامد نے ساحل کی طرف واپسی کا ارادہ ملتوی کرکے بخشی کو براہ راست پولیس کی تحویل میں دینے کا ارادہ کرلیا۔ ایس ایچ او اس بات پر راضی تھا کہ وہ بخشی اور اس کی کار کی برآمدگی ایس ٹی ایف والوں کے طے کردہ مقام سے دکھائے گا۔ اس گفتگو میں حامد نے بخشی کی کوئی شناخت ظاہر نہیں کی تھی۔

حامد نے اپنے ارادے کی توثیق کے لیے اسٹیشن فور فون کیا تو اول خان وہاں سے نکل چکا تھا۔ اس نے میرے موبائل نمبر پر رابطہ کرنا چاہا تو وہ دیر تک مصروف ملتا رہا۔ شاید اس وقت میری اور جلال کی بات ہورہی تھی۔ حامد نے تبدیلی کا فیصلہ منسوخ کردیا۔

وہ میجر بخشی کو کار سمیت اس ویران ساحل پر لے گیا جہاں دیوار بنانے کے لیے ریت پر پتھروں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی دونوں گاڑیوں کے پیچھے تھانے کا ایس ایچ او ایک موبائل میں نفری لے کر آیا تھا۔ حامد نے رسمی کارروائی کے طور پر جوں ہی بخشی کو پتھروں پر منتقل کیا' پولیس

قائم شدہ 1956
T.M. Reg. 7635

فیروپائرین (رجسٹرڈ)

فیروپائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کردیتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کردیتی ہے۔
فیروپائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کرکے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کرکے ورم اور سوزش اتارتا ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کرکے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔
فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا لانے کا سبب بنتے ہیں۔
فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کرکے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
فیروپائرین جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جاسکتی ہے۔

Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

تیار کردہ فیر لیبارٹریز O/1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون: (051)4451631 4424026

Downloaded from https://paksociety.com

کے عملے نے اپنی کارروائی شروع کردی۔ حامد انہیں مصروف چھوڑ کر ایس ٹی ایف کی گاڑی میں لوٹ آیا۔

ایک بے خبر اور نئے پولیس افسر کی بے جا مداخلت کے سوا سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا۔ میں نے حامد سے وہ تفصیلات سننے کے بعد اول خان کو باخبر کرنے کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے فون بند کردیا۔

"میں ایسے کسی ناخوش گوار واقعے کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔" سلطان شاہ نے حامد کے تجربے کی روداد سن کر کہا "ضروری نہیں کہ ہر چھوٹا بڑا پولیس اہل کار ایس ٹی ایف کے وجود سے باخبر ہو یا اس کے شناخت ناموں سے مرعوب ہوجائے۔"

"یہ واقعہ دوبارہ بھی رونما ہوسکتا ہے۔" ویرا نے اس کی تائید کی "پولیس کی بہت سی گشتی پارٹیوں میں کوئی پڑھا لکھا افسر نہیں ہوتا۔ نیم خواندہ عملہ اپنی وردی کی اہمیت جتانے پر تل جائے تو کسی وقت خون خرابے کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ ایک تجربہ ہوجانے کے بعد اس کا اعادہ روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا ضروری ہے۔ تمہیں کھل کر اول خان کو اس خطرے سے آگاہ کردینا چاہیے۔"

"تم دونوں ایک بات سنتے ہو اور عجلت میں فیصلے صادر کرنا شروع کردیتے ہو۔" میں نے ہلکی سی خفگی سے کہا "آج جو کچھ ہوا، وہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس بارے میں اول خان مجھے بتا چکا ہے کہ ایس ٹی ایف کی رازداری برقرار رکھنے کے لیے پولیس کانسٹیبل کی سطح تک اس کی تشہیر نہیں کی جاسکتی۔ ایس ٹی ایف کے ہر اہل کار کو یہ حکم ہے کہ کسی بھی سرکاری ایجنسی کا کوئی فرد انہیں رعایت دینے پر آمادہ نہ ہو تو وہ رضاکارانہ طور پر اس کے افسر تک جانے کی پیش کش کردیں۔ افسروں کو انفرادی طور پر ان اداروں کے بارے میں بتادیا جاتا ہے جنہیں وردی کے بغیر خاموشی سے اپنا کام کرنے کی آزادی ہے۔"

"پھر حامد نے بات کیوں بڑھائی؟ اسے پہلے ہی تھانے چلا جانا چاہیے تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔" ویرا نے نیا فیصلہ جاری کردیا۔

"حامد بھی ذمے دار آدمی ہے۔ اسے غلطی نہیں، عادت کی خرابی کہہ سکتی ہو۔ آج تک کسی نے اس کے شناخت نامے کو مسترد نہیں کیا ہوگا۔ نیا تجربہ اسے گراں گزرا۔ ایس ٹی ایف والے بھی ہم جیسے جذباتی انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حامد نے نوجوان اے ایس آئی کا حکم ماننے میں سبکی محسوس کی ہو۔ وہ اسٹیشن فور پر اول خان کی نیابت کرتا ہے۔ اس کا درجہ اے ایس آئی سے بہت اوپر ہوگا۔"

"فورس میں سب ہی برابر معلوم ہوتے ہیں۔ حکم دینے یا ماننے کی نوبت آئے تو چھوٹے بڑے کا پتا چلتا ہے۔" سلطان شاہ نے بے پروائی سے کہا۔

"ہمارے گھر سے جمشید روڈ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں نے اول خان کے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ گھر پہنچتے ہی اسٹیشن فور سے رابطہ کرکے رپورٹ لے چکا ہے۔ حامد نے اسے اپنی اور میری گفتگو کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔

"میں نے حامد کو تنبیہہ کی ہے۔" اول خان فون پر کہہ رہا تھا "اسے خاموشی سے تھانے چل دینا چاہیے تھا۔ پولیس والوں کی اتفاقی مداخلت سے یہ فائدہ ہوا کہ وقت برباد نہیں ہوا۔ بخشی کا قصہ فوراً ریکارڈ پر آگیا۔ اب تو توفصل خانے کو خبر مل چکی ہوگی۔"

"حامد تو کہہ رہا تھا کہ اس نے پولیس والوں کو بخشی کی شناخت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ بخشی کی جیبوں میں ایسا مواد موجود تھا جس سے اس کی شناخت ہوجاتی۔"

"شیام کے لیے جانے والی پارٹی کی طرف سے کیا خیر خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی راستے میں ہیں۔ شیام ان کے ساتھ ہے۔ آج اس کی تواضع ہوتی رہے گی۔ کل اسے دیکھا جائے گا۔"

"اسے اچھی طرح دیکھ لو تو مجھے نتیجے سے آگاہ کرنا نہ بھولنا" میرے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگا۔

اول خان سے گفتگو ہوجانے کے بعد میرے سر سے ایک ذمے داری کا بوجھ اتر گیا۔ دن طلوع ہونے سے پہلے واقعات نے جس بے ہنگم انداز میں پھیلاؤ اختیار کرنا شروع کیا تھا۔ وہ قابو میں آچکا تھا۔ ایک ایک کرکے تقریباً سب ہی گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ صرف ایک مسئلہ اٹکا ہوا تھا کہ مجھے وعدے کے مطابق جلال سے فون پر بات کرنی تھی۔ اس کے بعد اس دن کا پرسکون اختتام ہوتا نظر آرہا تھا۔

"موبن ہاؤس فون توکرو" ویرا نے بیٹھے بیٹھے اچانک تجویز پیش کی "کچھ پتا تو چلے کہ روی مکاری کرکے کس اسپتال میں پہنچا ہوا ہے اور کب تک گھر واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"یہ وقت مناسب نہیں ہے" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈال کر جواب دیا "جگدیش کی آخری رسوم ادا ہونے تک وہاں افراتفری کا راج رہے گا۔ کوئی بھی فون پر صحیح بات نہیں بتا سکے گا۔ روی کے چلے جانے سے سب کچھ درہم برہم

Downloaded from https://paksociety.com

ہو کر رہ گیا ہوگا۔"

"روی اور جگدیش کے بچوں نے میرپور خاص سے آکر نظام سنبھال لیا ہوگا" ویرا نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مجھے یاد دلایا "تم ہی نے بتایا تھا کہ اس گھر کی اوپر والی منزل نچلی منزل سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روی کی مکاری کے بعد ماروتی بھی اوپر پڑی اینڈ رہی ہو۔ اس سے تمہاری بات ہوگئی تو وہ تمہیں گھر کے ساتھ ساتھ اپنے دل کا احوال بھی سنادے گی۔"

میں نے تیز نظروں سے ویرا کو گھورا لیکن اس کی ذو معنی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس موقع پر سلطان شاہ بھی اس کا ہم نوا بن گیا" ان کے اوپر والے نمبر پر ایک کوشش کرنے میں کیا مضایقہ؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کسی سے بات نہیں ہوگی۔"

میں نے سلطان شاہ کی بات سنی اَن سنی کردی۔ جگدیش کی خود کشی کے بعد وہ ماروتی سے میری پہلی گفتگو ہوتی۔ اسے روی نے جگدیش کی آخری تحریر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس گھرانے میں پائی جانے والی کشیدگی کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ دوسری عورتوں نے ماروتی کو ذلیل کرنے کے لیے جگدیش اور روی کے درمیان ہونے والی گفتگو' اپنی مرضی کی ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اسے سنا دی ہوگی۔ ان مکالموں میں جگدیش کے عائد کئے ہوئے الزامات کی واضح جھلکیاں موجود تھیں۔

مجھے ڈر تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ماروتی اپنا دفاع کرتے ہوئے جذباتی نہ ہوجائے۔ پچھلے دنوں میں اس کے ساتھ جس نوعیت کے مراسم استوار ہوتے چلے گئے تھے ان کی روشنی میں' میں اس سے بے رخی اختیار کرکے فون بند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی دل جوئی کے لیے مجھے جو کچھ کہنا پڑتا وہ ایسا ہرگز نہ ہوتا کہ میں اسے ان تینوں کی موجودگی میں بے فکری سے کہتا چلا جاتا۔

"ماروتی سے زیادہ اہم جلال ہے" اس نازک موڑ پر غزالہ نے میرے دل کی بات پڑھتے ہوئے یاد دلایا "یہ بری بات ہے کہ آپ آج سارا دن اسے ٹالتے رہے ہیں۔ وہ بہت بے چینی سے آپ کے فون کا انتظار کررہا ہوگا۔"

میں نے ویرا اور سلطان شاہ کے منہ بند رکھنے کے لیے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھالیا۔

دفتری اوقات ختم نہیں ہوئے تھے۔ جلال ویسے بھی دیر تک اپنے دفتر میں کام کرنے کا عادی تھا۔ میں نے نمبر ملایا تو وہ براہِ راست لائن پر موجود تھا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم اپنا وعدہ بھول گئے۔ مجھے بہت شدت سے تمہارے فون کا انتظار تھا" میری آواز سنتے ہی اس کی طرف سے جواب آیا "بخشی کے بارے میں اسلام آباد میں افواہیں گردش میں آگئی ہیں۔ ہائی کمیشن کا ذمے دار عملہ فون پر آنے سے گریز کررہا ہے۔ اس خبر نے ان سب کو اضطراب میں مبتلا کردیا ہے۔"

"افواہیں کیا ہیں؟ تمہیں خیال رکھنا ہے کہ ان لوگوں کی سوچ کس سمت میں ہے۔"

"وہ بہت محتاط ہیں۔ بس یہ کہا جارہا ہے کہ کراچی میں ان کے عملے کے ایک رکن کے ساتھ کوئی سنگین واقعہ رونما ہوا ہے۔"

"واقعہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا "اگر ان کی نیت صاف ہوتی تو وہ ابتدائی طور پر اسے حادثہ قرار دیتے۔ حادثے اور واقعے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ لوگ واقعی بہت کینہ پرور ہیں۔ پوری تفصیل جانے بغیر محاذ آرائی کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے کراچی سے اطلاع ملی ہے کہ اسے پولیس کی تحویل سے نکال کر جناح اسپتال کے نیورو سرجیکل وارڈ میں پہنچادیا گیا ہے جہاں اس کے تفصیلی ٹیسٹ کئے جائیں گے۔ دوسری طرف اسے جلد از جلد پاکستان سے نکالے جانے کی تیاری کی جارہی ہے۔"

"یہ سب اسی طرح ہونا تھا" میں نے اس کی بات سن کر کہا "اس بارے میں مجھے یا تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دیوتا کا 40 چالیسواں حصہ
25 ستمبر 2000 کو شائع ہو رہا ہے
بڑے شہروں میں ہمارے سول ایجنٹ یہ ہیں
الکوثر نیوز ایجنسی
فریئر مارکیٹ۔ کراچی
رابعہ بک ہاؤس
الکریم مارکیٹ۔ اردو بازار
لاہور۔ فون نمبر 7121555
نیو بک کارنر
کمیٹی چوک۔ راولپنڈی
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
رمضان چیمبرز، بلوچ ایکسٹینشن آئی آئی چندریگر روڈ
فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895313
Email: kitaabiat@cyber.net

Downloaded from https://paksociety.com

"ابھی میں بھی فکر مند نہیں ہوں۔ تمہیں یہاں کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کررہا تھا۔ ادھر وہ لوگ میجر بخشی کے قصے میں الجھ گئے ہیں۔ دوسری طرف دفتر خارجہ والوں نے ڈیوڈ اور جمی کی موت کے بعد ملنے والے امریکی مراسلے کا منہ توڑ جواب امریکی سفیر کے حوالے کردیا ہے۔ اس نے مراسلے کو توہین آمیز اور امریکی وقار کے منافی قرار دے کر وصول کرنے سے انکار کرنا چاہا تھا لیکن اسے امریکی مراسلے کی سفارتی زبان کے حوالے سے یہ سمجھا دیا گیا کہ امریکیوں کی نیک نیتی کے بارے میں پورے اعتماد کا اظہار کرنے کے بعد مراسلے میں وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو حقیقت نہ ہونے کے باوجود' عام آدمی کو حقائق سے قریب نظر آتی ہیں۔ لاجواب ہونے کے بعد اسے مراسلہ وصول کرنا پڑا۔"

"مشکل یہ ہے کہ پچھلے چند دنوں میں یہاں واقعات میں اتنی تیزی آئی ہے کہ اب ہمیں کچھ روز کے لیے خاموشی اختیار کرنی ہوگی" میں نے جلال سے ملنے والی اطلاع پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ اپنے مسائل میں گھرے رہیں تو ان کی پیش قدمی بالکل رک جاتی ہے۔"

"اسی لیے میری خواہش ہے کہ تم جلد از جلد نئی دہلی روانہ ہونے کے بارے میں سوچو۔ اس سلسلے میں' میں پوری طرح تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"ابھی وقت ہے۔ میں آج تصویروں کا بندوبست کرتا ہوں۔ اول خان کل پاسپورٹ بنوادے گا۔"

"پاسپورٹ ہاتھ میں آتے ہی تم لاہور پہنچ جاؤ" مجھے سفر پر آمادہ پاکر وہ خوش ہوگیا "میں بھی اسلام آباد سے وہیں آجاؤں گا۔ چٹکی بجانے میں تمہارے سارے مسائل حل کردیے جائیں گے۔"

"وہاں مجھے کن لوگوں سے مدد مل سکے گی؟" میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"نئی دہلی میں ہمارے تین آدمی ہیں۔ میں ان کے بارے میں معلومات یکجا کرکے لاہور میں تمہارے حوالے کردوں گا۔ وہاں پہنچنے کے بعد تمہیں اپنے کام کے آغاز کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ تمہارے لیے ہر اول کا کام سرانجام دیں گے۔"

"تم اپنا کام شروع کردو۔ میں اپنی تیاری کرتا ہوں۔ ممکن ہوا تو میں میجر بخشی کے پیچھے پیچھے نئی دہلی پہنچ جاؤں گا۔ اس کے سنبھلنے کے آثار نظر آئے تو لگے ہاتھوں اس کا بھی کریا کرم ہوجائے گا۔"

"جاتے ہوئے اور کچھ اپنے ساتھ لو یا نہ لو' سی ایس ڈی ضرور لے جانا" اسے اچانک وہ حساس آلہ یاد آگیا جو میں نے نیویارک میں را کے ایک پرانے ایجنٹ سے یارانے کے نتیجے میں حاصل کیا تھا۔ بدری ناتھ اسی پرائی سرزمین پر میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا مگر اس کی یادگار مسلسل میرے کام آرہی تھی۔

"آپس کے رابطے کے لیے ملاقاتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ شاید تمہیں کوئی لاسلکی اپریٹس مل جائے" وہ کہہ رہا تھا "اگر سی ایس ڈی کے ذریعے فون پر ہونے والی گفتگو کو ناپسندیدہ مداخلت سے محفوظ بنایا جاسکے تو دشمن کی سرزمین پر تمہارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔"

"اگر ہمیں ہوٹل میں رہنا پڑا تو سی ایس ڈی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپریٹر کے ذریعے کوئی بھی کال ہمارے کمرے تک منتقل نہیں ہوسکے گی۔ اس کی ساری افادیت براہِ راست فون لائن تک ہے۔"

"وہ لوگ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کردیں گے۔ اچھا ہوا کہ تم نے یہ نکتہ بتادیا۔ شروع سے ہی اس کا خیال رکھا جائے گا" بات ختم کرتے کرتے اس نے چونکی ہوئی آواز میں پوچھا "ابھی تم نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ کیا تم کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لے جارہے ہو؟"

"میری بیوی میرے ساتھ ہوگی" میں نے اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا "پردیس کے سفر میں ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔ ایک پر کوئی برا وقت آجائے تو دوسرا اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرسکتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو خیر خواہوں کو خبر ہی پہنچا سکتا ہے۔"

"اپنے معاملات کو تم زیادہ بہتر سمجھتے ہو" اس نے محتاط لب و لہجے میں کہا "میری دانست میں بیوی کو اس سفر پر اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ مردانہ لڑائی ہے جس میں گردنیں کٹنے کی نوبت آجاتی ہے۔ بیوی کے ساتھ تم ہر وقت ذہنی دباؤ میں رہو گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میری بیوی ایسے معاملات میں مردمار ثابت ہوتی ہے" میں نے ویرا کو آنکھ مار کر ہاؤتھ پیس میں کہا "اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کہنا وہ تمہارا مشورہ پسند نہیں کرے گی۔"

"یہ صرف مشورہ ہی تھا" وہ جلدی سے بولا "میں تمہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔"

اس سے گفتگو ختم کرکے میں نے ایک مرتبہ پھر اول خان کے گھر کا فون نمبر ملانا شروع کردیا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

Downloaded from https://paksociety.com

کی بربادیوں کا آغاز ہوا اور وہ ڈیوڈ اسٹارز اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے کیمپ کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظر میں مستوجب سزا ٹھہرا۔ اپنے مشن کی کامیابی کے ساتھ ہم پاکستان واپس پہنچے، یہاں مدن موہن نے نیوکلیائی انفارمیشن سیل کے دو ممبران سے تفتیش کے نتیجے میں مکمل راجوانی کا نام سامنے آیا، اپنی سیاسی حیثیت کے باعث وہ ہمارے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوا اور ہمارے ہاتھوں سے پھسلی مچھلی کی طرح پھسلنے کے بعد اسلام آباد پہنچا مگر اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے اسے واپس کراچی لایا گیا اور وہ میری تحویل میں امریکی ایجنٹوں سمیت جہنم واصل ہوا۔ اب ہمارے سامنے امریکی قونصلیٹ کا ملازم اور ائن ڈی ہنٹ تھا۔ میں اس سے امریکن گرین کارڈ کے لالچی کرنل جمال دستی کے روپ میں ایس ٹی ایف کے غدار کی حیثیت سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ میں ڈیتی کو تلاش کرکے اس کے حوالے کرنے کے لیے بےوقت تیار ہوں۔ وہ دو سرے امریکیوں کے مقابلے میں قدرے مشکل ثابت ہو رہا تھا، اس نے میرے اور اول خان کے فنگر پرنٹس بھی حاصل کرلیے۔ اس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اول خان نے مکام سے بات کی اور انہوں نے فیصلہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے اولڈی سے رابطہ کیا مگر وہ منتاما ہو چکا تھا اس نے مجھے ائن ٹوکلیٹ کے میجر بخشی کے سپرد کردیا۔ جس نے مجھے دھمن راج سے بھی متعارف کروایا۔ میجر بخشی کرنل جمال دستی کا فونی ہاشمی جانتا تھا اس چکر میں اس نے مجھے اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تاہم بعد میں اسے کرنل جمال دستی کی حیثیت پر یقین آگیا۔ اولڈی ہنٹ نے اپنی کارروائیاں تیز کیں مگر ہمارا کامیوں کے بعد وہ دہلی فرار ہوگیا۔ میجر بخشی کی طرف سے میرے اغوا کی ایک اور کوشش کے نتیجے میں رستم ایرانی ہمارے سامنے آیا وہ پاکستان میں رہ کر ایران کے خلاف سازشوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ کرائے کے قاتل بھی فراہم کیا کرتا تھا میں نے اس تک رسائی حاصل کی اور ہماری معاونت پر اولڈی ہنٹ کے قتل کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ حسب توقع اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی دوران میں رستم ایرانی نے انکشاف کیا کہ ڈیتی کی تلاش کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ علم ہوا کہ پنڈت منوہر لال سے اس کے گہرے مراسم ہیں جس کے بعد میں نے پنڈت منوہر لال کے گھر کی تلاشی لی جہاں سے ایسے کاغذات ملے جن سے پنڈت منوہر لال کا اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کا ایجنٹ ثابت ہوتا تھا۔ رستم نے ان کاغذات کے لیے خطیر رقم کی بڑی آفر کی۔ میں نے جواب میں پنڈت منوہر لال کو مانگ لیا۔ اس کے انکار پر اس کے گھر کا محاصرہ کیا گیا اور رستم نے خود کشی کرلی۔ پنڈت منوہر لال کو وہاں سے ہائی جیک کرالیا گیا۔ پنڈت نے بتایا کہ رستم نے اسے موساد میں شامل کرایا تھا۔ رستم کی خود کشی پر ایک نام نہاد دین الاقوامی ادارہ این جی او فریڈم انٹرنیشنل پاکستان میں انسانی حقوق کے حوالے سے واویلا پر اٹھا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا کرتا دھرتا اکرم الٰہی تھا جو کچھ عرصے سے ملک سے باہر تھا تاہم اس کی غیر موجودگی میں اس کا بھانجا مقبول چوہدری رستم کی خود کشی پر شور کررہا تھا۔ ہم نے فریڈم انٹرنیشنل کی عمارت پر کامیاب کارروائی کی۔ مقبول چوہدری وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا اور اپنی منظورِ نظر طوائف کے گھر جا پہنچا۔ فریڈم انٹرنیشنل کے دفتر میں متعدد اکرم الٰہی ہمیں مل گیا۔ اس نے بتایا کہ اسے مقبول چوہدری نے اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے قید کیا ہوا تھا۔ اس کی ذات بھی شک وشبے سے بالاتر نہیں تھی اس لیے اس کے ٹیلی فون پر آپریشن لگا کر اسے فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا۔ میں نباتاً ایک لڑکی کی مدد سے مقبول الٰہی کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے اسٹیشن فور پہنچا دیا گیا۔ اکرم الٰہی کے فون پر لگائی گئی آپریشن کے نتیجے میں ہمیں علم ہوا کہ یوپ رائیل ناٹی ایک امریکی سفارت کار اس ملاقات کے لیے کراچی آرہا ہے۔ اکرم الٰہی کی سخت نگرانی کی جارہی تھی ہم اسے یوپ رائیل سمیت گرفتار کرنا چاہتے تھے وہ اپنی مخبری کرنے والوں کو جعل دے کر یوپ رائیل سے ملنے ہوٹل پہنچا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ اکرم الٰہی نے ہمیں دیکھتے ہی ہوٹل سے راہِ فرار اختیار کی مگر وہ اپنی حاضر دماغی اور اسے ملنے والے محبِ وطن ٹیکسی ڈرائیور مجید کی معاونت سے اکرم الٰہی قابو میں کرلیا۔ ہوٹل میں یوپ رائیل نے اپنی گھومقامی کی کوشش کی مگر ناکام ہوا اور بالآخر امریکی صدر کے فرمان کے تحت اپنے عہدے سے برخاست ہو کر امریکا روانہ ہوگیا۔ اکرام الٰہی نے تفتیش کے دوران میں بتایا کہ وہ فورڈ فاؤنڈیشن کو ان کے پیغامات کے حوالے سے بلیک میل کرتا رہا ہے اور اس نے فاؤنڈیشن کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی فائل بنا رکھی ہے۔ ہم نے وہ فائل حاصل کرنی۔ مقبول چوہدری اور اکرام الٰہی سے معرکہ ہو چکے تھے فوراً انہیں ٹھکانے لگوا دیا گیا۔ اکرام الٰہی کی مرتب کردہ فائل سے ہمیں بہت ساری معلومات حاصل ہوئیں۔ ان میں ایک نام مراد ظریف کا تھا جو اندرون سندھ ایک این جی او چلا رہا تھا۔ فائل سے ظاہر ہوا کہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے اسے مقبول چوہدری کے حوالے سے بلانا چاہا مگر وہ قابو میں نہیں آیا۔ سلطان شاہ اس کی تلاش میں حیدر آباد گیا اور بدقسمتی سے مراد ظریف کے شکنجے میں پھنس گیا۔ سلطان شاہ کو چھڑانے کے لیے ہم نے پہلے مراد ظریف کو حیدر آباد سے گرفتار کیا اور پھر ایک مختصر سے معرکے کے بعد سلطان شاہ کو میرپور خاص سے بازیاب کرالیا گیا۔ مراد ظریف نے ہماری تحویل میں خود کشی کرنے سے پہلے تفتیش کے دوران میں انکشاف کیا کہ بھارتی ایجنٹ کرشن کمار نیا پھور کے علاقے میں مسیح تربیت کا کیمپ چلا رہا تھا اور اب فرار ہو کر بھارتی علاقے موٹا پاڑی کی طرف چلا گیا ہے۔ آئی ٹی کے جلال کا خیال تھا کہ ان کی سرکوبی کے لیے ہمیں سرحد پار جانا چاہیے۔ میں نے اس پر کوئی رائے نہیں دی۔ اکرام الٰہی کی فائل میں مندرج دیگر افراد بھی اپنے انجام کو پہنچتے رہے۔ اس دوران میں کرشن کمار کے آدمیوں نے حیدر آباد میں موجود ہماری کار کا تعاقب کیا اور ہمارے گھر تک رسائی حاصل کرلی۔ ایک رات انہوں نے ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا مگر اپنی بدقسمتی سے حیدر آباد کے رجسٹریشن والی کار سمیت ایک مردہ اور دو زندہ شکاروں کی صورت میں ہمارے ہاتھ آگئے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ کرشن کمار اندیا نہیں گیا بلکہ پاکستان میں ہی موجود ہے اور ہماری رہائش گاہ دیکھ چکا ہے۔ ہم نے انہیں پولیس کے حوالے کردیا۔ میں چاہتا تھا کہ کرشن ہمارے ٹھکانے سے واقف ہونے کے بعد ہم سے ضرور ٹکرائے گا۔ اسی امید کے تحت اور سلطان شاہ کے ہمراہ سے باہر سڑکوں پر سرشکنی کررہے تھے جب غیر متوقع طور پر وہ ہمارے گھر میں داخل ہوا اور وہ ایک پرخیال بات میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اسے اغوا کرکے میں لاکھ انعام حاصل کرنے کا خواہش مند تھا مگر وہ اپنی حاضر دماغی کے باعث اسے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی اور اسے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ [illegible] کی کارروائی کے دوران میں استعمال ہونے والی کار کا رجسٹریشن شراب فروخت کرنے والی ایک کمپنی مون ایند مون کے نام پر تھا۔ کمپنی کا مالک تجدید کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ ہم نے اس کے گھر پر اس سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ حیدر آباد سے متعلق کاروباری معاملات اس کا سالی روی دیکھتا ہے۔ ہم روی سے ملنا چاہتے تھے مگر وہ ہمیں جل دے کر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ تاہم ہمارے تیور دیکھ کر روی کی خوب صورت بیوی ماروتی نے مجھے روی کی سلامتی اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے عوض کرشن کمار کا پتا بتا دیا۔ اس کی نشان دہی پر سیمن کو نقد پر کامیاب آپریشن کیا گیا اور کرشن کمار سمیت وہ امریکی سفارت کاروں کے ہمارے ہاتھ آگیا۔ سفارت کاروں کو ان کے ہمقامی ذرائع سمیت موقع پر ہی واصل جہنم کروایا گیا۔ بعد میں کرشن کمار بھی اسی انجام کو پہنچا۔ امریکیوں نے اپنے سفارت کاروں کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے پہلے مانیکو سینٹر کو تباہ کیا اور پھر اسلام آباد میں بم دھماکا کرایا۔ کرشن کمار کے ساتھیوں میں صرف ہری چند باقی تھا میں اس کی تلاش میں روی مون ہمارے ہاتھ لگ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کرشن کمار دہلی میں موجود کئی بھارتی افسران سے براہِ راست لیتا تھا۔ جلال نے بتایا کہ اہل ہوا اس انڈین سیکرٹ ایجنسی "را" کے پاکستان ونگ کا سربراہ ہے۔ اس دوران میں میجر بخشی کا کردار بھی میرے سامنے رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مجھے بھارت جانا چاہیے جلال میرا ہم نوا تھا۔ ادھر ماروتی نے اپنے جنیٹھ سے انتقام لینے کے لیے میرے اور اس کے درمیان گزارے گئے رنگین لمحوں کی داستان اپنے جنیٹھ کو سنا دی وہ غصے سے دیوانہ ہوگیا اور شدید جذباتی ہیجان کے عالم میں خود کشی کر بیٹھا۔ روی کو ذر تھا کہ اب پولیس اسے اس معاملے میں بھی گھسیٹے گی مگر ہماری مدد سے اسے اس سلسلے سے یہ آسانی گلو خاصی نصیب ہوگئی۔ روی کے گھر کے ایک ملازم شیام کے ذریعے میرا اور اول خان کا فرضی نام اور ٹیلی فون نمبر میجر بخشی تک پہنچا اور اس نے فون پر مجھے دھمکی دی چنانچہ اسے اس جسارت کا مزہ چکھنا پڑا اور وہ اپنی بداعتدالی کے گناہ کا بھارتیوں کے لیے بے مصرف ہوگیا۔ میں اب بھارت جانے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ جلال سے مشورے کے بعد میں نے اول خان کے گھر کا فون نمبر ملانا شروع کردیا۔

قسط ایک سو بائیس

اول خان کو اپنی اور جلال کی گفتگو سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگائی تو دیر ابہت غور سے اور مسلسل میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی کھچڑی پک رہی ہوگی اس لیے

Downloaded from https://paksociety.com

میں نے اسے چھیڑنے کے بجائے نظرانداز کرنے کا فیصلہ کرلیا اور سگریٹ کے پہلے کش کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

"کہاں جارہے ہو؟" میرے اٹھتے ہی ویرا نے اونچی آواز میں مجھے ٹوک دیا۔

میں چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی طرف پلٹا اور قدرے حیرت سے پوچھا "کیا اب گھر میں چلنے پھرنے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تم میری پروا نہیں کرتے۔ تمہیں میری کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں رچی ہوئی افسردگی تشویش ناک تھی۔ میں نے درمیان سے ہی اس کی بات اڑا دی "پھر مجھے ٹوکنے کی کیا بات ہے؟"

"مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سینگ نہیں ماروں گی۔"

"یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔" سلطان شاہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بول پڑا "مجھے روز اول ہی سے شبہ تھا کہ تمہارا ذہنی فتور اسی طرح جاری رہا تو کسی نہ کسی دن تمہارے سینگ بھی نکل آئیں گے۔"

میری اور جلال کی گفتگو کے دوران میں ہی وہ غزالہ کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا۔ جب میں اول خان سے فون پر بات کررہا تھا تو کمرے میں میرے علاوہ صرف ویرا موجود تھی لیکن اس کی آواز سن کر سلطان شاہ اچانک ہی نمودار ہوگیا تھا۔

"میں تم سے مخاطب نہیں تھی۔" ویرا نے ترشی سے کہا "مجھے ڈینی سے کچھ بات کرنے دو!"

"یہ بات غزالہ نے کہی ہوتی تو میں سرجھکا کر باہر چلا جاتا" سلطان شاہ کے سر پر شوخی کا بھوت سوار تھا۔ "وہ ڈینی کی زوجہ ہے جب کہ تم ہم دونوں کے لیے نامحرم ہو۔ تم کو بات چیت اور میل جول میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔"

ویرا کے پتلے پتلے، گلابی ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "تمہیں یہ بات جتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے کسی کے ساتھ، میرا کوئی مضبوط رشتہ نہیں ہے پھر بھی تم کو۔۔۔"

ویرا اس کی بات پر یک بہ یک جذباتی ہونے لگی تھی۔ سلطان شاہ کی مذاق میں کہی ہوئی بات اس وقت ویرا کے لیے ایک سنگین طعنہ ثابت ہوئی تھی۔ میں نے بات بڑھنے سے پہلے ہی سلطان شاہ کو گھورتے ہوئے کہا "تم جاؤ، مجھے ویرا سے بات کرنے دو۔"

میرے سخت لہجے پر سلطان شاہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے ویرا کی نظریں بچاکر اسے آنکھ ماری اور وہ جس طرح ٹہلتا ہوا نمودار ہوا تھا، اسی انداز میں خاموشی سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

"شکریہ!" اس کے چلے جانے کے بعد ویرا نے عجیب سے لہجے میں سکوت توڑتے ہوئے مجھ سے کہا "وہ شیطان کی طرح آیا تھا مگر بہت پتے کی بات کہہ کر گیا ہے۔ اکثر میں خود بھی یہی سب سوچنے لگی ہوں۔"

"کیا سوچنے لگی ہو؟" میں نے نرمی اور دل جوئی کے انداز میں اس سے پوچھا۔

"یہی کہ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے۔" اس نے اداسی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم بہکی بہکی باتیں کررہی ہو!" میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا رشتہ ہے؟ کبھی کبھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی ہوں کہ میں یہاں کیوں پڑی ہوئی ہوں اور کیا کررہی ہوں۔ یہ بات سلطان شاہ نے محرم اور نامحرم کا ذکر چھیڑ کر بہت زیادہ واضح کردی ہے۔"

"وہ احمق ہے۔ تمہیں اس کی کسی ہوئی خرافات پر اتنا دھیان نہیں دینا چاہیے۔"

"وہ احمق نہیں بہت چالاک ہے۔ گاہے گاہے مجھے میری اوقات یاد دلاتا رہتا ہے۔"

"اوہ!" میں نے مضطربانہ انداز میں اپنی جگہ چھوڑ دی "اب شاید تم پٹڑی سے اتر رہی ہو۔"

"ڈینی! مائی ڈارلنگ!" اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا "تم جانتے ہو کہ میں آزاد مغربی بلکہ امریکی معاشرے میں پلی بڑھی ہوں۔ جمی لائیڈ نے ژان مرسیانو کے روپ میں میری تربیت کی، میں نے اٹلی کے اوباش روسا کی محفلوں میں بہت سا قیمتی وقت گزار کر یہ سیکھا کہ عورت کسی مرد کی ماں، بہن، بیٹی یا بیوی نہ ہو تو کیا ہوتی ہے۔ میرے ساتھ تو بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے میرے باپ نے بھی کبھی سرعام اپنی بیٹی تسلیم نہیں کیا۔ میں ان چاروں رشتوں کی لذت سے بالکل ناآشنا ہوں۔ میں ہمیشہ سے پانچویں تجربے سے گزرتی رہی ہوں۔ میرے لیے۔۔۔"

ویرا کی اس سنجیدہ گفتگو نے مجھے بے آرام کردیا۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا "تم اتنی لمبی تمہید کس لیے باندھ رہی ہو؟"

"مجھے اس تمہید کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔" ویرا نے اسی لہجے میں اپنا سلسلہ کلام جوڑا "سلطان شاہ نے میرے لیے نامحرم کا لفظ استعمال کرکے مجھے ان وضاحتوں پر مجبور کردیا۔ یہ ایک لفظ ہے مگر بہت جامع اور مجھ پر پورا اترتا

Downloaded from https://paksociety.com

ہے۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت تمہیں یہ سب کیوں یاد آرہا ہے؟"

"تم صرف غزالہ کو اپنے ساتھ لے کر نئی دہلی جانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"تمہارے ساتھ امریکا کا ایک طویل سفر کر چکا ہوں' اس بار اسے لے جانا ضروری ہے۔"

"میں تمہیں نہیں روکتی۔ وہ تمہاری بیوی ہے۔ ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا اس کا حق ہے۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"اس کے میرے ساتھ جانے پر تمہیں اعتراض نہیں ہے تو پھر ایسی گمبھیر سنجیدگی کیوں اختیار کی ہے؟"

"وہ تمہارے ساتھ جائے گی' میں بھی بھارت جانے کا ارادہ کر چکی ہوں۔" اس نے سکون سے انکشاف کیا۔

میں تنک اٹھا "یہ نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا میرے بس سے باہر ہے۔ وہ امریکا نہیں' بھارت ہے۔ وہاں ہمیں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ وہاں تم آسانی سے پہچان لی جاؤ گی۔"

"اتنا بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش کر دیا "میں کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں کہ تم میری گردن میں زنجیر باندھ کر مجھے سلطان شاہ کی رکھوالی میں چھوڑ جاؤ۔ میں خود مختار ہوں۔ اپنے فیصلے آپ کر سکتی ہوں۔ تم نے تعاون نہ کیا تو دونوں محرموں کی روانگی کے بعد میں خود اپنے طور پر اس سفر کے لیے نکل کھڑی ہوں گی۔ کوئی مجھے نہیں روک سکے گا۔"

"پھر سلطان شاہ اکیلا یہاں رہ کر کیا کرے گا؟" میں نے غصے اور بے چارگی سے پوچھا۔

"یہ اس کا مسئلہ ہے۔" ویرا نے اپنے شانے اچکا کے بے پروائی سے کہا "میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم وہاں جا کر کیا کرو گی۔" میں نے اسے کھورتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی جو تم دونوں کرو گے۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا "میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں یہاں بے کار بیٹھی' تمہاری واپسی کا انتظار کرتی رہوں۔ بے کاری اور بے زاری طول پکڑ گئی تو میں مالیخولیا میں مبتلا ہو جاؤں گی۔"

"ہمارے چلے جانے کے بعد یہاں سے مسائل کا خاتمہ نہیں ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی فتنہ سر اٹھاتا رہے گا۔ اول خان تم سے رابطے میں رہے گا۔ تم زیادہ آزادانہ انداز میں اس کی مدد کر سکو گی۔ وہ تمہاری بہت عزت کرتا ہے۔"

"عزت!" ویرا نے استہزائیہ انداز میں دہرایا اور ہنس پڑی "میں عزت اور ذلت کی بحث میں نہیں پڑتی۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی مگر میرا جانا طے ہے۔ میں تم پر کوئی بوجھ ڈالوں گی نہ تم پر میرے تحفظ کی ذمے داری ہوگی۔ میں تم دونوں سے الگ تھلگ اور شاید دور دور رہ کر یہ دیکھوں گی کہ میں راہ والوں کے خلاف کیا کچھ کر سکتی ہوں۔"

"کہیں بھی کوئی لغزش ہوئی تو وہ تمہیں پیس ڈالیں گے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے پروا نہیں۔ تم تنہائی کے اس ہولناک تجربے سے نہیں گزرے جس میں' میں نے ساری عمر گزاری ہے۔ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں' اس سے کسی کو کیا فرق پڑے گا؟ تم بھی دس پانچ روز رو دھو کر صبر کر لو گے کیونکہ تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ناجائز رشتے کو میرے باپ نے عمر بھر نہیں مانا تو تم کیسے مان لو گے؟ میں سلطان شاہ کی تاویل کے مطابق نامحرم ہوں اور ہر مرد کے لیے نامحرم ہی رہوں گی۔"

"چار رشتے تم نے گنوائے ہیں۔" میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا "ان میں تین رشتے پیدائشی ہوتے ہیں جن پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا لیکن چوتھا رشتہ شاید ان تینوں سے زیادہ مضبوط و مکمل اختیاری ہوتا ہے۔ اسے مذہب' اخلاق اور قانون کا ہر تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ تم نے بلاوجہ اپنے اوپر تنہائی مسلط کی ہوئی ہے۔ عورت کا اصل روپ شادی کے بعد ہی نکھرتا ہے۔ وہ اس راہ پر چل پڑتی ہے جو اسے ماں کے مقدس مرتبے پر پہنچا دیتا ہے۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی اور بولی "ڈیئر! تم بھی دوسرے مشرقی مردوں کی طرح دقیانوسی خیالات کے حامل ہو۔ مجھے بتاؤ کہ میں کہاں سے آگئی۔ میری ماں نے جمی لائیڈ سے شادی نہیں کی' وہ کسی کی بیوی نہیں تھی مگر میری ماں تھی۔ مغرب میں یہ چلن عام ہے۔ وہاں ایسی لاکھوں مائیں موجود ہیں۔ ماں کا درجہ حاصل کرنے کے لیے شادی کبھی بھی ضروری نہیں رہی۔"

"تم بہک رہی ہو۔ ہم مغربی معاشرت یا اخلاقیات پر بات نہیں کر رہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے تسلیم کیے ہوئے چار میں سے ایک رشتے کو اپنا کر تم تنہائی کے عفریت سے نجات حاصل کر سکتی ہو۔ تمہیں یہ ڈھکوسلا اب ختم کر دینا چاہیے۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس بار یہ محسوس کر کے مجھے اطمینان ہوا کہ اس کی ہنسی میں بیگانگی اور مایوسی نہیں تھی' وہ زندگی سے بھرپور ہنسی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "مجھے خوشی ہے کہ تم میرے

Downloaded from https://paksociety.com

بارے میں اتنی دردمندی سے سوچتے ہو۔ اپنے آس پاس کسی ہمدرد کی موجودگی سے بھی انسان کو بہت سکون ملتا ہے۔ مجھ پر کبھی کبھی قنوطیت طاری ہونے لگتی ہے۔ ایسے دوروں کے لیے مجھے معاف کردینا۔ میں تمہاری تجویز کے بارے میں ضرور سوچوں گی مگر یہ مرحلہ بھارت سے واپسی کے بعد آئے گا۔ میں پوری سنجیدگی اور ذمے داری کے ساتھ وہاں جانے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بلاوجہ تمہارے ساتھ دماغ سوزی کررہا تھا۔" میں نے جھلا کر کہا۔ وہ خاموشی سے مسکراتی رہی۔

"وہاں جاکر تم میرے لیے مسائل پیدا کرنے کے سوا کیا کرسکو گی؟" اس کی خاموشی کا وقفہ طویل ہونے پر میں نے قدرے برہمی سے پوچھا "تمہیں بھروسا نہیں ہے کہ ہم دونوں وہاں جاکر اپنے مشن کو کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچاسکیں گے؟"

"تم اتنل بسواس کے پیچھے جارہے ہو۔ میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "تمہارا شکار تم ہی کو مبارک ہو۔ میں تم سے دور رہوں گی۔ فری لانسر کے طور پر وہاں جاؤں گی اور جو ہاتھ آیا' اس کا سرکچل دوں گی۔ مجھے تمہارا صرف اتنا تعاون درکار ہے کہ میری سفری دستاویزات تیار کرادو۔ ہوسکے تو جلال کی تجویز کے مطابق مجھے بھی اپنے ساتھ سرحد پار کرادو تاکہ میری تازہ تصاویر وغیرہ ریکارڈ پر نہ جاسکیں۔"

"تمہارے دماغ میں یہی سودا سمایا ہوا تھا تو تم اب تک گھنٹے بن کا مظاہرہ کیوں کررہی تھیں؟ تمہیں اول خان سے بات کرنی چاہیے تھی۔"

"کسی سے بات کرنے سے پہلے تمہاری رضامندی ضروری تھی۔ وہ باموت آدمی ہے۔ انکار نہیں کرسکے گا۔"

اچانک لابی میں سے سلطان شاہ کے کھنکارنے کی آواز آئی پھر اس نے سامنے آئے بغیر ہانک لگائی "میں نے کافی دیر انتظار کرلیا۔ اب میرے سر میں درد جگر ہورہا ہے۔ اجازت ہوتو ڈرائنگ روم میں آجاؤں؟"

"چلے آؤ!" مجھ سے پہلے ویرا نے اسے پروانہ راہداری جاری کرتے ہوئے کہا "اپنی زبان پر قابو رکھو تو تم خاصے بے ضرر آدمی ہو۔"

"بے ضرر سے تمہاری کیا مراد ہے؟" سلطان شاہ پر تشویش انداز میں سوال کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کے پیچھے غزالہ بھی تھی۔

اس کی صورت دیکھتے ہی ویرا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور کہا "بے ضرر سے وہ مراد نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہاری زبان کڑوی ہے۔ اس کے استعمال میں احتیاط رکھو تو خیریت رہے گی۔"

فیروپائرین (رجسٹرڈ)

قائم شدہ 1956

T.M. Reg. 7635

فیروپائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کردیتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کردیتی ہے۔
فیروپائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کرکے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بدبودار پانی خارج کرکے ورم اور سوزش اتارتا ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کرکے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔
فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا لگانے کا سبب بنتے ہیں۔
فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کرکے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
فیروپائرین جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جاسکتی ہے۔

Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

تیار کردہ: فیر لیبارٹریز O/1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون:
051- 4424028
051- 4451631

Downloaded from https://paksociety.com

"کیا تم دیوار کی اوٹ میں چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟" میں نے سلطان شاہ سے پوچھا۔

اس نے اپنے دونوں کانوں کو چھوتے ہوئے کہا "میں ایسی گھٹیا حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ابھی اپنے کمرے سے آرہا ہوں۔ غزالہ کمرے کی جھاڑ پونچھ میں میرا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میرا اعتبار نہ ہو تو تم اس سے تصدیق کرسکتے ہو۔"

"بعض اوقات آپ سلطان شاہ کے ساتھ زیادتی کرجاتے ہیں۔" غزالہ نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"تم اسے اکسانے کی کوشش مت کرو۔" ویرا نے منہ بنا کر غزالہ کی بات پر اعتراض کیا "مذاق میں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ میرے بارے میں سلطان شاہ کیا کچھ کہتا رہتا ہے مگر میں ہمیشہ اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی ہوں۔"

"دونوں کانوں کے درمیان کچھ بھی موجود نہ ہو تو یہی ہوتا ہے۔" سلطان شاہ بولا "یہ بتاؤ کہ تم دونوں کے کیا مذاکرات ہورہے تھے۔"

"ہم واقعی اہم گفتگو کررہے تھے۔" میں نے جواب دیا "ویرا بھارت جانے پر مصر ہے۔"

"جب ایک فیصلہ ہوچکا تو یہ نئی بات کہاں سے نکل آئی؟" غزالہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ نئی بات نہیں ہے۔ میں شروع سے سفر پر جانے کا تہیہ کیے بیٹھی ہوں۔ اب بولنے کا وقت آیا ہے تو میں نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی ہے۔" ویرا نے مضبوط لہجے میں اپنے موقف کی وکالت شروع کردی "میں تم دونوں پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ تم سے بالکل الگ تھلگ رہوں گی۔"

"ہم مل کر کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک اس پر بے چون وچرا عمل کرتا ہے مگر تم ہمیشہ الگ راگ الاپنے کی کوشش کرتی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح تم دوسروں کے ساتھ اپنے لیے بھی مسائل پیدا کرلیتی ہو۔" سلطان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اختلاف رائے ایک الگ بات ہے۔ ضروری نہیں کہ میں تمہاری اور ڈینی کی ہر بات سے اتفاق کرتی رہوں۔" ویرا نے بات مذاق میں اڑانے کے بجائے معقولیت سے جواب دیا "آج سے پہلے میں مختلف رائے رکھنے کے باوجود تم لوگوں کے ہر فیصلے پر عمل کرتی رہی ہوں مگر اب مجھے اپنی راہ اختیار کرنی پڑ رہی ہے۔ یقین کرو کہ میں یہ بات پورے خلوص سے کہہ رہی ہوں۔ اس میں میری کوئی بدنیتی پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے محرکات بہت جائز اور طاقت ور ہیں۔"

"تم کن محرکات کی بات کررہی ہو؟" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا سلطان شاہ یہاں تمہاری نگہداشت نہیں کرسکے گا؟"

"مجھے کسی کی چوکیداری کی ضرورت نہیں۔" میرے سوال پر وہ قدرے چڑ کر بولی "میں سلطان شاہ جیسے دو چار افراد کو آسانی سے پال سکتی ہوں۔ مجھے اصل خوف تم دونوں کی طرف سے ہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تمہیں بھارت میں کسی تیسرے مددگار کی ضرورت پڑے گی۔"

"معدے میں زیادہ الکحل اتر جائے تو چھٹی حس اسی طرح چوپٹ ہوکر رہ جاتی ہے۔" سلطان شاہ کو اس کا مضحکہ اڑانے کا موقع مل گیا "مے نوشی سے مکمل پرہیز کے ساتھ ٹھنڈے دل سے سوچو گی تو خود بھی میری رائے سے متفق ہوجاؤ گی۔"

ویرا کے ذہن میں ایک اندیشہ جنم لے چکا تھا اور وہ اس کی روشنی میں فیصلہ بھی کرچکی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس نے غزالہ اور سلطان شاہ کی مداخلت کے بعد کسی تفصیل و حجت کے بغیر وہ نکتہ بیان کردیا تھا ورنہ مجھے رہ رہ کر یہی خلش ستائے جارہی تھی کہ اس نے اچانک ایک نئی بات کیوں شروع کردی تھی۔ ہم تینوں نے ویرا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ ہم بھارت کی سرزمین پر ایک دوسرے کی موثر خبرگیری کرتے ہوئے اپنا کام مکمل کرسکتے ہیں لیکن اس کے دماغ میں جو بات سما گئی تھی، اسے نکالنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔

ہمارے درمیان دیر تک بحث ہوتی رہی۔ اس گفتگو میں کچھ گرمی اور تلخی کے مراحل بھی آئے مگر ہم ویرا کو اس کا ارادہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہ کرسکے۔ اس پوری گفتگو میں سلطان شاہ نے ایک بار بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب ویرا بھی جانے کا فیصلہ کرچکی ہے تو وہ اکیلا کراچی میں رہ کر کیا کرے گا۔ مجھے خدشہ تھا کہ ویرا کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کی ضد کرے گا اور اسے روکنا مشکل ہوجائے گا۔

اپنے مزاج اور رویّے کے اعتبار سے وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ان میں سے ایک کوئی بات کہتا تھا تو دوسرا اس کی مخالفت کرنا اپنا حق بلکہ فرض سمجھتا تھا۔ اس وقت ویرا روانگی پر تلی ہوئی تھی۔ سلطان شاہ نے اسے نیچا دکھانے کے لیے بھول کر بھی اپنی طرف سے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

بے نتیجہ بحث کے بعد اول خان سے رابطہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اگلی صبح اسے دو کے بجائے تین پاسپورٹ بنوانے تھے۔

ویرا کے بارے میں نئی اطلاع اس کے لیے حیران کن

Downloaded from https://paksociety.com

ثابت ہوئی لیکن اسے یہ اندازہ تھا کہ میں نے اس سے رجوع کرنے سے پہلے ویرا کو سمجھانے کا ہر جتن کرلیا ہوگا۔ اس کے لیے مزید ایک پاسپورٹ بنوانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس موضوع پر مختصر سی گفتگو کے بعد اس نے بخشی کا ذکر چھیڑ دیا "اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے بھارتی سفارتی عملے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا ہوا ہے۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حامد اس فن میں اتنا طاق ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ بخشی کی یہ حالت کب تک برقرار رہتی ہے۔"

"بعد میں جو ہونا ہے' وہ ہوتا رہے۔ فی الحال ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ ہم نے ان کے لیے ایک اہم آدمی کو ناکارہ کردیا ہے۔ اس کی سختی اس طرح صاف ہوئی ہے کہ وہ اپنے دفتر کے ساتھیوں کو بھی نہیں پہچان سکا۔ اس کے انجام سے دشمنوں میں دہشت کی لہر دوڑ گئی ہے۔"

"میں حامد سے یہ فن سیکھنا چاہوں گا۔" میں نے خواہش ظاہر کی "یہ دشمن کو مفلوج کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔"

ریسیور پر اول خان کی ہنسی کی ہلکی سی آواز آئی پھر وہ بولا "یہ انگلیوں کی مہارت کا کام ہے۔ انسانی جسم میں دماغ سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اگر دوران خون میں کسی رکاوٹ کی وجہ سے ایک مختصر وقفے کو لیے دماغ کو تازہ خون اور اس میں موجود آکسیجن نہ ملے تو محرومی کا شکار ہونے والے جیلے ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ حامد نے اس کام میں خاصی مہارت حاصل کی ہوئی ہے۔"

"پھر تو ٹیسٹ وغیرہ سے بھی اصل سبب کی نشاندہی ہونی مشکل ہے۔ ان لوگوں کو اسے ایک ناگہانی حادثہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کی کھوپڑی پر آئی ہوئی ضربات اس امکان کو اور زیادہ واضح کریں گی۔"

"انہوں نے ایک ہی بات اٹھائی ہے۔" اول خان فون پر بتا رہا تھا "میجر بخشی ان کے عملے کا ایک متین اور ذمے دار رکن ہے۔ اسے جگدیش موہن کے پس ماندگان سے تعزیت کے بعد اپنے دفتر آنا چاہیے تھا پھر وہ پتھریلے ساحل پر کیسے پایا گیا۔"

"یہ خدشہ ہمارے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھا۔ تم نے اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لیا ہوگا۔"

"وہ پختہ عمر کا مالک ہونے کے باوجود رنگین مزاج تھا۔ موہنی پنڈت اور ماروتی کے بارے میں حقائق میرے سامنے تھے۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا لیکن اس کی گاڑی میں ایسے شواہد ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں اس کے ساتھ سفر کرتی رہی ہیں۔ ہماری طرف سے تھوڑی دیر پہلے یہ نظریہ جاری کیا گیا ہے کہ بخشی کو موہن ہاؤس میں آئے ہوئے مہمانوں میں کوئی بھولی بسری خاتون ملی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ساحل کی طرف چل دیا۔" اول خان اس کیس کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کررہا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "وہاں سرمستی کے عالم میں بخشی کا پاؤں پھسلا اور وہ پتھروں پر گر گیا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر عورت کے سر سے سارا رومان ہوا ہوگیا۔ وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ شاید اس نے بخشی کو مردہ سمجھا اور وہاں سے کھسک گئی۔"

"خاصا بے داغ اور قرین قیاس نظریہ ہے۔" میں نے اس کی کہانی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"بس ایک خدشہ ہے۔" اس کی آواز ابھری "اسے اغوا کرنے کے لیے تم نے انگوٹھی کے کھوکھلے کیپسول سے جو سریع الاثر سیال اس کے جسم میں داخل کیا تھا' وہ اس کہانی کو کمزور کردے گا۔"

"ابھی وہ ہماری تحویل اور ہمارے اسپتال میں ہے۔ اس کے خون کی ٹیسٹ رپورٹ میں سے وہ حصہ حذف کیا جاسکتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر اپنا خیال ظاہر کیا "جب تک وہ اپنے ملک پہنچے گا۔ اس سیال کے اثرات خون سے زائل ہوچکے ہوں گے۔"

"اب دیر ہوچکی ہے۔ وہ ٹیسٹ فوری طور پر کیے گئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ متعلقہ افراد ایسی کسی پیشہ ورانہ بددیانتی پر آمادہ نہ ہوتے۔ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ وہ اس کو جلد از جلد یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"ان کی اس جلد بازی کا کوئی سبب بھی ہوگا۔" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ملک قریب ہے۔ اپنے وطن میں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہوسکتی ہے۔ آپس میں پائی جانے والی بے اعتمادی کی فضا میں ایک دوسرے پر بھروسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی جگہ ہمارا کوئی آدمی ہوتا تو ہماری سوچ بھی یہی ہوتی۔"

اس سے مزید ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور اس نے اگلی صبح تینوں کی تصاویر کی تیاری کی ہدایت کرتے ہوئے فون بند کردیا۔

"کل پاسپورٹ بن جائیں تو ہمیں پرسوں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" میرے اختتامی فقروں سے اندازہ لگا کر ویرا بولی۔

"روانگی میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ میں خود بھی نئی دہلی جانے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

Downloaded from https://paksociety.com

"اول خان نے شیام کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" غزالہ اچانک سوال کر بیٹھی۔ میں نفی میں سرہلا کر رہ گیا۔ سچ بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں میجر بخشی کی کہانی سن لینے کے بعد میرے لیے اس کی زیادہ اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ زندہ رہتا یا مارا جاتا' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ہم باتوں میں مصروف تھے۔ گفتگو کا رخ خاصا خوش گوار ہو گیا تھا۔ سب نے ذہنی طور پر اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ ویرا بھارت جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس بار سلطان شاہ کو تنہا کراچی میں رہنا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

"مظہر جی! جلدی اسپتال پہنچو۔ روی کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ کوئی اسے اسپتال سے نکال لے گیا ہے۔" ماروتی کی رو دینے والی اور دہشت زدہ آواز میں سنا جانے والا وہ پیغام میرے اعصاب کے لیے ایک بم ثابت ہوا۔

"تم کس اسپتال میں ہو؟ اسے کون لے گیا ہے؟" میں نے ایک سانس میں دو سوال کر ڈالے۔

اس نے اسپتال کا نام بتایا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا "مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس وقت میں خود کو بہت بے بس اور تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ تم فوراً یہاں آجاؤ۔ روی کو کچھ ہوا تو میں رو رو کر اپنی جان دے دوں گی۔" اس نے فون بند کر دیا۔

میجر بخشی کو کامیابی کے ساتھ ناکارہ کر دینے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روی موہن کی آزادی یا زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جسے شیام کے ذریعے موہن ہاؤس کے اندر کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے اور اسی خبیث نے میرے گھر کا فون نمبر بخشی تک پہنچایا تھا مجھے ابتدا ہی سے شبہ تھا کہ شیام کی رپورٹ سن لینے کے بعد بخشی نے فون پر مجھے جو دھمکیاں دی تھیں' وہ ان کو عملی جامہ پہنانے کا پورا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شیام یا بخشی کو میرے اصل نام کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے مجھے مظہر خان سمجھتے ہوئے فون پر دھمکیاں دی تھیں۔ ساتھ ہی وہ روی کو اس کی غداری کا مزہ چکھانا چاہتا تھا کیونکہ شیام نے اپنے کانوں سے یہ بات سن لی تھی کہ کرشن کمار اور ہری چند کی اموات میں وہ پوری طرح حصے دار تھا۔

ہم نے اپنی دانست میں بخشی کو بالکل مہلت نہیں دی تھی۔ رات کو اس نے اپنے گھر سے مجھے فون کیا اور صبح کو ہم نے موہن ہاؤس سے واپسی پر اسے گھیر لیا۔ اس کے ازکار رفتہ ہونے کے باوجود کسی نے روی موہن کے خلاف کارروائی کی تھی تو اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ بخشی نے رات ہی رات میں اپنے کسی ساتھی کو اپنی معلومات میں شریک کر لیا تھا۔

اصل صورت حال کیا تھی۔ اس کا اندازہ ماروتی سے ملاقات کے بعد ہو سکتا تھا جو اسپتال میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی ایک بات کافی تھی کہ اس نے روی کے بارے میں مدد کے لیے میرا سہارا لیا تھا۔ وہ اپنے ماموں زاد بھائی' ہری چند کی رفاقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی تھی' اس کے برے بھلے جیٹھ نے اس کے اعترافات سے دل برداشتہ ہو کر خود کشی کر لی تھی۔ روی کے اچانک غائب ہو جانے پر وہ بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اسپتال میں مجھے دیکھتے ہی وہ اچانک جذباتی ہو جائے گی۔ ایسے نازک موقع پر میرے ساتھ کسی اور کی شمولیت میری سبکی کا باعث بن سکتی تھی۔ میں نے گھر سے اکیلے ہی اسپتال جانے کا فیصلہ کر لیا۔

روی کی رہائش اولڈ کلفٹن کے علاقے میں تھی۔ جب اس نے اپنی جان کے خوف سے کسی اسپتال میں پناہ لینے اور عارضی روپوشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے توقع تھی کہ وہ کسی دور افتادہ لیکن مہنگے اور آرام دہ اسپتال کا رخ کرے گا۔ ماروتی نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے روی اپنے گھر سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ وہ کلفٹن کے ایک اسپتال میں تھا جو اپنی جدید سہولتوں اور مہنگے اخراجات کے لیے شہرت رکھتا تھا۔

"حالات نے یکایک اپنا رخ تبدیل کیا ہے۔" میں نے چلتے چلتے ان تینوں کو متنبہ کیا "روی کے قصے میں بخشی کا کوئی ساتھی ملوث ہے تو ہم بھی محفوظ نہیں ہیں۔ وہ شخص فون نمبر کے ذریعے سراغ نکال کر یہاں بھی وار کر سکتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔" ویرا نے بے پروائی سے جواب دیا "ایس ٹی ایف کے دو آدمی اس وقت بھی ہماری چھت پر پہرا دے رہے ہیں۔ ہم بھی ہوشیار رہیں گے۔ بس موبائل فون پر اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہنا۔ ماروتی تم سے ملاقات کے لیے کوئی بھی بہانہ کر سکتی ہے۔"

ویرا ہر بات کے خفی پہلو پر بلا توقف چھلانگ لگاتی تھی۔ ماروتی کے بارے میں جو بات اس نے کہی' وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا' اسے یکسر مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا' میں اسے گھورتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

ماروتی متورم چہرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ' اسپتال کی انتظار گاہ میں میری منتظر تھی۔ اسپتال کے انتظامی عملے کی ایک خوش شکل اور خوش لباس خاتون اس کی دل جوئی کے لیے اس کے ساتھ موجود تھی۔

"مظہر!" مجھے دیکھتے ہی ماروتی نے بھرائی ہوئی آواز میں

Downloaded from https://paksociety.com

مجھے پکارا اور اپنی جگہ چھوڑ کر تقریباً دوڑتے ہوئے میرے سینے سے آ لگی۔ وہ ایسی صورت حال تھی کہ پہلو بدل کر خود کو اس کی زد سے نہ بچا سکا اور نرمی سے اسے اپنی بانہوں میں لے کر خود سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابتدائی لمحات میں میری کوشش بار آور ثابت نہیں ہو سکی۔ وہ میرے سینے سے لگ کر سسک پڑی تھی "پتا نہیں روی کہاں ہیں... انہیں کون لے گیا..."

"یہ خاتون بلاوجہ پریشان اور ہراساں ہو رہی ہیں۔" اسپتال کے عملے کی خاتون نے وضاحت کی "مسٹر روی موہن اپنی مرضی سے اپنے دوست کے ساتھ گئے ہیں۔ ہم انہیں نہیں روک سکتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر میں ضرور اپنے گھر پہنچ جائیں گے...."

"اسپتال والے بتا رہے تھے کہ وہ کئی گھنٹے پہلے یہاں سے چلے گئے۔ میں دو مرتبہ گھر فون کر چکی ہوں... روی ابھی تک وہاں نہیں پہنچے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں سے ہمارے گھر کا فاصلہ چند منٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ...!" ماروتی مجھ سے الگ ہو کر کہہ رہی تھی۔

انتظار گاہ میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا داخل ہو رہا تھا۔ منتظم خاتون نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ماروتی کی بات کاٹ دی "آپ دونوں میرے ساتھ میرے دفتر میں چلیں۔ میں آپ کو ہر بات وضاحت سے سمجھاتی ہوں۔"

وہ کوئی عام مسئلہ نہیں تھا۔ بہت گمبھیر اور الجھا ہوا معاملہ تھا۔ مجھے چند فقروں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں اسپتال والے زیادہ قصوروار نہیں تھے۔ مجھے رہ رہ کر صرف ایک بات پریشان کر رہی تھی کہ روی اپنے کسی شناسا کے ساتھ گیا تھا تو وہ اب کہاں تھا اور اگر وہ کسی اجنبی کی سازش کا نشانہ بنا تھا تو کسی مزاحمت کے بغیر اس کے ساتھ جانے پر کیوں آمادہ ہوا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ اس کے ذہن پر اپنے قتل کا خوف سوار تھا اور اگر وہ محض اسی وجہ سے گھر اور اپنے بڑے بھائی کی آخری رسوم چھوڑ کر اسپتال میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔

اپنے مختصر مگر آراستہ دفتر میں پہنچ کر وہ خاتون پورے اعتماد سے اپنی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذات پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے زبان کھولی تو پہلے کے مقابلے میں اس کا لہجہ قدرے بدلا ہوا تھا۔ "مسٹر روی، اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے اور ہمارے واجبات ادا کرنے کے بعد چلے گئے۔ آپ بتائیں کہ ہم انہیں کیوں اور کیسے روک سکتے تھے؟"

ماروتی نے اس سے الجھنا چاہا لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا "تم دخل نہ دو۔ مجھے سکون سے بات سمجھنے دو۔" اسے سمجھانے کے بعد میں اسی خاتون سے مخاطب ہو گیا "روی یہاں اپنا کوئی نہ کوئی طبی مسئلہ لے کر آیا ہو گا۔"

"انہیں سینے میں درد کی شکایت تھی۔ وہ اپنا تفصیلی میڈیکل چیک اپ کرانا چاہتے تھے۔"

"اسے اسپتال میں داخل کرنا ضروری تھا؟" میں نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ان کی خواہش تھی کہ میڈیکل چیک اپ کے لیے انہیں اسپتال میں داخل کر لیا جائے۔" جواب دیتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکنیں نمودار ہو گئیں "وہ چاہتے تو ای سی جی ہونے اور دوائیں لینے کے بعد واپس جا سکتے تھے۔"

"کیا کسی شخص کو بلا ضرورت اسپتال میں داخل کرنا اخلاقی اعتبار سے درست ہے؟"

اس نے اپنی کہنیاں میز کی سطح پر ٹکا کر کہا "مسٹر منظر یا جو کوئی بھی آپ ہوں، بات کو غیر ضروری طور پر الجھانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ کوئی خیراتی اسپتال نہیں ہے جہاں داخلے کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے ہوں۔ یہ ایک کمرشل اسپتال ہے جہاں معززین اور شرفا آتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے اخراجات ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہر پرائیویٹ اسپتال کو اپنے خالی کمروں کے لیے مریضوں کی ضرورت رہتی ہے۔"

"پھر تو ہوٹل اور پرائیویٹ اسپتال میں کوئی فرق نہ ہوا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ کوئی صحت مند آدمی اپنی خوشی سے اسپتال میں وقت گزارنا پسند نہیں کرتا۔"

"تو کیا روی کا میڈیکل چیک اپ مکمل ہو گیا تھا جو اسے جانے کی اجازت دے دی گئی؟"

"آج دن میں ٹیسٹ ہوتے رہے۔" وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "رپورٹیں کل دوپہر تک دستیاب ہو سکیں گی۔ ماہرین رپورٹوں کی روشنی میں ان کا معائنہ کرتے اور کل شام تک انہیں تشخیص کے نتائج اور علاج کی تجاویز کے ساتھ رخصت مل جاتی۔"

"یہ عمل پورا ہونے سے پہلے اسے چھوڑ کر کیا اسپتال نے اپنا فرض نظر انداز نہیں کیا۔"

"ہرگز نہیں!" اس نے پورے وثوق سے کہا "بعض اوقات آپریشن ٹیبل پر لیٹا ہوا مریض گھبرا کر اٹھ جاتا ہے اور آپریشن کے بغیر اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ ہم اسے اس کی ذمے داری پر گھر جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ مسٹر روی کا کیس تو بہت معمولی ہے۔ بعض لوگ زکام پر بھی میڈیکل ٹیسٹ کرانا ضروری تصور کرتے ہیں۔ انہیں مریضوں کی اسی قسم میں شمار کیا گیا تھا۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"اب یہ بتائیں کہ اسے اسپتال سے کون نکال کر لے گیا؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ مجھ سے پولیس والوں کے سے انداز میں جرح نہ کریں۔" اس بار وہ اپنی برہمی پر قابو نہ رکھ سکی "میں آپ کے غیر ضروری سوالوں کے جواب بھی تحمل سے دے رہی ہوں مگر آپ شائستگی کی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔"

"میں معافی چاہتا ہوں۔" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا "گم شدہ مریضوں کے تیمارداروں کو اتنی رعایت ملنی چاہیے۔"

وہ میرے الفاظ اور لہجے کی کاٹ کو سمجھ رہی تھی۔ چند ثانیوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "ہم کو اس کا تعارف حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مسٹر روی نے اس کے ساتھ میرے دفتر میں آکر اپنے واجبات ادا کیے اور وہ دونوں چلے گئے۔"

"اس سے میڈیکل چیک اپ مکمل ہونے تک رکنے کے بارے میں ضرور کچھ کہا گیا ہوگا۔"

"یہ میری اولین اور بنیادی ذمے داری تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ کل آکر ماہرین سے مل لیں گے۔ انہیں شام سات بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کسی وجہ سے وہ اپنے گھر نہ پہنچے تو کل شام سات بجے یہاں ضرور آئیں گے۔"

"تم اس سے ملنے اسپتال کب آئی تھیں؟" میں نے گردن گھما کر ماروتی سے پوچھا۔

"میں نہیں آسکی تھی۔" ماروتی نے روہانسی آواز میں جواب دیا "رات سے بھایا جی اور گھر والوں کے چکر میں الجھی ہوئی تھی۔ تین چار بار روی سے فون پر بات ہوئی۔ بھایا جی کے کریا کرم کے بعد میں یہاں آئی تو وہ یہاں نہیں تھے۔"

"اگر آپ لوگوں کی تشفی ہوگئی ہو تو میں اجازت چاہوں گی۔ مجھے اسپتال میں دوسرے کام بھی نمٹانے ہوتے ہیں۔" اس وقت تک اسپتال والی خاتون کے بشرے سے خوش خلقی کے سارے اثرات کافور ہو چکے تھے۔

"خاتون! یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ یہ پولیس کیس بھی بن سکتا ہے۔" میں نے اسے جتایا۔

"ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ آپ شوق سے رجوع کریں۔" اس نے تنک کر اپنی کرسی چھوڑ دی "میرا مشورہ یہ ہے کہ اسپتال کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے آپ اپنے گھر میں وہ اسباب تلاش کریں جن کی بنا پر یہ ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید سرد مہری اور رکھائی کا مظاہرہ کرتی، میں کرسی سے اٹھ گیا۔ ماروتی بھی میرے ساتھ تھی۔

"کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟" راہ داری عبور کرتے ہوئے ماروتی بے بسی سے منمنائی "گھر میں مہمان اور رشتے دار بھرے ہوئے ہیں۔ میں انہیں کیا بتاؤں گی؟"

ماروتی سے میری واقفیت بہت پرانی نہیں تھی مگر اس مختصر سی مدت میں، اس ضدی عورت کو بہت قریب سے پرکھ اور برت چکا تھا۔ وہ اوپر سے جتنی خوب صورت تھی، اندر سے اسی قدر بے مہر اور سفاک بھی تھی۔ اس نے جگدیش موہن سے اپنی مجروح انا کا انتقام لینے کے لیے خود کو میرے قدموں پر ڈھیر کردیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ اپنے انتقام کے بارے میں جگدیش کو اپنی زبان سے سب کچھ بتا کر اتنا مشتعل کردیا کہ ماروتی کو دیکھ کر زندگی بھر، شکست کی ہولناک چتا میں مسلسل جلتے رہنے کے بجائے اس نے خود اپنے سینے میں گولی اتار کر آخری چتا تک پہنچنے کا فیصلہ کرلیا۔

ماروتی کا ایک وہ روپ تھا جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ وہ بلا کی انا پرست عورت تھی۔ اس کے نزدیک عزت و آبرو کی کوئی وقعت تھی، نہ اپنے شوہر کے بڑے بھائی کے خون کی کوئی حرمت تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنا سر غرور سے بلند رکھنا جانتی تھی مگر اس وقت وہ روی کے لیے یوں ہلکان ہوئے جارہی تھی جیسے وہ روئے زمین کی سب سے زیادہ وفا شعار اور شوہر پرست بیوی ہو۔

اس کا پہلا روپ بھی حقیقت تھا اور روی کے لیے اس کی تڑپ میں بھی دور دور تک اداکاری کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ وہ ایک ہی عورت کی شخصیت کے دو روپ تھے۔ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دو چہرے رکھنے والی ماروتی کو دلاسا دوں یا حقارت سے دھتکار دوں۔

وہ اپنی گاڑی سے اسپتال آئی تھی۔ میرے لیے وہ ایک اچھا عذر تھا۔ میں نے اسپتال کے برآمدے سے اترتے ہوئے کہا "تم نے پیغام دیا اور میں بے ساختہ یہاں دوڑا چلا آیا۔ اب تم خاموشی سے گھر لوٹ جاؤ۔ روی کا سراغ لگانے کے لیے مجھے جو کچھ کرنا ہوگا، اس کے لیے تمہاری موجودگی ضروری نہیں ہے۔ تم سے الگ رہ کر میں زیادہ آزادی اور تیز رفتاری سے کوئی پیش رفت کرسکوں گا۔"

ماروتی اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی، میرے ساتھ لگی رہی۔ میں خود کو تماشا بنانے سے بچانے کے لیے نیم تاریک پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ماروتی کہتی رہ گئی کہ اس کی کار باہر سروس لین میں کھڑی ہوئی تھی مگر میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔

ہم اسپتال کی عمارت سے آنے والی تیز روشنیوں کی زد

Downloaded from https://paksociety.com

سے نکلے تو اچانک ماروتی تحیر زدہ آواز میں بول پڑی "روی کی کار تو وہ کھڑی ہے۔"

وہ آہنی کار تھی' ایک جگہ پارک کی ہوئی تھی مگر اس کی نشان دہی پر ہم دونوں ہی اضطراری طور پر یوں اس طرف لپکے جیسے اس کار کے دوڑ جانے کا خطرہ ہو۔ میں نے روی کی گاڑی پہچان لی تھی۔ ماروتی نے بتایا کہ وہ صبح سویرے اسی گاڑی میں گھر سے نکلا تھا۔ اس وقت تک جو شواہد سامنے آئے تھے ان سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ روی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گیا تھا۔ حد یہ تھی کہ اس نے اپنی گاڑی لے جانے کے بجائے دوسرے شخص کی کار یا ٹیکسی کو ترجیح دی تھی۔

"اس کار کی چابیاں روی کے پاس ہوں گی۔" میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

"گھر پر ڈپلی کیٹ چابیاں بھی موجود ہیں۔ ضرورت ہو تو وہ آسکتی ہیں۔" اس کی آواز میں امید کے دیے جل اٹھے۔

"گاڑی سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اسے ڈرائیور کے ذریعے گھر منگوالینا۔ اب خود کو سنبھال کر گھر چلی جاؤ۔"

وہ بے وفا عورت اپنے شوہر کے لیے اتنی پریشان تھی کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوئی اور میں اسے پارکنگ لاٹ سے نکال کر سروس لین میں لے آیا جہاں میری اور اس کی گاڑیاں ایک دوسرے سے دور کھڑی ہوئی تھیں۔ اسے روانہ کردینے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر اسپتال کا رخ کرنے کا ارادہ کیا پھر اسے ملتوی کردیا۔ میرے ساتھ بات جس ڈھب پر نکل گئی تھی' اس کے بعد مجھے اسپتال کے عملے سے کسی تعاون کی امید نہیں رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسپتال سے واپس روانہ ہوگیا۔

میری نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں مگر میرا ذہن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اسپتال میں اپنے جتن کرلیے تھے۔ روی کی کار کے وہاں پائے جانے کے بعد اولی خان اپنے اختیارات کا سہارا لے کر مزید معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ اگر یہ پتا چل جاتا کہ روی کو وہاں سے کس کار میں لے جایا گیا تھا تو روی کی بو پر لگے ہوئے دشمنوں تک پہنچنے میں آسانی ہوسکتی تھی۔ اس ضمن میں صرف اور صرف کار کا نمبر مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ شہر میں نت نئے ماڈلوں کی گاڑیوں کی جو بھرمار ہوگئی تھی اس کی وجہ سے محض ساخت یا رنگ کے سہارے ان لوگوں تک پہنچنا دشوار تھا۔

مجھے ان لوگوں سے اس لیے پرخاش نہیں تھی کہ روی کے دشمن تھے۔ روی کو میں نے ایک شریفانہ معاہدے کے تحت معاف ضرور کردیا تھا مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ وہ ایک مدت سے کرشن کمار کا معاون اور مددگار رہا ہوا تھا' اسے عملی تعاون کے ساتھ ساتھ بھاری مالی سرپرستی بھی فراہم کیا کرتا تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے اپنے خون کے پیاسوں کی دسترس میں پہنچ جاتا تو مجھے ذرا بھی افسوس نہ ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ہاتھوں سے بچ جانے کے باوجود وہ ایک نہ ایک دن مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر اپنے صحیح انجام کو پہنچ جائے گا۔

یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس کے دشمن اتنی تیزی سے اس تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ماروتی تھی۔ وہ بھی کوئی پارسا نہیں تھی۔ اپنے شوہر کی طرف سے ملی ہوئی آزادی کی اوٹ میں بے وفائی کا جرم اس قدر سنگین تھا کہ اسے جو سزا بھی دی جاتی وہ کم ہوتی۔ اس جوڑے سے کوئی ہمدردی نہ ہونے کے باوجود میں روی کے دشمن کے بارے میں خلش کا شکار تھا۔

شیام کا کردار سامنے آنے کے ساتھ یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اس وقت تک صرف میجر بخشی میدان میں سامنے رہ گیا تھا۔ ہم نے رعایت اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اسے ذہنی طور پر ناکارہ کردیا تھا مگر اس نے شاید وقت سے فائدہ اٹھالیا تھا۔ اپنے علم میں آنے والی باتوں میں کسی اور کو بھی شریک کرلیا تھا۔ وہ جو کوئی تھا' بہت پھرتیلا تھا۔ اس نے بخشی کا حشر دیکھتے ہی اپنی سرگرمیاں شروع کردی تھیں۔

وہ اسپتال میں چھپے ہوئے روی موہن تک پہنچ گیا تھا تو ٹیلی فون نمبر کے سہارے ہمارے سر پر بھی پہنچ سکتا تھا۔ روی کے اس دشمن کا خاتمہ کرکے میں مظہر خان کے روپ میں خود کو بچا سکتا تھا۔ اسے ڈھیل دینا خود میرے حق میں خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ماروتی کے فون پر اسپتال کا رخ کرکے میں نے غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ روی کو وہاں سے نکال لے جانے والے لمبا کھیل کھیل رہے تھے۔ روی کو لے جانے کے بعد انہوں نے اسپتال کو خالی نہیں چھوڑا ہوگا۔ نگرانی کے لیے وہاں کوئی نہ کوئی موجود رہا ہوگا تاکہ روی کی جستجو میں آنے والے' اس کے ہمدردوں میں اپنے نئے شکار کو تلاش کرسکے۔

وہ خیال آتے ہی میری نگاہیں بے ساختہ عقب نما آئینے کی طرف اٹھ گئیں۔ میرے پیچھے کئی گاڑیاں چلی آرہی تھیں

Downloaded from https://paksociety.com

پہلی نظر میں ان میں سے کوئی بھی گاڑی مشکوک نظر نہیں آئی۔ میں نے ان گاڑیوں کی پڑتال کے لیے مین روڈ چھوڑ کر کسی ذیلی سڑک پر اترنے کا فیصلہ کرلیا۔

سڑک کے بائیں کنارے پر ایک سڑک کے آثار دیکھتے ہی میں نے انڈی کیٹر روشن کیا اور ٹریفک کی روانی میں اپنی کار کو دھیرے دھیرے بائیں طرف لیتا چلا گیا۔ اس دوران میں میری نظریں عقب نما آئینے کا بھی جائزہ لیتی رہیں۔ اسٹریٹ لیمپس کی تیز روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ٹریفک کے دھارے سے کٹ کر گہرے سبز رنگ کی ایک کار میرے پیچھے چلی آرہی تھی۔ اسے چلانے والے نے مڑنے کا کوئی اشارہ دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔

میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ مجھے اس سبز کار سے بچنے کی فکر سوار ہوگئی کیونکہ میں اس وقت تک بے خبری کے عالم میں ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ اگر وہ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے تو ابتدا سے ایک منصوبے کے تحت چلے آرہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے وہ سبز کار اسپتال کے قریب کھڑی دیکھی تھی۔

اس وقت میرے سامنے دو متبادل راہیں تھیں۔ میں بائیں طرف گھوم کر انہیں اپنے پیچھے آنے کا موقع دیتا اور پھر رفتار کم کردیتا۔ وہ عام شہری ہوتے تو تیز رفتاری سے آگے نکل جاتے، شرپسند ہوتے تو میری اس حرکت سے گھبرا کر بے تکی حرکتیں شروع کردیتے، دوسرا متبادل یہ تھا کہ میں مڑنے کا ارادہ منسوخ کرکے سیدھا نکلتا چلا جاتا۔ ان کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ میرے پیچھے مڑنے کا فیصلہ کرسکتے تھے۔ وہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا۔ اگر میں آخری مرحلے پر، موڑ چھوڑ کر سیدھا نکل جاتا اور وہ بھی سیدھے چلے آتے تو یہ بات ہر شک و شبے سے بالا ہوجاتی کہ وہ میرا پیچھا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

مجھے کچھ تشویش ضرور ہوئی مگر میں تعاقب کے امکان سے خوف زدہ نہیں تھا۔ ان سے کسی تصادم کی نوبت آجاتی تو میں بڑے بور کے بھرے ہوئے پستول سے لیس تھا۔ اس سبز گاڑی کی دونوں اگلی نشستوں پر دو افراد براجمان نظر آرہے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ میرے کسی غیر متوقع اقدام کے نتیجے میں وہ تصادم چھوڑ کر فرار کی راہ اختیار کرلیں گے۔ دونوں گاڑیاں سڑک پر آگے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور میں تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔

موڑ آتے ہی میں نے اپنی کار بائیں طرف گھمالی۔ سبز کار کی رفتار یکایک تیز ہوگئی۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پیچھے سے میری کار کو ٹکر مارنے والے ہوں پھر یوں لگا جیسے وہ موڑ پر ہی مجھے دبا کر آگے نکل جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان میں سے کوئی صورت رونما نہ ہوئی۔ سبز کار کے بریک چرچرائے اور وہ قدرے کم فاصلے سے میری گاڑی کے پیچھے مڑ گئی۔

میں نے رفتار بڑھائی تو انہوں نے بھی اپنی گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ یہ کھیل بس چند منٹ جاری رہا۔ اس ذیلی سڑک کا مختصر سا بارونق حصہ چند لمحوں میں پیچھے رہ گیا اور دونوں گاڑیاں ایسے حصے سے گزرنے لگیں جہاں داہنی طرف بلند احاطوں میں گھرے ہوئے فلیٹوں کی ایک فصیل سی کھڑی ہوئی تھی اور بائیں طرف جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تاریک میدان تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔

ان کی گاڑی کا انجن خاصا جاندار تھا۔ انہوں نے اپنی رفتار مزید بڑھائی اور اپنی کار میرے برابر سے گزار کر سائیڈ دبانے لگے۔ میں نے وہ خطرہ بھانپتے ہوئے نشست کے نیچے سے پستول نکالنا چاہا لیکن اس لمحے تصادم سر پر آچکا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر اسٹیئرنگ پر جم گئے۔ میں نے اپنی کار کی رفتار کم کرتے ہوئے اسے بائیں طرف کاٹنا شروع کردیا۔

وہ سبز کار ایسے خطرناک زاویے سے میرے سامنے ترچھی ہوئی کہ میں سڑک چھوڑ کر کچے اور ناہموار میدان میں اترنے پر مجبور ہوگیا۔ مجھے رفتار مزید گھٹانی پڑی۔ اسی لمحے سبز کار کے رکنے کا انتظار کیے بغیر ایک تنومند نوجوان پسنجر سیٹ سے کود کر نیچے اترا، سنبھلا اور تیزی سے میری طرف لپکا میں نے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں بس اتنا دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اگر میں پستول نکالنے کے لیے جھکتا تو وہ کھڑکی کے اترے ہوئے شیشے سے میری گردن پر ہاتھ ڈال دیتا۔ میں نے رینگتی ہوئی گاڑی کا انجن نیوٹرل کیے بغیر ہینڈ بریک کھینچا گاڑی کا انجن ایک تیز جھٹکا لے کر بند ہوگیا۔ میں نے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگادی۔

وہ پوری قوت سے میری طرف آرہا تھا اور میں نے اسی پر چھلانگ لگائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے دونوں کان اپنے ہاتھوں میں جکڑے اور اس کے چہرے پر ٹکر رسید کردی۔

اس کے حلق سے ایک کراہ کے ساتھ گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ میرے پہلوؤں پر اس کی گرفت غیر ارادی طور پر کمزور پڑ گئی۔ میں زور لگا کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ گرفت ڈھیلی ہونے کے نتیجے میں وہ قدرے آگے جھک آیا تھا۔

Downloaded from https://paksociety.com

اس بار میری داہنی ٹانگ چل گئی اور وہ الٹ کر پشت کے بل ریت پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ سب بہت تیزی سے رونما ہوتا چلا گیا۔ مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی کے مسافروں نے ویرانے میں ہونے والی وہ وحشیانہ لڑائی دیکھی اور رفتار بڑھا کر بہت تیزی سے آگے نکلتے چلے گئے تاکہ ناگہانی چل پڑنے والے آتشیں ہتھیاروں کی زد سے محفوظ رہ سکیں۔

مجھ سے چوک یہ ہوئی کہ میں نے اپنی ساری توجہ اپنے حریف پر مرکوز کردی۔ وہ گرا تو میں لپک کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور اس کے چہرے پر مکوں کی برسات شروع کردی۔ اسے ادھیڑ ڈالنے کی دھن میں' میں اس کے ساتھی کو وقتی طور پر فراموش کر بیٹھا تھا جو سبز کار چلا رہا تھا۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ کب وہ اپنی گاڑی روک کے نیچے اترا اور کب مجھ پر پشت سے حملہ آور ہوا۔ میرے سر پر کسی ہتھیار کے وزنی آہنی دستے کی زور دار ضرب پڑی اور میرا ذہن یکایک تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس وقت میرے ذہن کے کسی خانے میں یہ حیرت ابھر آئی تھی کہ وہ مسلح تھا تو اس نے میرے اوپر فائر کرنے کے بجائے' اپنے ہتھیار کو دوسرے انداز میں کیوں استعمال کیا تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ سر کے پچھلے حصے میں درد کے اذیت ناک احساس کے ساتھ میرے حواس رفتہ رفتہ بحال ہوئے تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔

میرے کانوں میں دو افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ ایک تفکر آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا "تم نے ہلا جلا کر اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ یہ ابھی زندہ ہے؟ مرگیا ہے تو ہمیں یہاں بیٹھ کر وقت برباد کرنے کے بجائے واپس چل دینا چاہیے۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ میں نے بہت دیکھ بھال کر چوٹ لگائی تھی۔ اس کی نبضیں چل رہی ہیں" دوسرے نے کہا۔

وہ ابتدائی فقرے سن کر میری جان میں جان آئی کہ میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ وہ دونوں بھی فوری طور پر مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ میرے پپوٹے بند تھے مگر اس کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ارد گرد اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے پپوٹوں کے درمیان ہلکی سی جھری پیدا کی۔ چند ثانیوں تک مجھے کچھ نظر نہیں آیا پھر میں نے دیکھ لیا کہ تاروں بھرے آسمان کے سائے میں دو انسانی ہیولے کھڑے سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔

"اب تک اسے ہوش میں آجانا چاہیے تھا" پہلی آواز پھر سنائی دی "ماسٹر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ سالا مکاری نہ کر رہا ہو۔"

"میرے سامنے اس کی مکاری نہیں چلے گی۔ ابھی اس کے منہ پر تھرماس کا پانی انڈیلتا ہوں" دوسرے کو اپنے اوپر ناز تھا۔

"ٹھنڈا پانی برباد مت کرو۔ اس کے بال پکڑ کر تھپڑ لگاؤ۔ جلدی ہوش آجائے گا۔"

وہ تجویز خاصی سنگ دلانہ تھی مگر میں ان سے کسی بھلائی کی امید نہیں کرسکتا تھا۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ انہوں نے مجھے زندہ رکھا ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان دونوں نے مجھے شہر سے باہر' کسی ویرانے میں لاکر زمین ڈال دیا تھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ وہاں اندھیرا اور سناٹا خاصا گہرا تھا۔ کہیں بہت دور سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے انجنوں کا بہت ہی دھیما اور گھٹتا بڑھتا شور' وقفے وقفے سے ہواؤں کے دوش پر تیرتا جاتا تھا ورنہ پھر وہی سناٹا چھا جاتا تھا جسے ان دونوں کی آوازیں مجروح کر رہی تھیں۔

میں منتظر رہا۔ زمین پر کسی کے چلنے کی دھمک سنائی دی پھر کسی نے مٹھی میں میرے بال جکڑ کر میرا سر زمین سے کچھ اوپر اٹھالیا۔ اسی کے ساتھ میرے چہرے پر تھپڑ پڑنے شروع ہوگئے۔ میں نے دانت بھینچ کر خاموشی سے وہ مار برداشت کرنی شروع کردی۔

"شاباش!" پہلی آواز گونجی "یہ سمجھ لو کہ اس وقت تم اپنے چہرے پر پڑنے والے گھونسوں کا حساب برابر کر رہے ہو۔"

اس مرتبہ دونوں آوازوں کا فرق نمایاں ہوگیا۔ میرے ہاتھوں پٹنے والا مجھے مار رہا تھا۔ دوسرا رتبے میں اس سے بڑا یا سینئر معلوم ہوتا تھا۔

پہلے کا تبصرہ سن کر دوسرے نے طمانچوں کا سلسلہ موقوف کرکے میرے بال چھوڑ دیے۔ میں نے اپنا بدن بالکل ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا۔ دکھتا ہوا سر زمین سے ٹکرایا تو میرے سر میں درد کی ایک ناقابل بیان سی ٹیس ابھری جسے میں سہہ گیا۔ اس وقت میری کوئی بھی لغزش مجھے براہ راست موت کے دہانے پر دھکیل سکتی تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ جب تک میری قوت برداشت جواب نہیں دے جائے گی' میں ہوش میں نہیں آؤں گا۔ ان کے سامنے بے ہوشی کی اداکاری کرکے میں کسی نہ کسی حد تک ان کے مذموم مقاصد سے آگاہی حاصل کرسکتا تھا۔

ان دونوں کی گفتگو بہت عامیانہ تھی۔ را کے تجربے کار

Downloaded from https://paksociety.com

ایجنٹ یا انڈین قونصل خانے کے ملازم آپس میں اس قسم کی گفتگو نہیں کرسکتے تھے۔ میرے ذہن میں یہ خیال تقویت پکڑ رہا تھا کہ وہ دونوں کرائے کے بدمعاش تھے جن کو میجر بخشی کے کسی ساتھی نے معاوضے پر حاصل کیا ہوا تھا۔ میں نے تھپڑ کھانے کے دوران میں پپوٹوں کو مزید کھول کر یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ دونوں خالی ہاتھ تھے البتہ سینئر بدمعاش کی جیب سے نکلا ہوا پستول کا دستہ صاف نظر آرہا تھا۔

تصادم کے آخری اور مقابلے کے ابتدائی لمحات میں' میں نے ان دونوں کے جو حلیے اور خدوخال دیکھے تھے' وہ میرے خیال سے مطابقت رکھتے تھے۔ وہ دونوں ملک الموت بن کر میرے سر پر سوار تھے۔ ان کڑے لمحات میں مجھے کام کی ہر بات دھیرے دھیرے یاد آتی جارہی تھی۔

"استاد! یہ تم نے کیا بات کہہ دی!" میرے بالوں کو نجات ملنے کے بعد دوسرے کی احتجاجی آواز ابھری" اس وقت تو یہ دھوکے سے میرے اوپر آپڑا تھا۔ اسے ہوش میں آجانے دو پھر دیکھنا کہ میں اسے کیسا مزہ چکھاتا ہوں۔"

"اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے" استاد نے جواب دیا "ہم اندھا دھند دوڑ لگا کر شہر سے اتنی دور نکل آئے ہیں کہ یہاں سالا موبائل فون بھی کام نہیں کررہا۔ واپسی میں زیادہ دیر ہونے سے ماسٹر خفا ہوگیا تو آئندہ کے لیے لائن خراب ہوجائے گی۔"

"تم اس سے بہت ڈرتے ہو۔ شاید اس لیے کہ تم اسے نہیں جانتے۔ وہ تمہیں جانتا ہے۔"

"ارجن! زیادہ بکواس نہ کرو۔ ماسٹر زبان درازی کرنے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا" استاد غرایا۔

ارجن ہنسا پھر بولا "اس ویرانے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ موبائل بند پڑا ہے پھر بھی تم بات کرنے سے ڈرتے ہو۔"

"میں تمہاری یہ باتیں سننے کے لیے یہاں نہیں آیا" استاد کی غراہٹ تیز ہوگئی "میں نے تم سے کہا ہے کہ قیدی کو ہوش میں لاؤ جب تک ہم اس کی زبان نہیں کھلواتے ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔"

"صورت سے یہ ضدی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ ذرا دو چار ہاتھ تم بھی جمادو۔ شاید یہ ہوش میں آجائے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ روی کو مارنے کے بعد تم نے زیادہ چڑھالی تھی جو اب تک بہک رہے ہو" اس بار استاد کی آواز زہریلی تھی۔

ارجن کی ہرزہ سرائی پر استاد کو شاید تاؤ آگیا تھا۔ میں نے پپوٹوں کی باریک سی جھری سے دیکھا کہ وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ دو تھے اور میں اکیلا۔ میرا سر بھی دکھ رہا تھا۔ ان کا کم از کم ایک پستول میری نظروں میں آچکا تھا جب کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ان کے مقابلے پر آنے کی کوشش کرکے میں اس کھلے ویرانے میں زیادہ دیر تک ان کی گولیوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ میرے ذہن پر مایوسی غلبہ پاتی رہی پھر میرے ذہن میں اچانک ہی امید کا ایک شعلہ سا لپکا۔ میری انگلی میں وہ انگوٹھی بدستور موجود تھی جس کی مدد سے میں نے میجر بخشی کو چشم زدن میں بے ہوش کیا تھا۔ اگر میں ان کا تشدد سہتے ہوئے' ان میں سے کسی ایک کو انگوٹھی کا شکار کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ مقابلہ بڑی حد تک آسان ہوسکتا تھا۔

میں نے تاریکی میں بہت ڈرتے ڈرتے' انگوٹھے کی مدد سے انگوٹھی کو انگلی میں گھمانا شروع کیا اور استاد کے قریب آنے تک نگینے کو ہتھیلی کے رخ پر لے آیا۔ ایسی صورت میں میرے داہنے ہاتھ کی کوئی مناسب سی ضرب میرے شکار کو بے ہوش کرسکتی تھی۔

اس وقت میں اپنی مدافعت کی ایسی فکر میں مبتلا تھا کہ میں نے استاد کی زبان سے روی کو مارنے کے ذکر کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے بارے میں' میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں مکافاتِ عمل کا شکار ہوگا اور وہ اس گردش میں آچکا تھا۔

ماسٹر کون تھا؟ یہ میرے علم میں نہیں تھا مگر اس ماسٹر کے دو قاتل گرگے میرے سامنے موجود تھے۔ انہیں زیر کرکے میں زندگی حاصل کرسکتا تھا۔ ظاہری صورت یہ تھی کہ وہ مجھے بری طرح مغلوب کرچکے تھے۔

"لے بھئی مظہر خان!" استاد نے میرے قریب آکر یہ کہتے ہوئے' میرے بالوں پر ہاتھ ڈال دیا "اب دو چار ہاتھ میرے بھی کھالے!"

بالوں پر اس کی گرفت سخت اور بے رحمانہ تھی۔ اس نے بال پکڑ کر' سر کے ساتھ میرا کچھ دھڑ بھی زمین سے اوپر اٹھالیا تھا۔ میں اپنے بدن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ کر بالوں کے سہارے اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے باوجود بے ہوشی کی اداکاری کرکے میں نے اپنی اتنی قوت مجتمع کرلی تھی کہ میں بہتر لمحوں کی امید میں ایسے عذاب سہہ سکوں۔

استاد کے جسم نے جنبش کی' اس کا ہاتھ گردش میں آیا

Downloaded from https://paksociety.com

اور اس بار واقعی ایسا زناٹے دار تھپڑ پڑا کہ میں اپنی بے ساختہ چیخ پر قابو نہ پاسکا۔ چیخ کے ساتھ میں نے استاد کی ران پر داہنا تھپڑ مارا پھر اسی ہاتھ کو اٹھاتے ہوئے استاد کی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میرے بالوں پر استاد کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ میں ایک جھٹکے سے اپنے بال آزاد کرا کے اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

استاد کے ایک طمانچے نے میری کھوپڑی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سر کے زخمی حصے میں درد کی ٹیسوں نے سر ابھارا۔ استاد اپنے قدموں پر کھڑا ڈگمگا رہا تھا اور کسی بھی لمحے زمین پر گر کر خاک چاٹ سکتا تھا پھر بھی میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ میں اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے استاد کے بھرے ہوئے پستول کی نال سیدھی کی اور ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ فائر کردیا۔

اندھیرے میں تیرتا ہوا بارودی شعلہ استاد کے پیٹ میں معدوم ہوگیا۔ وہ مجھ سے دو تین قدم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ گولی اس کی پشت کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور وہ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر' کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے ڈھیر ہوگیا۔

"خبردار! دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو" میں نے ارجن کے قدموں میں فائر کرکے تیز ہذیانی انداز میں حکم دیا "ورنہ میں بھون ڈالوں گا۔"

ارجن ایک چیخ مار کر فضا میں اچھلا' اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ' دوسرے ہاتھ کے ساتھ سر سے بھی اوپر اٹھتا چلا گیا۔

حالات کی اچانک تبدیلی پر ارجن بھونچکا رہ گیا تھا۔ گردوپیش میں اندھیرے کا راج ہونے کی وجہ سے اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا کہ استاد کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کیوں خاموشی سے ڈھیر ہوگیا تھا۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا "پستول کی نال نیچے کرلو۔ تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ خود بہ خود گولی نہ چل جائے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہاری اجازت کے بغیر اپنے ہاتھ نیچے نہیں گراؤں گا" استاد کی مکمل خاموشی نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔

"جو کچھ میں پوچھوں' رکے بغیر بتاتے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں جہنم واصل کردوں گا" میں ان دونوں کے ہاتھوں اٹھائی ہوئی تذلیل اور ہزیمت پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور وہی آگ میری آواز سے برس رہی تھی "ماسٹر کون ہے؟"

"ہا...ہا... ہمیں نہیں معلوم" استاد کے انجام سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ہکلاتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا "ہمارا اور اس کا رابطہ صرف موبائل فون پر ہوتا ہے۔ وہ کام بتاتا اور رقم کسی نہ کسی طرح ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم کام پورا کرکے اسے فون کردیتے ہیں۔ درمیان میں وہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو خود ہمیں فون کرتا رہتا ہے۔ ہمیں بلاوجہ اسے فون کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"روی کا کیا قصہ ہے۔ تم نے اسے کیوں اور کیسے مارا؟" میں نے قہر بار لہجے میں پوچھا۔

"ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی" میرے اس براہِ راست سوال پر وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا "آج تین بجے ماسٹر نے استاد کو فون کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ روی کلفٹن کے ایک اسپتال میں چھپا ہوا ہے اسے وہاں سے نکل کر مارنا ہے۔ ہم دونوں وہاں گئے۔ استاد نے اسے اسپتال سے چھٹی دلا کر میرے حوالے کیا اور میں نے اسے مار کر لاش پرانا گولیمار کے ایک میدان میں پھینک دی۔"

"تفصیل بتاؤ" میں نے ڈپٹ کر کہا "رقم کتنی ملی؟ اسے اسپتال سے کیسے نکالا' اسے تم نے کیوں مارا؟ تمہارا استاد کیا کررہا تھا؟"

"میں سب بتاتا ہوں' سب کچھ بتادوں گا۔ وہ قتل کرانے کے پورے ایک لاکھ دیتا ہے۔ آج کے دونوں کاموں کے لیے دو پیٹی مال چار بجے استاد کے ہوٹل پر پہنچ گیا۔ آج رقم کا گندا اور میلا لفافہ ایک فقیر نے استاد کو دیا تھا۔ ماسٹر نے استاد کو بتادیا تھا کہ روی ڈرا سہما ہوا ہے۔ وہ مظہر خان کے سوا کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے گا۔ استاد نے اسپتال پہنچ کر اس سے کہا اسے مظہر نے اس پیغام کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسپتال میں روی کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر استاد کے ساتھ چل دے۔ روی اس چال میں آگیا۔ اس نے کسی کا فون نمبر ملانے کی کئی کوششیں کیں مگر کامیاب نہیں ہوا۔ پھر اس نے اسپتال سے چھٹی لے لی میں استاد کا ڈرائیور بنا ہوا تھا۔ استاد نے گاڑی چلنے کے بعد روی کو کلورو فام سنگھا کر زبردستی بے ہوش کیا اور اسے میرے حوالے کرکے گاڑی سے اتر گیا۔ اسے اسپتال واپس پہنچ کر اس آدمی کا انتظار کرنا تھا جو روی کی تلاش میں اسپتال آتا۔

"ماسٹر نے اسے بتادیا تھا کہ اسے مظہر کی تلاش ہے۔ وہ ہاتھ لگ گیا تو پیٹی کے علاوہ انعام بھی ملے گا۔ میں نے روی کو ایک خالی اور سنسان میدان میں گرا کر اس کے دل میں خنجر اتار دیا اور اسپتال لوٹ آیا۔ استاد نے روی کو وہاں سے نکالا

Downloaded from https://paksociety.com

تھا۔ وہ پہچانے جانے کے ڈر سے باہر منڈلا رہا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ اندھیرا ہونے کے بعد ماروتی گھبرائی ہوئی اسپتال آئی۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اس کے آس پاس منڈلا تا رہا وہ پریشان تھی اور رو رہی تھی۔ اس نے شاید تمہیں فون کیا۔ جب تم آئے تو وہ تمہیں مظہر کہہ کر تم سے لپٹ گئی۔ میں نے یہ خبر فوراً استاد کو پہنچادی وہ خوش ہوگیا کہ وہ انعام کا حق دار بن جائے گا۔ ہم تمہاری گھات میں لگے رہے۔ تم اسپتال سے نکلے تو ہم نے تمہارا پیچھا کرنا شروع کردیا اور اب ہم آمنے سامنے ہیں۔"

یہ بات ہر شک و شبے سے بالا ہوچکی تھی کہ پراسرار ماسٹر، میجر بخشی کا کوئی قریبی معتمد یا ساتھی ہوسکتا تھا۔ شیام کے ذریعے یہ راز بخشی تک پہنچا تھا کہ مظہر، اظہر اور روی کے درمیان گہرے قریبی روابط ہیں اور وہی اس نکتے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

"ایک لاکھ روپے فی قتل کا مطلب ہے کہ تم پہلے بھی ماسٹر کے لیے خوں ریزیاں کرتے رہے ہو۔"

"ہاں" اس کے حلق سے بہ مشکل پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی" ہم دونوں دہرے قتل کے ایک مقدمے میں ماتحت عدالت سے بری ہوکر چار سال بعد جیل سے باہر آئے تھے۔ ماسٹر کے پاس کچھ ایسے ثبوت تھے جو پولیس کو مل جاتے تو بڑی عدالت سے ہمیں پھانسی کی سزا ہوسکتی تھی۔ یہ دھمکی دے کر ماسٹر نے ہم سے اپنا پہلا کام کروایا۔ اس کے بعد ہم اس دلدل میں پھنستے چلے گئے۔"

"تم نے آج تک یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ماسٹر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے پہلے دن ہی دھمکی دی تھی کہ ہم نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی تو وہ ہماری زندگیوں کے چراغ گل کردے گا۔ ہمارے ہاتھ صاف نہیں تھے۔ وہ ہمیں چھوٹے موٹے کام بھی دیتا رہتا تھا جن سے دن اچھے گزر رہے تھے۔ ہم نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ میں نے استاد کو کئی مرتبہ چھیڑا مگر وہ ایسی باتیں کرنے سے بھی ڈرتا تھا۔ ہم آج بھی ماسٹر کے غلام بنے ہوئے ہیں۔"

"میرے لیے تمہیں ایک پیٹی یعنی ایک لاکھ روپے مل چکے تھے پھر تم مجھے اپنے ساتھ کیوں لیے پھر رہے ہو؟"

"تم سے تمہاری اصلیت اگلوانی تھی۔ تمہارے ساتھیوں کے نام اور پتے حاصل کرنے تھے۔ ماسٹر نے استاد کو تاکید کی تھی کہ مظہر ہاتھ آجائے تو یہ کام پورا ہونے تک اسے زندہ رکھا جائے۔ شاید اسی اضافی کام کے لیے اس نے انعام کا وعدہ کیا تھا۔"

"تمہارے استاد کا اصل نام کیا ہے؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

"جیکب گینڈا" اس نے بتایا "یہ نام پرانا ہوگیا۔ اب سب اسے استاد کے نام سے جانتے ہیں۔"

"ماسٹر نے جیکب کو میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتایا ہوگا" اس سے باز پرس کرتے کرتے میرا غصہ خاصا دھیما ہوچکا تھا۔

"بس یہ بتایا تھا کہ تم بہت خطرناک اور خونی آدمی ہو... استاد کو کیا ہوا ہے؟" میری بات کا جواب دیتے ہوئے اسے اچانک اپنے سینئر ساتھی کا خیال آگیا "اسے اٹھالو۔ وہ ماسٹر کے بارے میں تمہیں بہت کچھ بتاسکے گا۔ ماسٹر سے وہی بات کرتا تھا۔ کام کی باتیں مجھے بتاتا تھا اور باقی اپنے سینے میں محفوظ رکھتا تھا۔"

"استاد جیکب کبھی نہ اٹھنے کے لیے سویا ہوا ہے۔ اسے بھول جاؤ اور تم سے جو پوچھا جارہا ہے" اس کا جواب دو..."

"اوہ! تو تم نے استاد کو ماردیا" میرے انکشاف نے اسے ڈرا دیا "ماسٹر نے یہی کہا تھا کہ تم بہت خطرناک ہو۔"

"تمہارے ماسٹر کی ایسی کی تیسی!" میں نے جھلا کر اسے جھڑک دیا "میں خطرناک اور خونی تھا۔ اس لیے وہ مجھے مروانا چاہتا تھا۔ روی کو مروانے کے لیے اس خبیث نے کیا عذر پیش کیا تھا۔"

"اسے کبھی بھی کوئی عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے لیے یہ کافی ہوتا تھا کہ وہ کسی کو مروانا چاہتا ہے اور ہم اس کے لیے وہ کام پورا کرنے کے پابند ہوجاتے تھے۔ تمہارے بارے میں اس نے نہ جانے کیوں دو تین باتیں بتادی تھیں۔"

"تمہیں بالکل نہیں معلوم کہ ماسٹر کہاں مل سکتا ہے؟" میں نے کھڑے کھڑے اپنا وزن ایک ٹانگ پر منتقل کرکے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے سرہلادیا "اس بارے میں استاد کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ تم نے اسے مار کر ظلم کیا ہے۔"

"شٹ اپ!" میں نے بڑھ کر پستول کی نال اس کے حلق پر ٹکادی "قاتلوں اور مجرموں کی زبان سے ظلم کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ تم دونوں کو ہر قتل کے بدلے میں کئی کئی بار مارا جانا چاہیے لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"ہم نے اپنی مرضی سے خون نہیں کیے" وہ جنبش کیے

Downloaded from https://paksociety.com

بغیر بولا "ماسٹر نے دھونس اور لالچ سے ہمیں مجبور کیا تھا۔"

"اب جھوٹ مت بولو۔ اس سے ملنے سے پہلے تمہارے ہاتھ دو انسانوں کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ماسٹر کا فون نمبر بتاؤ؟" وہ حلق پر ٹکی ہوئی پستول کی نال سے بہت زیادہ خوف زدہ تھا۔ میں نے نال الگ ہٹائی۔

"ماسٹر کا فون نمبر استاد کو معلوم تھا" ارجن کے انکشاف نے میرے بدن میں سنسنی کی سی لہر دوڑا دی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس سے استاد ہی بات کرتا تھا' میری کبھی بات نہیں ہوئی۔ اس کا فون نمبر استاد کو معلوم تھا۔"

"اور اسے میں نے مار دیا ہے! تم یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" میں نے اس کی ادھوری بات منہ سے پوری کردی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا" اس نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی "تم استاد کے موبائل فون کی میموری پر تلاش کرو تو تمہیں ماسٹر کا فون نمبر مل جائے گا۔ مجھے یہ علم نہیں ہے کہ اس کا فون نمبر کیسے پہچانا جائے گا۔"

میں بے ہوشی کی اداکاری کرتے ہوئے' جیکب کی زبان سے یہ بات سن چکا تھا کہ وہ لوگ کراچی سے اتنا دور نکل آئے تھے کہ ان کے موبائل فون نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی میں ارجن کے مقدر کا فیصلہ کرنے سے پہلے موبائل پر ماسٹر کا فون نمبر تلاش کرنے کی ایک کوشش کر سکتا تھا۔

ارجن کو اپنے پستول کی زد میں لیے' میں پیچھے سرکنے لگا۔ اس دوران میں' میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں کی سبز گاڑی اسی ویرانے میں موجود تھی۔ اپنا کام مکمل کرلینے کے بعد مجھے واپسی کی کوئی فکر نہیں رہی تھی۔

میں استاد جیکب کی لاش کے قریب پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ تاریکی کی وجہ سے اس کی جیب سے موبائل نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ میں اس کی جیبیں ٹٹولنے کی کوشش کرتا تو کسی بھی لمحے ارجن کی طرف سے دھیان ہٹ سکتا تھا۔ بازی پلٹ جانے کے بعد میرے بجائے ارجن موت کے خوف میں مبتلا تھا۔ مجھے اپنی طرف سے غافل پاکر وہ میرے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔

میں جیکب کے نیچے چھپا ہوا اس کا چرمی ہولسٹر دیکھ چکا تھا۔ اپنا کام کرنے سے پہلے یہ یقین حاصل کرنا ضروری تھا کہ ارجن پوری طرح غیر مسلح تھا۔ ایسی حالت میں وہ میرے خلاف کوئی بھی کارروائی کرتا تو میں بے خوف ہوکر اس کا مقابلہ کرسکتا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ گھر سے نکلے ہوئے مجھے بہت دیر ہوچکی تھی۔ میری واپسی میں تاخیر ہونے پر میرے ساتھی تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہوگئے ہوں گے مگر میں مجبور تھا۔ اپنے تحفظ کا پورا یقین کیے بغیر میں کسی عاجلانہ کارروائی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں ارجن پر پستول تانے دوبارہ اس کی طرف بڑھا۔ مجھے اپنی طرف لوٹتا دیکھ کر وہ چیخنے لگا "فون میرے پاس نہیں' استاد کے قبضے میں رہتا ہے..."

"آوارہ سانڈ کی طرح چیخنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے درشت لہجے میں کہا "مجھے سکون اور خاموشی سے اپنا کام پورا کرنے دو۔"

قریب جاکر میں نے سب سے پہلے اس کے ہولسٹر سے پستول نکالا جس میں پورا میگزین لوڈ تھا۔ پھر میں نے تیزی سے اس کی دوسری جیبیں بھی ٹٹول ڈالیں۔ مجھے کھٹکے سے کھلنے والے ایک تیز دھار چاقو کے سوا مزید کوئی ایسی چیز نہیں مل سکی جو میرے لیے خطرناک ہوتی۔

اس کی طرف سے اپنا اطمینان کرلینے کے بعد میں دوبارہ استاد جیکب کی لاش کے پاس پہنچ گیا۔ اندھیرے میں ٹٹولنے سے اندازہ ہوا کہ موبائل فون اس کی چست پتلون کی داہنی جیب میں پھنسا ہوا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر ٹک کر جیکب کی جیب سے موبائل فون نکال رہا تھا کہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ارجن نے میری توجہ دوسری طرف مبذول پاکر بہت پھرتی سے جگہ چھوڑی اور پلک جھپکتے میں میرے اوپر آپڑا۔

اس کا حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں لیکن ناگہانی ضرور تھا۔ وہ میرے اوپر بس ایک لمحے کے لیے رکا۔ میں نے اپنے دھڑ کو ایک جھٹکا دے کر اسے دوسری طرف الٹ دیا۔ اس کوشش میں پستول میرے ہاتھ سے نکل کر جیکب کی لاش پر گر گیا۔

ارجن زمین چاٹ کر فوراً ہی میری طرف پلٹ پڑا۔ میں سرعت سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ اس کا صرف ایک گھونسا میرے شانے پر پڑا۔ میں نے پوری بے رحمی سے اس کے دونوں جبڑے سہلا دیے۔ وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں نہیں تھا' میرے مقابلے پر تم گیا۔

وہ کھلا میدان تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ وہ میری بے ہوشی سے پہلے بھی میرے ہاتھوں سے پٹ چکا تھا مگر اس بار اس کے جسم میں نئی توانائی عود کر آئی تھی۔ ہم کبھی ایک دوسرے پر گتھم گتھا لیتے برساتے اور کبھی آپس میں لپٹ پڑتے۔ وہ مجھے تو کوئی قابل ذکر نقصان پہنچانے میں

Downloaded from https://paksociety.com

کامیاب نہیں ہوا مگر اس کا زخمی چہرہ بری طرح بگڑ چکا تھا۔ پھر بھی اس پر تھکن کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بس اس نے ہانپنا شروع کردیا تھا۔ میرے تنفس کی رفتار بھی اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔

لڑتے لڑتے مجھے خیال آیا کہ اس کے ساتھ مکے بازی کا مقابلہ کرکے میں اپنا وقت برباد کررہا تھا۔ میرے لیے اس کی کوئی افادیت نہیں تھی۔ مجھے ہر قیمت پر اسے ختم کرنا تھا۔ اس کام میں اول خان سے لی ہوئی انگوٹھی میری بہترین مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے مقابلے میں کوئی سستی دکھائے بغیر' انگوٹھی کو ٹٹولا۔ انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی کا خطرناک نگینہ اسی رخ پر تھا جدھر میں نے اسے گھمایا تھا۔

میں نے بس ذرا سی دیر انتظار کیا اور جوں ہی ارجن کا چہرہ میری زد میں آیا۔ میں نے مکے کے بجائے' داہنے ہاتھ کا تھپڑ اس کے رخسار پر رسید کردیا۔ اس کے فضا میں اٹھے ہوئے ہاتھ سلوموشن کے انداز میں میری طرف بڑھتے رہے مگر میرے جسم تک پہنچنے سے پہلے بازوؤں پر جھول گئے۔ اس کا جسم حملہ آور ہونے کے انداز میں آگے کی سمت میں جھکا ہوا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے تیورایا اور پھر منہ کے بل زمین پر گر گیا۔

میں اس کی طرف سے بے فکر ہوکر جیکب کی لاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مجھے اس کی جیبوں میں پائی جانے والی دیگر اشیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی پتلون کی جیب سے موبائل فون نکال کر میں نے اس ویرانے کے منظر کا الوداعی جائزہ لیا اور اس بار ارجن کے چھوٹے بور کے پستول سے اس کی کھوپڑی پر فائر کردیا۔ وہ گہری بے ہوشی کے عالم میں تھا مگر سر میں گولی پیوست ہوتے ہی اس کے جسم کو آخری زبردست جھٹکا لگا اور زندگی سے اس کا ہر رشتہ ٹوٹ گیا۔

اس تصادم کی وجہ سے مجھے اپنے پستول سے ہاتھ دھونے پڑے تھے مگر اس کے بدلے میں دو عدد پستول میرے ہاتھ آچکے تھے۔ مجھے امید تھی کہ میری گاڑی کافشن کے علاقے سے ہی بازیاب ہوجائے گی مگر اس میں موجود پستول کے ملنے کی توقع نہیں تھی۔

سبز کار کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ سوئچ آن کرکے میں نے پارکنگ لائٹس جلائیں' ڈیش بورڈ پر روشن ہونے والے میٹروں کا جائزہ لیا۔ کار کی ہر چیز اطمینان بخش تھی۔ ٹنکی میں نصف سے زیادہ پیٹرول موجود تھا۔ میں نے کیبن لائٹ جلا کر اپنے لباس کا جائزہ لیا پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس رات حاصل ہونے والی فتح مجھے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ میرا لباس گرد آلود ہورہا تھا۔ دشمنوں کے تھپڑوں کی برسات کی وجہ سے میرے دونوں رخسار متورم تھے۔ چہرے پر کئی خون آلود خراشیں اور نیل بھی نظر آرہے تھے۔

اس حلیے میں کوئی بھی مجھے مشتبہ سمجھ کر روک سکتا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر اپنے کپڑوں سے خشک گرد جھاڑی' داغ دھبے دور کیے اور چہرے کو تھرماس کے ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح صاف کرنے کے بعد وہاں سے چل دیا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ کے خانے میں وائٹ ہارس اسکاچ کے دو پائنٹ موجود تھے۔ ان میں ایک ان دونوں کے زیر استعمال رہا ہوگا۔ دوسرا ادھا سربہ مہر تھا۔ میں نے راستے میں وہ دونوں بوتلیں باہر میدان میں پھینک دیں۔

ہوا کے دوش پر وزنی گاڑیوں کے انجن کی ڈوبتی ابھرتی آوازوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ میں کسی شاہراہ کے قریب موجود تھا اور ان آوازوں کی مدد سے کچے ویرانے سے نکل سکتا تھا لیکن ہر طرف پھیلے ہوئے گھور اندھیرے اور ماحول کی لامتناہی یکسانیت کی وجہ سے میں نے وہ خطرہ مول لینے سے گریز کیا۔ سبز کار کو واپس گھما کر ٹائروں کے ان نشانات پر ڈال دیا جو سڑک سے وہاں تک پہنچنے کے نتیجے میں وجود میں آئے تھے۔

○☆○

ان لوگوں نے اپنے حساب سے بس اتنا انتظار کیا تھا جتنا ضروری تھا۔ پھر ان میں اضطراب پھیلنا شروع ہوگیا۔ ویرا پہلے دن سے ہی ماروتی کو ناپسند کرتی تھی اس لیے وہ میرے بارے میں زیادہ فکرمندی جتا رہی تھی۔ اس کا سیدھا سا نظریہ تھا کہ اگر کوئی دھوکے سے روی موہن کو اسپتال سے نکال لے گیا ہے تو اسے آسانی کے ساتھ روی کی واپسی پر آمادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے آدھے پون گھنٹے میں ماروتی کو تسلی تشفی دے کر واپس چل دینا چاہیے تھا۔

جب اس کے اندازوں کے مطابق میری واپسی نہیں ہوئی تو اس نے اسپتال فون کرکے خالص امریکی لہجے اور انگریزی میں روی کے بارے میں سوال کرنے شروع کیے۔ اس کا حربہ کامیاب رہا۔ اس کے مخاطب نے مرعوب ہوکر اسے ضرورت سے زیادہ وقت دیا اور آخر کار ویرا کی اس خاتون سے بات ہوگئی جو اسپتال میں مجھ سے ٹکرائی تھی۔ وہاں سے میری اور ماروتی کی واپسی کی اطلاع نے اس کی تشویش میں اضافہ کردیا۔

ایک گھنٹے بعد میرے لیے ماروتی کا فون آیا تو ان کی

Downloaded from https://paksociety.com

پریشانی مزید بڑھ گئی۔ روی کے بارے میں کوئی خیر خبر لینے کے لیے ماروتی کو میری تلاش تھی۔ ان حالات میں ہر ایک کا فکر مند ہونا فطری تھا۔ اسپتال سے ہم ایک ساتھ روانہ ہوئے' ماروتی اپنے گھر میں موجود تھی تو پھر میں کہاں تھا۔

وہ تینوں اپنے طور پر میری تلاش کی کوئی مہم شروع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کسی پیش رفت کا آسان ترین ذریعہ اول خان بن سکتا تھا۔ غزالہ نے اس سے بات کی اور وہ فوراً ہی ہمارے گھر دوڑا چلا آیا۔ اس نے دوسرے ذرائع آزمانے کے ساتھ کلفٹن کے متعلقہ تھانے کو بھی براہِ راست اعتماد میں لے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دیر بعد میری گاڑی کا سراغ مل گیا۔ وہاں پتی زمین پر پائے جانے والے ٹائروں کے بے ترتیب نشانات اور ابتری کی دوسری علامات سے یہ معلوم ہوگیا کہ وہاں کوئی سنگین گڑبڑ ہوئی تھی لیکن اس کا کوئی گواہ تھا نہ مزید سراغ!

ماروتی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتے جاتے' میں نے اپنے ساتھیوں کو کسی اچانک حملے وغیرہ سے ہوشیار رہنے کی جو ہدایات کی تھی' اس نے انہیں اعصابی تناؤ میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں رہ کر خود کو غیر محفوظ محسوس کررہے تھے اور میں باہر جاکر کسی نامعلوم خطرے سے دوچار ہوچکا تھا۔ میں کافی تاخیر سے گھر واپس پہنچا تو وہاں شدید افراتفری اور ہراس کی فضا پائی جارہی تھی۔

میں نے واپسی سے پہلے اپنا حلیہ بڑی حد تک درست کرلیا تھا لیکن میری ہیت کذائی دیکھ کر سب کو اندازہ ہوگیا کہ میں خاصے ناخوش گوار حالات سے گزرنے کے بعد گھر واپس پہنچ سکا تھا۔ میں ان کے مسرت آمیز ردِعمل' ہمدردانہ نگاہوں اور تیر زدہ فقروں کو نظرانداز کرتا ہوا سیدھا اپنے کمرے کی طرف گیا تو کسی نے مجھے روکنے یا میرا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غزالہ قدرے توقف کے بعد کمرے میں آئی تو میں نہانے کی تیاری میں مصروف ہوچکا تھا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں؟ باہر سے کیا حلیہ بناکر واپس آئے ہیں۔" باتھ روم کے بند دروازے کے پیچھے سے غزالہ کی سرگوشیانہ آواز ابھری۔

"صرف چہرہ بگڑا ہے۔ میں ہر ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہوں۔" میں نے اسے دلاسا دیا "مجھے آرام سے نہانے دو۔ باہر آکر سب کچھ بتادوں گا۔"

اس مکالمے کے بعد غزالہ نے بھی دخل اندازی نہیں کی اور میں گرم پانی کی تیز دھاروں میں دیر تک اطمینان سے نہاتا رہا۔ گرم پانی کے فرحت انگیز لمس سے مجھے اپنی چوٹوں کے درد میں حیرت ناک کمی محسوس ہورہی تھی۔ سر کے پھولے ہوئے عقبی حصے کے درد میں بھی وقت کے ساتھ کمی آرہی تھی۔

تازہ دم ہوکر میں نے لباس تبدیل کیا اور ان کی محفل میں شامل ہوگیا۔ میرے واپس پہنچتے ہی ان کی قیاس آرائیوں کا سلسلہ رک گیا "تمہاری کار کلفٹن سے لاوارث کھڑی ہوئی ملی ہے۔ یہ سبز کار تمہیں کہاں سے مل گئی۔" سلطان شاہ نے پوچھا۔

"اچھا ہوا کہ تم نے یاد دلا دیا۔ اس کار کو جلد از جلد یہاں سے ہٹا کر کہیں چھوڑ دو۔ یہ گاڑی روی کے قتل میں ملوث رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"روی کو مار دیا گیا؟" میرے انکشاف نے ان سب کو حیران کردیا۔

"ہاں۔" میں نے سگریٹ سلگا کر سنجیدگی سے جواب دیا "شیام کی زبانی' روی کے جو اعترافات میجر بخشی تک پہنچے تھے' ان کے بعد یہ ہونا ہی تھا۔"

"مگر بخشی کو تو وقت ہی نہیں ملا۔ صبح سویرے اس نے تم سے فون پر بات کی' دن چڑھے اسے یاد ماضی سے نجات دلا دی گئی۔" اول خان نے حیرت سے کہا "روی کے ساتھ جو کچھ ہوا' آج دوپہر بلکہ سہ پہر کے بعد ہوا ہوگا۔"

"یہ ہماری خام خیالی ہے۔" میں نے اس کی تصحیح کی "بخشی ہمارے چنگل میں آنے سے پہلے کسی اور کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے' وہ اسی نامعلوم شخص کی کارستانی ہے۔ اس کا نام پردے میں ہے۔"

"ٹھہرو! میں سبز کار کا بندوبست کرکے ابھی آتا ہوں۔ اس کا یہاں سے ہٹایا جانا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر اول خان نے فوری طور پر ڈرائنگ روم چھوڑ دیا۔ شاید وہ اپنے کسی آدمی کو اس کام پر مامور کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"تمہارا چہرہ بہت بگڑا ہوا ہے۔" ویرا نے آزردہ آواز میں مجھ سے پوچھا "معلوم ہوا ہے آج تم اپنے دشمنوں سے بہت زیادہ پٹے ہو۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ موت کان پر سے گزری ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا "آج میں نے زندگی کی قیمت پر دانستہ یہ مار کھائی ہے۔ اس کے ازالے کے لیے ان دونوں کو آخرکار اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔"

میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں وہ ابتدائی اطلاع ان کے لیے حوصلہ افزا تھی۔

اول خان کی واپسی تک میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

Downloaded from https://paksociety.com

وہ اپنے ایک چوکی دار کو سبز گاڑی سے گلوخلاصی کی ذمّے داری سونپ کر آیا تو میں نے ان کے سوالات سے بچنے کے لیے اپنی کہانی چھیڑ دی۔

"تم نے ماروتی کے فون پر اسپتال جاکر بہت بڑی غلطی کی۔" اول خان نے متاسفانہ انداز میں زور زور سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا "روی کے ساتھ گزبڑ ہونے کے بعد معاملہ وہیں ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ تمہیں پہلے ہی اس خطرے کا ادارک کرلینا چاہیے تھا۔"

"بلائے بود دلے بخیر گزشت!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جو ہونا تھا' ہوگیا میں وہاں نہ جاتا تو گاڑی ایک جگہ رک گئی تھی۔ ارجن اور جیکب کا صفایا ہوجانے کے بعد اب ماسٹر کا نام ہمارے سامنے ہے۔"

"تم یہاں کے معاملات سے بالکل الگ رہو گے۔" اول خان نے اپنا فیصلہ سنادیا "کل تم تینوں کے پاسپورٹ تیار ہوجائیں گے' پرسوں تم تینوں لاہور کے لیے روانہ ہوجاؤ۔ یہاں کے معاملات میں خود دیکھتا رہوں گا۔"

"سوجے ہوئے جبڑوں کے ساتھ پرسوں میری روانگی ناممکن ہے۔" میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ورم اور زخموں کی وجہ سے میں آئینے میں خطرناک بدمعاش معلوم ہورہا ہوں۔ بھارت میں ہر متجسس نگاہ میرے چہرے پر مرکوز رہے گی۔"

"معلوم نہیں ہورہے بلکہ تم واقعی بدمعاش ہو۔" ویرا نے مسکرا کر مذاق میں کہا "تمہاری مکاریوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ جب وہ تمہیں تھپڑ مار رہے تھے تو سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے کہ تم انگڑائی لے کر اچانک آنکھیں کھولو گے اور انہیں پیس ڈالو گے۔"

"میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو' بات مذاق میں مت ٹالو۔" اول خان نے تادیب کی "تمہاری بات سے مجھے اتفاق ہے کہ ورم اور زخم مندمل ہونے تک تمہیں سفر ملتوی کردینا چاہیے لیکن تم اس دوران میں صرف آرام کرو گے دوسری سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہو گے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ یہ مشورہ تم دے رہے ہو۔ بے کار رہنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔"

کوئی بات یاد آنے پر اول خان ہنس پڑا پھر بتانے لگا "ایس ٹی ایف میں' میں نے ایک مرتبہ سزا کا یہ طریقہ رائج کیا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ حد سے زیادہ مستعد ہوگیا تھا جو کوئی غلطی کرتا' اسے چند روز کے لیے کام سے ہٹا کر ایک طرف بٹھادیا جاتا۔ سزا پانے والے دو دن میں اپنی زندگی سے بیزار ہوجاتے تھے۔ بعد میں سینئر اسٹاف کی مشترکہ سفارش پر اس سزا کو موقوف کرنا پڑا۔"

"اب تم اپنی موقوف کی ہوئی وہی سزا مجھے سنا رہے ہو۔ کیا میں تمہیں اتنا کاہل اور بے فیض نظر آتا ہوں؟"

اول خان میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر خوش دلی سے ہنس پڑا "تم کو اپنی سرگرمیاں محدود کردینی چاہئیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ ہم نے شیام کو مسکین اور بے ضرر سمجھ کر نظرانداز کردیا تھا مگر اس کی مخبری کی بنا پر بات کہاں تک بڑھ چکی ہے۔ تمہارے آج کے مسائل کی پوری ذمّے داری اسی کے سر جاتی ہے۔"

"اس کا کیا بنا؟" ویرا نے دلچسپی سے پوچھا "اسے تمہاری فورس کے عملے نے اپنی تحویل میں لیا ہوا تھا۔"

"وہ خود ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" اول خان صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بولا "اسے مفت کی روٹیاں کھلانے کے بجائے ورکشاپ میں بیگار پر لگادیا گیا تھا۔ وہاں وہ جیک پر چڑھے ہوئی ایک ٹرک کے نیچے گھس کر صفائی کررہا تھا کہ اس کا پیر لگنے سے جیک پھسل گیا اور پورے ٹرک کا وزن اس کے سینے پر آرہا۔ اس کی ساری ہڈیاں پسلیاں سرمہ ہوگئیں۔ اس نے اسی وقت دم توڑ دیا۔"

"تم نے ابھی تک اس کی موت کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔" سلطان شاہ نے شکوہ کیا۔

"وہ ایسی افسوس ناک موت تھی کہ میں نے اس کا ذکر چھیڑ کر تمہاری طبیعتیں مکدر نہیں کیں۔ اب اس کے کرتوتوں کے نتائج سامنے آرہے ہیں تو مجھے بھی اس کی موت پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ جن مجرموں کو انسان نظرانداز کردیتے ہیں' ان کو قدرت خود سزا دے دیتی ہے۔"

میں نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اول خان کی طرف بڑھادیا "یہ استاد جیکب کا موبائل ہے۔ اس کی میموری پر موجود نمبر نوٹ کرو۔ مجھے ان سب لوگوں کے نام اور پتے درکار ہیں۔ ان ہی میں سے کوئی ماسٹر ہوسکتا ہے۔"

اول خان نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اس کے ڈائل پیڈ پر مختلف بٹن دبا کر اسکرین کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس پر تو بہت سے نمبر موجود ہیں۔ اتنی بڑی فہرست کے بارے میں معلومات جمع کرنا آسان نہیں ہوگا۔"

"مجھے موبائل کے استعمال میں زیادہ مہارت نہیں ہے مگر مجھے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے۔ اس کے مطابق تم آخری مرتبہ ملایا ہوا نمبر ہر وقت دیکھ سکتے ہو۔ ذرا

Downloaded from https://paksociety.com

کوشش تو کرو۔ وہ نمبر ماسٹر کا ہی ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال درست ہے" ویرا نے میری تائید کی "موبائل پر ملایا ہوا آخری فون نمبر ہر وقت دیکھا جاسکتا ہے۔"

"یہ بھی کوئی موبائل نمبر ہی ہے" اول خان نے اسکرین پر دیکھ کر اعلان کیا۔

"ہاں! یہ موبائل نمبر ہی ہونا چاہیے۔ ماسٹر سے وہ موبائل پر رابطہ کرتے تھے" میں نے تائید کی "وہ دونوں ماسٹر کے ایما پر میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے اغوا میں کامیابی حاصل کرتے ہی ماسٹر کو خبر دی ہوگی۔ موبائل سے ڈائل کیا جانے والا آخری نمبر اسی کا ہوگا۔ آخری گفتگو کے بعد وہ کراچی سے اتنی دور نکل گئے تھے کہ ان کے فون کے سگنل کام ہی نہیں کر رہے تھے۔"

"اگر صرف ایک نمبر کا معاملہ ہے تو کام ہوجائے گا۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ فون متحرک رہتا ہے۔ اس لیے یہ پتا چلانا مشکل ہوگا کہ ایک خاص وقت پر کوئی نمبر کہاں اور کس کے استعمال میں تھا" اول خان بولا۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آسکی" میں نے الجھن آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "فون متحرک ہو تو ہوا کرے۔ یہ نمبر اور کنکشن جس کسی کے نام پر دیا گیا ہوگا۔ اس کا پورا پتا کمپنی کے ریکارڈ میں موجود ہونا چاہیے۔۔۔"

"وہ بھی مل جائے گا لیکن فون اس کے زیر استعمال نہ ہوا تو تم کیا کرو گے؟"

اس کی الجھن میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا "اگر موبائل نمبر میرا ہے تو اس کے صحیح یا غلط استعمال کی پوری ذمے داری مجھ پر ہے۔ فون غلط ہاتھوں میں چلا جاتا ہے یا چوری ہوجاتا ہے تو میرا فرض ہے کہ کمپنی کو اطلاع دے کر نمبر بند کرادوں۔ غلط استعمال جاری رہتا ہے تو اس کے نتائج کی پوری ذمے داری مجھے قبول کرنا پڑے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس نمبر کے مالک پر ہاتھ ڈالو گے" اول خان نے تائید طلب لہجے میں پوچھا۔

"بالکل!" میں نے مسکراتے ہوئے نرمی سے جواب دیا "وہ خود ماسٹر ہے یا پھر ہمیں ماسٹر کا پتا بتائے گا جو اس کا فون استعمال کر رہا ہے۔"

"اب میں اس بارے میں پورے اعتماد سے بات کرسکوں گا" اول خان یہ کہہ کر فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"اس مرتبہ قتل وخوں ریزی کا سلسلہ زیادہ ہی تیز اور دراز ہوگیا ہے" غزالہ نے تبصرہ کیا۔

"تم اس کا ذمے دار کسے قرار دیتی ہو؟" سلطان شاہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہوگیا۔

"حالات پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی رفتار سے رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی ذمے داری کسی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔"

"کرشن کمار اور ہری چند بہت مشکل سے ہاتھ آئے تھے" سلطان شاہ نے اسے یاد دلایا "ان دونوں اموات میں خاصا وقفہ بھی آیا تھا۔ اس رفتار کو تم تیز نہیں کہہ سکتیں، ہم میں سے کوئی بھی بے مقصد خوں ریزی کا شوقین نہیں ہے۔"

"کل صرف جگدیش موہن کی خودکشی کی خبر آئی تھی۔ آج مرنے والوں کی تعداد چار ہوچکی ہے" غزالہ بولی "میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ شہر والوں کے لیے ایک دن میں چار قتل خوف وہراس کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔"

"مجبوری ہے" سلطان شاہ اپنے شانے اچکا کے بے پروائی سے بولا "روی کو دشمنوں نے مارا، اس کے دو قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری ڈینی کے سر جاتی ہے۔ شیام خود اپنی غلطی کا نشانہ بنا۔ ہمارے حساب میں تو صرف دو خون ہوئے ہیں۔"

"تم لوگ بخشی کو کیوں بھول رہے ہو؟" ویرا نے ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وہ بھی آج ہی کا واقعہ ہے۔ وہ زندہ ہے تو کیا ہوا۔ اس کی حالت کسی مردے سے بھی بدتر ہے۔ آج کا کل اسکوریاٹج ہے۔"

"یہ ذکر چھیڑ کر تم کسی کو ملامت کرنا چاہ رہی ہو یا محض اپنے دکھ کا اظہار کر رہی ہو؟" میں نے ویرا سے پوچھا۔

"مجھے نہ پکڑو" ویرا دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا کے بولی "مردے شماری کی ابتدا غزالہ نے کی تھی۔"

اول خان فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جیب سے اپنا بال پین نکال لیا۔ دوسری طرف کی بات سن کر وہ سامنے پڑے ہوئے پیڈ پر کچھ لکھتا رہا پھر اس نے تشکر آمیز کلمات کے ساتھ سلسلہ منقطع کردیا۔

"فون افضل نامی کسی شخص کے نام پر ہے جو گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رہتا ہے" اول خان نے اعلان کیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلے میں کسی مسلمان مجرم کا نام بھی سننے میں آیا" ویرا بے ساختہ بول پڑی "ہندوؤں کے ساتھ استاد جیکب کا نام سن کر مجھے کوفت ہوئی تھی کہ استاد جیکب کو بھارتیوں کے لیے کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کافی دنوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شہر میں رہنے والے

Downloaded from https://paksociety.com

سارے مسلمانوں نے جرائم میں حصہ لینے سے توبہ کرلی ہو۔"

"تم ماروتی والی بات کہہ رہی ہو۔ ہم جان بوجھ کر ہندوؤں کو نہیں گھیر رہے تھے" سلطان شاہ نے جواب دیا۔

"تم کو بولنے کا پورا حق حاصل ہے کیونکہ میمن گوٹھ کے گرین فارم سے تم ہی نے کرشن کمار کو پکڑا تھا اور ابھی تک اپنی اس اکلوتی کارکردگی پر بغلیں بجا رہے ہو" ویرا نے چبھتے ہوئے، طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نام معلوم ہوگیا۔ اب میں ماسٹر کے نمبر پر فون کروں گا" میں نے اس بحث کو وہیں ختم کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اول خان کے قریب صوفے پر بیٹھ کر میں نے اپنے گھر کے فون سے وہ موبائل نمبر ملانا شروع کردیا جو ہمیں استاد جیکب کے موبائل فون کی میموری سے ملا تھا۔ میں نے وہ نمبر اسپیکر فون کے ذریعے ملایا تھا تاکہ سب لوگ گفتگو سے آگاہ ہوسکیں۔

دوسری گھنٹی بجنے پر اسپیکر فون پر ایک بھاری سی مردانہ آواز میں ہیلو کی آواز ابھری۔

مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ وہ فون نمبر اپنے اصل مالک کے استعمال میں نہیں تھا۔ میں نے کہا "مجھے افضل سے بات کرنی ہے۔"

"افضل اس وقت موجود نہیں ہے" میری توقع کے مطابق سرد مہری سے جواب دیا گیا "فون میرے استعمال میں ہے۔"

"مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔ وہ اس وقت کہاں ملے گا؟" میں نے اصرار کیا۔

"وہ فون میرے پاس چھوڑ کر کہیں گیا ہوا ہے۔ اپنا نمبر دے دو۔ وہ آئے گا تو تمہیں فون کرلے گا۔"

"میں پبلک کال آفس سے بات کررہا ہوں۔ اپنا نمبر نہیں دے سکتا" میں نے اطمینان سے جواب دیا کیونکہ اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ پر کال کرنے والے کا نمبر آنے کی سہولت کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔

"پھر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا" دوسری طرف سے خشک لہجے میں جواب دیا گیا۔

"تم کون بول رہے ہو۔ مجھے اپنا پتا بتادو" میں نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر سادگی سے کہا "میں سیدھا تمہارے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ افضل تمہارے پاس واپس آئے گا تو میں اس سے مل لوں گا۔"

"میں اس کا دوست ہوں اور اجنبیوں کا اپنے گھر آنا پسند نہیں کرتا۔ اس سے ملنا ہے تو میرے بجائے اس کے گھر جاؤ" اس منہ توڑ جواب کے ساتھ ہی اس نے اپنی طرف سے فون بند کردیا۔

"وِل ڈن!" ویرا تحسین آمیز لہجے میں بولی "تم نے بہت معقول گفتگو کی ہے۔ وہ کوئی تند خو اور کٹ کھنا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہی ماسٹر ہے۔ چاہو تو اب میں اسے فون کرکے تنگ کرسکتی ہوں۔"

میں نے اسپیکر فون بند کردیا اور کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا پیچھا کیا گیا تو وہ خطرہ بھانپ کر بھڑک جائے گا۔"

اسی وقت استاد جیکب کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سب یوں حیرت سے اس انسٹرومنٹ کو دیکھنے لگے جیسے کسی موبائل فون کی مترنم گھنٹی کی آواز زندگی میں پہلی بار سنی ہو۔ میں خود بھی اس اچانک کال پر حیران تھا۔

"گھنٹی بجنے دو" اول خان کو اپنی گود میں بجنے والے فون کی طرف متوجہ پاکر میں نے جلدی سے کہا "یہ کال سننے کی ضرورت نہیں۔ یہ کال ماسٹر کی ہوسکتی ہے۔ وہ جیکب کے بجائے کسی اور کی آواز سنے گا تو شبہے میں پڑجائے گا۔ ابھی اس کا ہوشیار ہونا مناسب نہیں ہے۔"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ یہ ماسٹر کی کال ہے" ویرا نے اعتراض کیا "جیکب گینڈے کے لیے کوئی اور بھی کام کرسکتا ہے۔"

موبائل فون کی گھنٹی مسلسل بجے جارہی تھی جس سے فون کرنے والے کی بے قراری اور بے چینی ظاہر ہورہی تھی۔ میں نے ویرا سے کہا "مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے۔ جیکب کو کوئی بھی فون کرسکتا ہے مگر غالب امکان ماسٹر کی کال کا ہے۔ فون میرے قبضے میں آئے ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا ہے۔ اس دوران میں یہ پہلی کال ہے جو ماسٹر سے میری چھیڑ چھاڑ کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس وقت ماسٹر کو جیکب اور ارجن کے مشن کی کامیابی کی آخری خبر کا بے چینی سے انتظار ہوگا۔ انہیں رپورٹ دینے میں غیر معمولی تاخیر ہوچکی ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ وہ ان سے اس تاخیر کا سبب جاننا چاہے گا۔"

کچھ بعد دیگرے دس گھنٹیاں بجنے کے بعد موبائل خاموش ہوگیا۔ ویرا کہہ رہی تھی "وہ جو کوئی بھی تھا، تھک ہار کر خاموش ہوگیا۔ اب یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ یہ کال کہاں سے آئی تھی؟"

"اس لیے اس بحث کو یہیں ختم کردو" سلطان شاہ نے بات آگے بڑھائی "افضل گلشن میں رہتا ہے۔ اس وقت ہم بھی گلشن میں ہیں۔ کیوں نہ ذرا سی زحمت کرلی جائے۔ افضل

Downloaded from https://paksociety.com

مل گیا تو ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

سلطان شاہ کی وہ تجویز بروقت اور لاجواب تھی۔ میں نے بھی ماسٹر کے موبائل فون پر کام کا آغاز اسی نظریے سے کیا تھا کہ ماسٹر کا کھوج لگانے کی ابتدا فون نمبر کے مالک سے کی جائے۔ مجھے وہ واضح فیصلہ صادر کرنے میں ذرا تاخیر ہو گئی تھی مگر سلطان شاہ سبقت لے گیا تھا۔

اس کام کے لیے اول خان میرا موزوں ترین مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔ اس کے چہرے پر پائی جانے والی پیشہ ورانہ سختی اور ہیبت سے کوئی بھی شخص آسانی سے متاثر ہو سکتا تھا۔ اقبال پر دباؤ ڈالنے کے لیے یہ تاثر بھی دیا جا سکتا تھا کہ اول خان کسی ایجنسی کا ذمے دار افسر تھا۔ یہ بات غلط بھی نہ ہوتی کیونکہ ایس ٹی ایف ریکارڈ میں کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود ایک خفیہ سرکاری ایجنسی تھی۔

سلطان شاہ معاملے کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے میرے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ غزالہ ہمیں رات کے کھانے کے لیے روکتی رہ گئی۔ مگر میرے نزدیک وہ کام زیادہ اہم تھا۔ میں اول خان کی گاڑی میں' اس کے ساتھ نکل کھڑا ہوا کیونکہ میری کار کلفٹن سے بازیابی کے باوجود ضابطے کی کچھ کارروائیوں کی وجہ سے گھر نہیں لائی جا سکی تھی۔

گلشن اقبال میں رہائش کے باوجود' پتوں کے بارے میں میری معلومات ناقص تھیں۔ کچھ یہی حال اول خان کا بھی تھا لیکن ایک اسٹیٹ ایجنسی سے معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم بیت المکرم مسجد کے عقب میں واقع پرانے فلیٹوں کے اس بلاک کے سامنے پہنچ گئے جہاں اقبال کی رہائش تھی۔ عمارت کی خستہ حالی اور دیکھ بھال سے مکینوں کی بے پروائی کی بنا پر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہاں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے وہ تنگ دست سفید پوش مقیم تھے جو اپنے بنیادی اخراجات پورے کرنے کے بعد اپنے گھروں کی اندرونی یا بیرونی تزئین و آرائش کے لیے کچھ بھی پس انداز نہیں کر پاتے۔

ہم گرد میں اَٹے ہوئے بوسیدہ زینے طے کر کے پہلی منزل پر پہنچے تو وہاں تنگ کاریڈور میں چار بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے صرف ایک پر نام کی تختی آویزاں تھی اور وہی افضل کا فلیٹ تھا۔

میں نے دروازے کی چوبی چوکھٹ میں لگا ہوا' ڈور بیل کا بٹن دبایا۔ ساخت کے اعتبار سے وہ فلیٹ تنگ اور مختصر نظر آ رہے تھے لیکن بٹن دبانے کے جواب میں مجھے گھر کے کسی حصے سے گھنٹی کی گونج نہیں سنائی دی۔ چند ثانیوں تک انتظار کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبایا۔ اس بار بھی نتیجہ تبدیل نہیں ہو سکا۔ گھنٹی بجی' نہ کسی نے دروازے پر آنے کی زحمت دی۔

"دستک ہی بہتر رہے گی" اول خان نے یہ کہہ کر دروازہ بجا ڈالا۔

وہ تدبیر بار آور ثابت ہوئی۔ اندر سے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ چوبی پٹ نے خفیف سی حرکت کی اور اس کے پیچھے سے ایک نرم اور سہمی ہوئی نسوانی آواز آئی "کون ہے؟ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔"

اس دور میں وہ بہت غیر روایتی بلکہ متروک جواب تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ شہر کے کچھ حصوں میں ایسے گھرانے بھی آباد تھے جہاں بھولی ہوئی روایات کی پاس داری کی جا رہی تھی۔ میں نے انتہائی خلیقانہ انداز میں مدعا بیان کر دیا "ہم افضل سے ملنے آئے ہیں' وہ کہاں ہے؟"

"کیا آپ ان کے کوئی دوست ہیں؟" متجسس مگر جھجکتی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔

"دوست نہیں ہیں۔ ایک بہت ضروری کام سے آئے ہیں" میرا دل کسی سختی پر مائل نہیں ہو رہا تھا۔

"پھر آپ باہر انتظار کر لیں' وہ دفتر سے واپس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ہم اسے نہیں پہچانتے" مجھ سے پہلے اول خان بول پڑا "باہر اسے کیسے پہچانیں گے؟"

"وہ ہنڈا فضٹی پر دفتر آتے جاتے ہیں۔ سیدھے اوپر چلے آئے تو میں انہیں آپ کے پاس بھیج دوں گی" اس جواب کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔ ہم نے خاتون خانہ سے مذاکرات کر لیے تھے مگر اس کی ایک جھلک بھی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ اسی گھر میں رہتا ہے تو موبائل فون اس کی بساط سے باہر ہے" میں نے زینے سے اترتے ہوئے' تفکر آمیز لہجے میں اول خان سے کہا "تنگ دستی اور قدامت پرستی میں موبائل فون کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔"

"بخشی اور ماسٹر جیسے لوگ پشت پناہی کر رہے ہوں تو سب کچھ ممکن ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ وہ ہنڈا فضٹی کا مالک ہے۔"

میں ہنس پڑا "تم اس شہر میں رہتے ہو لیکن تمہارا مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ ہنڈا فضٹی کی بہت افادیت ہے مگر وہ اب سواری کے بجائے باربرداری کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ گوالے اور چھوٹے دکاندار اس پر منوں سامان لادے پھرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی پھٹیچر سی موٹر سائیکل

Downloaded from https://paksociety.com

لے رکھی ہو۔ اس کے حالات میں مجھے بخشی کا سایہ نظر نہیں آتا۔"

"تھوڑی دیر انتظار کیے لیتے ہیں۔ ہر بات سامنے آجائے گی" وہ آخری زینہ اتر کر گاڑی کی طرف چل دیا۔

ہمیں تقریباً پندرہ منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک شور مچاتی ہوئی' سال خوردہ سی ہنڈا فضٹی نظر آئی جوان زینوں کے قریب آکر رک گئی۔ پختہ عمر سوار نے انجن بند کرنے کے بعد اسے زینے کے برابر والی خالی جگہ میں دھکیل کر مقفل کیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سنوارتا ہوا زینوں کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں ہم دونوں گاڑی سے اتر کر اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"افضل! ہم کافی دیر سے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں" میں نے اسے پکارا۔

وہ حیران و پریشان سا ہماری طرف پلٹا اور رسانیت سے بولا "تم کون ہو؟ مجھے کیسے پہچانتے ہو؟"

"اوپر بیٹھنا شاید دشوار ہو۔ یہیں ہماری گاڑی میں آجاؤ۔ ہم ایک معاملے کی تفتیش کے لیے آئے ہیں" میں نے اس کے سوالوں کو نظرانداز کر کے کہا۔ تفتیش کا لفظ نشانے پر لگا اور وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر میرے ساتھ ہولیا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' وہ میرے اشارے پر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اول خان باہر ہی کھڑا رہا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنا پہلا اور بنیادی سوال کر ڈالا "تمہارا موبائل فون کہاں ہے؟"

"میرا موبائل فون...!" اس نے حیرت اور بے یقینی سے دہرایا "میرے پاس کوئی موبائل فون نہیں ہے" اس نے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر تھوک نگلا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں میونسپلٹی میں کام کرتا ہوں۔ ایک غریب کلرک ہوں۔ گھر کا خرچ مشکل سے چلتا ہے۔ میں موبائل فون جیسا مہنگا شوق کیسے کر سکتا ہوں۔ پھر مجھے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"ہم سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔ ریکارڈ غلط نہیں ہو سکتا۔ تمہارے نام پر موبائل فون کنکشن ہے اور استعمال ہو رہا ہے۔"

"تم یقین کرو... میں قسم کھاتا ہوں کہ میرے پاس موبائل فون نہیں ہے۔"

"تمہارے مقدر کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وہ تمہارے پاس نہیں' ایک خطرناک قاتل کے پاس ہے اور تمہارے نام سے استعمال ہو رہا ہے۔"

"اوہ خدا!" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا "تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرے دفتر میں معلوم کرلو' میرے پڑوسیوں سے پوچھ لو۔ میں غریب ضرور ہوں مگر شریف اور عزت دار آدمی ہوں۔ کسی قاتل سے میرا کیا واسطہ؟ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔"

خوف سے اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا' آواز کانپ رہی تھی۔ سچائی اس کے ایک ایک لفظ سے جھلک رہی تھی۔ مجھے اس کے دعوے پر یقین آگیا۔ پھر بھی میں نے اتمام حجت کے لیے بات جاری رکھی "دیکھو' شناختی کارڈ اور فون' گیس یا بجلی کے بل کی نقل کے بغیر موبائل فون نہیں دیا جاتا۔ کوئی تمہارے نام سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے تو اسے ان چیزوں تک رسائی حاصل ہے۔ وہ تمہارا کوئی دوست بھی ہو سکتا ہے۔"

"ذرا مجھے سوچنے دو" اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان چیزوں سے ایسا خطرناک کام بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"تو کیا ایسا ہی ہوا ہے؟ کسی نے تمہیں دھوکا دیا ہے؟" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

اس نے ڈیش بورڈ کی آڑ میں' میرے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور رو دینے والی التجائیہ آواز میں بولا "مجھے معاف کردو۔ کسی قاتل سے میرا کوئی تعلق ہے نہ واسطہ۔ پانچ سو روپے کے لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ مجھ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے۔"

"معافی تلافی کی نوبت بعد میں آئے گی۔ پہلے پوری بات بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔"

اس نے مایوسی سے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے اور بولا "میں نے پانچ سو روپے لے کر اپنے شناختی کارڈ اور بجلی کے بل کی ایک ایک فوٹو کاپی بھیجی کو دی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہو۔"

"یہ بھیجی کون ہے؟" میں نے اس کی زبان سے ایک زنانہ نام سن کر حیرت سے پوچھا۔

"میونسپلٹی میں سڑکوں پر جھاڑو لگانے کا کام کرتی ہے" اس نے کسی پس و پیش کے بغیر بتایا۔

"تم صورت سے تو ایسے نہیں لگتے کہ اپنے محکمے کی بھنگنوں سے دوستیاں کرتے پھرو۔"

"وہ بھنگن نہیں ہے۔ بس حاضری لگانے کے لیے دفتر آتی ہے اور ادھر اُدھر بیٹھ کر گپ شپ کرنے کے بعد واپس لوٹ جاتی ہے۔ دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد وہ دو چار گھروں میں کھانا پکانے' برتن دھونے اور صفائی کرنے کے کام کرتی ہے۔"

"تم اسے جو چاہو کہتے رہو۔ اس سے اصلیت نہیں

Downloaded from https://paksociety.com

بدلتی۔ وہ بھٹکن ہے اور بھٹکن ہی رہے گی۔ اسے تمہارے ان دونوں کاغذوں کی نقل کی کیا ضرورت تھی؟" اس بار میں اپنی ناپسندیدگی بلکہ برہمی پر قابو نہ پا سکا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو" اس نے اپنی صفائی پیش کی "اس سے میری دوستی نہیں ہے۔ وقت گزارنے کے لیے وہ کبھی کبھی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ہمدرد اور خوش اخلاق ہے۔ اپنے مسائل اسے سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے۔"

افضل سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں اس کی جو تصویر بن گئی تھی' اسے اس کے اعتراف سے نقصان پہنچا تھا۔ میں نے بے ساختہ طنز سے کہا "تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ جوان اور خوب صورت بھی ہے۔ دفتر کے مردوں سے دوستیاں کرتی ہے تو آزاد خیال بھی ہوگی۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟" وہ کراہا "وہ خوش شکل ہے مگر جوان نہیں' تجربے کار ہے۔ کبھی کبھی کام کے مشورے بھی دیتی رہتی ہے۔"

بھاڑ میں جائے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ افضل اور کچھی کا ذاتی معاملہ تھا۔ اس بارے میں جذباتی ہو کر میں اپنے موضوع اور مقصد سے بہک رہا تھا۔ میں نے رکھائی سے کہا "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اسے تمہارے وہ دونوں کاغذ خریدنے کی کیا ضرورت تھی ورنہ سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"اسے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی" اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی افضل کے دل میں کچھی کے لیے نرم گوشہ موجود تھا "میں اس سے اکثر اپنی تنگ دستی کا رونا رو تا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ جن گھروں میں کام کرتی ہے' ان میں سے ایک میں رہنے والے ایک بڑے افسر کو کسی شریف آدمی کے ان دو کاغذوں کی نقلیں درکار تھیں۔ جن کے لیے وہ کچھ پیسے بھی دے سکتا تھا' میں لالچ میں آگیا۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایسے کاغذوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے" میں نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

"سوچا تھا اور کچھی سے پوچھا بھی تھا۔ وہ جاہل عورت ہے۔ اس نے جو کچھ بتایا' اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ بجلی والوں نے اس افسر کو کئی لاکھ روپے کا بل بھیج دیا تھا جسے درست کرانے کے لیے اسے دو چار دوسرے بلوں وغیرہ کی نقلیں درکار تھیں....."

"احمقانہ بات ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اس جائز کام کے لیے اسے دوسروں سے کاغذ خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بہت بڑا افسر ہے تو اپنے دو چار ساتھیوں یا ماتحتوں سے مفت میں وہ کاغذ لے سکتا تھا۔ اسے اپنے گھر میں کام کرنے والی بھٹکن سے مدد لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" اس نے مردہ سی آواز میں کہا "یہ سوچنے والی باتیں تھیں جو میرے ذہن میں نہیں آئیں" وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا اور پھر متاسفانہ لہجے میں بولا "لالچ انسان کی عقل اور آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا۔"

تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے بالکل بے گناہ سمجھ لیا تھا۔ اس کی اور کچھی کی کہانی سننے کے بعد وہ اپنے درجے سے گر کر مشتبہ قرار پا چکا تھا۔ وہ بعد کا معاملہ تھا۔ اس وقت دوسری باتیں زیادہ اہم تھیں۔ میں نے پوچھا "یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"شاید تین چار مہینے کی بات ہے۔ پانچ سو روپے ہاتھ آئے تو میرے کئی رکے ہوئے کام نکل گئے تھے۔"

"شاید اتنی ہی مدت سے وہ فون غلط ہاتھوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس افسر کا نام اور پتا کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا" اس نے بے بسی سے جواب دیا "مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔"

"یہ معاملہ بہت سنگین اور اہم ہے۔ خاموشی سے اس افسر تک پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے اسے وارننگ دی۔

"تم کہہ رہے تھے کہ فون کسی خطرناک قاتل کے استعمال میں ہے۔ کچھی اس افسر کی نرم دلی کی اکثر تعریف کرتی رہتی تھی۔"

"بعض لوگ بہروپیے ہوتے ہیں۔ زندگی بھر کامیابی سے اپنا اصل چہرہ چھپائے رہتے ہیں۔ اس وقت کچھی کہاں ملے گی؟"

"وہ اپنے گھر پر ہوگی۔ میں اس کا گھر نہیں جانتا۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ رچھوڑ لائن میں کیسروں کے محلے کے آس پاس کہیں رہتی ہے۔"

اسے گاڑی میں بیٹھا رہنے کی ہدایت کر کے میں نیچے اتر گیا۔ میں اول خان سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے افضل سے ضرورت سے زیادہ باتیں کر ڈالی تھیں۔ اول خان کو میں نے کار آمد معلومات کا خلاصہ سنا دیا۔

"موبائل فون کمپنی کا ریکارڈ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے صحیح سراغ پا لیا ہے۔ اب بے خبری میں اس افسر کے سر پر پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ تمہاری صوابدید پر منحصر ہے کہ اس کامیابی تک افضل کو آزاد رکھنے کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے یا اسے بند کرنا پڑے گا" اول خان نے میری پوری روداد سن لینے کے بعد نپے تلے انداز میں اپنی رائے دے ڈالی۔

Downloaded from https://paksociety.com

"اگر وہ کوئی اعلیٰ مقامی افسر ہے اور میجر بخشی یا راوالوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے تو یہ صدمے کی بات ہے۔ میں اس حرام زادے کا خون پی جاؤں گا" میں نے اپنے بدن میں دوران خون کی حدت محسوس کرتے ہوئے کہا "افضل کو اس وقت آزاد چھوڑا جاسکتا ہے۔ صبح دفتری اوقات کے آغاز سے پہلے پچھی سے اس کی ملاقات ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ ہمارے لیے خرابی پیدا نہیں کرے گا۔"

"تم نے اس سے مذاکرات کیے ہیں۔ تمہاری رائے پر میں حرف گیری نہیں کرسکتا۔ اس نئی کہانی نے مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے۔ راوالے ایک طرف نہایت اعلیٰ پیمانے پر بین الاقوامی سازشیں کرتے ہیں اور اب ایک مقامی بھنگن کی سطح پر کام لیتے ہوئے نظر آئے ہیں۔"

یہ بات دہرانے والی نہیں تھی مگر حقیقت تھی کہ اپنے کام میں وہی سیکرٹ ایجنٹ سرخ رو ہوتے ہیں جو دشمن کی سرزمین پر پہنچنے کے بعد اپنے مرتبے کو بھول کر ہر وقت حالات سے سمجھوتا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اپنی انا اور مرتبے کو بھول کر ہر وقت اپنے تحفظ اور مشن کی کامیابی کو مقدم رکھتے ہیں۔ میں نے کہا "ہم اسے چھوڑ کر واپس چلتے ہیں۔ یہ ان کا شریکِ جرم نہیں ہے۔ نادا نسٹگی میں آلہ کار بنا ہے۔"

"اس سے پھر پوچھ لو کہ اس نے کسی فارم یا تحریر پر دستخط تو نہیں کیے تھے" اول خان نے یاد دہانی کرائی "فون کنکشن کی ہر درخواست پر مجوزہ صارف کے دستخط موجود ہونے ضروری ہوتے ہیں۔"

پچھی کو ان کاغذوں کے صحیح مصرف کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ اس نے افضل کو بجلی کی زائد بلنگ کی کہانی سنائی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ ابہام برقرار رکھنے کے لیے افضل سے کسی بھی تحریر یا فارم پر دستخط نہیں لیے گئے ہوں گے۔ اس کے شناختی کارڈ کی نقل ہاتھ لگ جانے کے بعد کوئی بھی جعل ساز آسانی سے ہر قسم کے دستخطوں کی نقل کرسکتا تھا۔

میں دوبارہ گاڑی میں پہنچ گیا۔ افضل بہت بے چینی سے میری واپسی کا منتظر تھا۔ میں نے اسے ہر قسم کی بے احتیاطی کے مضمرات سے آگاہ کرکے اس قدر خوف زدہ کردیا کہ وہ اپنی بھول پر گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی مگر یہ واضح کردیا کہ اگلی صبح اس کو گھر پر رہ کر ہمارا انتظار کرنا تھا اور ہمارے ساتھ دفتر پہنچ کر پچھی کو ہمارے حوالے کرنا تھا۔

ممنونیت سے لبریز لہجے میں یقین دہانیاں کراتا ہوا' وہ گاڑی سے اتر گیا۔ اس کے اترجانے کے بعد اول خان نے خالی جگہ سنبھالی اور ہم دونوں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ میرا ذہن مسلسل ماسٹر کی پراسرار شخصیت میں الجھا ہوا تھا۔ اگر وہ افضل کی سنائی ہوئی کہانی کے مطابق کوئی ذمے دار پاکستانی تھا تو پھر اس کا انجام کرشن کمار' ہری چند اور شیام سے زیادہ عبرت ناک ہونا چاہیے تھا۔

"ابھی ہم اس افسر کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے" اول خان نے دوران سفر میرا ذہن پڑھتے ہوئے سکوت توڑا "ہمارے اب تک کے تجربات شاہد ہیں کہ ہندو ہی نہیں' بعض پاکستانی بھی اپنے ملک کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ اکرم الٰہی اور مقبول چوہدری ایسے پاکستانیوں کی واضح ترین مثال تھے۔ مراد لطیف ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھا..."

"جب ویرا ہندوؤں اور ایک عیسائی کے مارے جانے کی بات کررہی تھی تو ہم میں سے کسی کو یہ نام یاد نہیں آئے تھے" میں نے کہا۔

"وہ اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کی عادی ہوگئی ہے۔ کوئی اس کی بات کو اہمیت دے کر ذہن پر زور نہیں ڈالتا" میری شکایت سن کر اول خان ہنستے ہوئے بولا "عام ہندوؤں کو دوسرے پاکستانیوں کی طرح اپنی دال روٹی اور روز مرہ مسائل کی فکر گھیرے رہتی ہے۔ غداری کرنا تو بڑی بات ہے' ان کو شاید اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں ہوتا ہوگا۔ ان کے برعکس ہم ماضی میں ایسے ہندو افسروں سے نمٹ چکے ہیں جو پاکستان کی سرکاری ملازمت میں رہ کر دشمنوں کے مفادات کے لیے کام کررہے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ پچھی والا افسر بھی ایسا ہی کوئی آدمی ہو۔"

"وہ بہت چالاک اور مکار معلوم ہوتا ہے" میں نے سرد لہجے میں کہا "اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے لیے ایک نامعلوم اجنبی کے نام پر موبائل کنکشن لینے کا خیال کسی عام آدمی کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس نے اپنے برے وقت کی پیشگی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔"

وہاں سے ہمارے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم اسی موضوع میں الجھتے ہوئے گھر واپس پہنچ گئے۔

"پتا نہیں یہ لوگ اپنی عورتوں کو کیوں سامنے لاتے ہیں" ہماری رپورٹ سن کر سلطان شاہ بڑبڑایا "پہلے ماروتی تھی' اب پچھی آگئی۔"

"ماروتی خطرناک تھی۔ مجھے پچھی سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔" ویرا ہنستے ہوئے بولی "ذہنی اتنا بدذوق نہیں ہے کہ کسی بھنگن کو زیادہ اہمیت دے۔"

"آخر تمہاری ہر بات کی تان ان پر ہی آکر کیوں ٹوٹتی ہے؟" ویرا کا وہ مذاق غزالہ سے برداشت نہ ہوسکا۔

"ایسے کام بہت ہولناک اور پُرخطر ہوتے ہیں" غزالہ کے لہجے کی تلخی کو بھانپ کر اول خان نے بولنا شروع کردیا

Downloaded from https://paksociety.com

"ان میں جنس' مذہب اور عمر کا کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ جو ہاتھ آئے' اسے بھٹی کا ایندھن بنادیا جاتا ہے۔ سیکرٹ ایجنٹ کے لیے اپنے مشن کے سامنے عزت' عصمت' زندگی اور ہر چیز ہیچ ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ داؤ پر لگاکر کامیابی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ گردنیں اتارنے کے اس خوں آشام کھیل وہ کہیں بھی جھجکے تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کی گردن اتار لی جائے گی۔"

"کان کھول کر سن لو" سلطان شاہ نے ویرا کو متوجہ کیا "یہ سرسری باتیں نہیں ہیں۔ تمہارے لیے پہلا سبق ہے۔ بھارت میں تفریح نہیں ہوگی۔ وہاں جاکر تمہیں ایک سچے پاکستانی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح شب و روز محنت کرنا پڑے گی۔"

"میں یہاں بھی کام کرتی ہوں۔ تمہاری طرح حرام خوری نہیں کرتی" ویرا نے چڑنے کے بجائے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

"میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ بار بار یہ لفظ استعمال نہ کیا کرو" سلطان شاہ نے ناصحانہ لہجے میں کہا "حرام خور کا الٹ وہی ہوتا ہے جو تم مچھی کے لیے استعمال کرچکی ہو۔ تم خود کو بھنگن کہلوانے پر کیوں مصر رہتی ہو۔"

ویرا کے ساتھ اختیار کیے جانے والے جارحانہ رویے نے غزالہ کا اشتعال ختم کردیا اور وہ رات کے کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

اول خان کے معمولات شہری اثرات کی وجہ سے خاصے بگڑ چکے تھے لیکن دباؤ سے آزاد ہونے کی صورت میں وہ ان ہی معمولات کی طرف لوٹ جاتا تھا جو فوجی کیمپ اور میس یا لنگر خانے میں نظر آتے ہیں۔ ہمارے برعکس وہ اپنے گھر سے کھانا کھاکر آیا تھا اور میز پر ہمارا ساتھ دینے کے بجائے واپسی کا خواہاں تھا۔

ویرا اسے روک کر لپکتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور جب وہ واپس آئی تو مجھے پتا چلا کہ اس نے ہمارے ساتھ بھارت روانگی کا فیصلہ کرنے کے بعد وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ میری غیر حاضری میں اس نے غزالہ کے ساتھ بازار جاکر' پاسپورٹ کے لیے دونوں کی رنگین تصاویر بنوالی تھیں۔ اس نے تصاویر کا لفافہ اول خان کی طرف بڑھادیا اور بولی "ہونے والا کام پہلی فرصت میں کرلیا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔"

"اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میری تصاویر تیار ہیں۔ میں ابھی کمرے سے لے آتا ہوں" میں نے بلاتوقف جواب دیا۔

"زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری تصویریں بھی اس لفافے میں موجود ہیں' غزالہ نے تلاش کرلی تھیں۔"

اول خان نے لفافہ کھول کر تصویروں کا سرسری جائزہ لیا۔ ان کی تعداد گنی اور لفافہ بند کرکے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کھانے کی میز پر ویرا نے ایک مرتبہ پھر میجر بخشی کا ذکر نکال لیا۔ اس وقت تک اول خان ہمارے گھر سے رخصت ہوچکا تھا۔

"وہ ذہنی طور پر ناکارہ اور بے ضرر ہوچکا ہے۔ اس کے بارے میں سر کھپانا بے سود ہے" غزالہ نے بخشی کا نام سن کر کہا۔

"وہ ناکارہ ضرور ہوگیا لیکن اس سے پہلے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کا بندوبست کرگیا۔ کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہے کہ اس نے بہت کم مہلت ہونے کے باوجود اپنا کام پورا کرلیا۔"

"اس بارے میں اسی وقت کچھ کہا جاسکے گا' جب ماسٹر کا چہرہ بے نقاب ہوگا" سلطان شاہ نے لقمہ نگل کر جواب دیا "جب آستین میں سانپ پل رہے ہوں تو کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔ نقصان پہنچانے کے لیے باہر کے دشمن کو کوئی کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"اس کی دھمکی کا ایک حصہ پورا ہوچکا ہے۔ روی مار ڈالا گیا۔ دوسرا حصہ باقی ہے جس کا تعلق ہمارے گھر سے تھا" ویرا کا لہجہ معنی خیز ہوگیا "جب تک ماسٹر پردے میں رہتا ہے' یہ خطرہ برقرار رہے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو" اس بار مجھے بولنا پڑا "ہم اس امکان سے غافل نہیں ہوسکتے۔ آثار یہ بتارہے ہیں کہ میجر بخشی اور ماسٹر میں گہرا قریبی رابطہ تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیکب اور ارجن ماسٹر کے دست و بازو تھے۔ بڑے مجرم کبھی کھل کر سامنے نہیں آتے۔ ہمیشہ اپنے مہروں کو لڑاتے ہیں۔ وہ پٹ جائیں تو عیاری سے پسپائی اختیار کرلیتے ہیں۔ ارجن نے روی کو مارا۔ اب وہ خود جہنم واصل ہوچکا ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ ہمارا رخ نہیں کیا جائے گا۔"

ویرا نے وہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ میں خاموشی سے اس خطرے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اول خان کا آدمی سبز کار چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر واپس آچکا تھا۔ ان دونوں مستعد پہرے داروں کی موجودگی میں' میں بے خوف تھا مگر تشویش اپنی جگہ برقرار تھی۔

"میں حیران ہوں کہ آج تم نے کھانے سے پہلے خباثتوں کی اماں جان سے ملاقات نہیں کی؟" سلطان شاہ نے کھانے سے فارغ ہوکر ویرا کو چھیڑا۔

"کس کی اماں جان؟" ویرا نے اپنی بے دھیانی سے چونک کر بے ساختہ پوچھا۔

"امّ الخبائث یعنی تمہاری اسکاچ!" میں نے ہنس کر

Downloaded from https://paksociety.com

اسے آگاہ کیا "میں خود بھی تمہارے معمولات میں کوئی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔"

"ام الخبائث میرے لیے نیا لفظ نہیں ہے" ویرا نے کہا "بھارت جانے سے پہلے میں نے شراب نوشی میں کمی کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تمہاری قوت ارادی ڈینی کے مقابلے میں کمزور ہے۔ چاہو بھی تو شراب ترک نہیں کر سکتیں" سلطان شاہ نے تبصرہ کیا۔

"تاؤ دلا کر تم مجھے کسی کام پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اپنی مرضی سے میں جب چاہوں، شراب چھوڑ دوں گی۔"

"ہر شرابی یہی دعویٰ کرتا ہے۔ جب چاہتا ہے، چھوڑ دیتا ہے اور چند روز بعد دوبارہ شروع کر دیتا ہے" سلطان شاہ نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

"وقت آئے گا تو تم دیکھ لوگے کہ میں دوسروں سے بہت مختلف ہوں" ویرا مسکراتے ہوئے بولی "اسی لیے کہتی ہوں کہ ہر وقت مجھ سے نہ اڑا کرو۔ کسی دن تمہاری طرف سے دل پھر گیا تو ساری عمر میری صورت دیکھنے کے لیے ترس جاؤ گے۔"

"ہم لوگوں نے تمہاری ناز برداریاں کر کے تمہیں اتنا بگاڑ دیا ہے کہ اب تم کسی کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتیں۔ یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔"

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ وقت کافی ہو گیا تھا۔ صبح آٹھ بجے مجھے اور اول خان کو افضل کو اس کے گھر سے لینا تھا تاکہ ہم تینوں نو بجے تک میونسپلٹی پہنچ کر یحییٰ کو پکڑ سکیں۔ میرے ایما پر وہ محفل برخاست ہو گئی اور سب اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔

"سلطان شاہ مذاق ہی مذاق میں بہت پتے کی بات کہہ گیا ہے" اپنی خواب گاہ کے تخلیے میں محصور ہونے کے بعد غزالہ نے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے مخاطب کیا "آپ نے ویرا کی جا و بے جا ناز برداریاں کر کے اسے اتنا بگاڑ دیا ہے کہ کبھی کبھی وہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ میرے اور یحییٰ کے بارے میں اس کا مذاق تمہیں بہت ناگوار گزرا تھا۔ اس کو بے لگام کرنے میں تم برابر کی حصے دار ہو۔ تم نے شروع سے اس کے ساتھ ایسا مفاہمانہ رویہ رکھا ہے کہ ڈھیل ملتے ملتے وہ قابو سے باہر ہو گئی ہے۔ پتا نہیں تم اس سے اتنا کیوں دبتی ہو۔ سلطان شاہ کو دیکھو کہ وہ برابری کے ساتھ اس سے مقابلہ کرتا ہے۔ بلکہ اکثر اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔"

"میں سلطان شاہ کی وجہ سے نرمی سے کام لیتی ہوں۔ شروع میں میرے دل میں ویرا کی بہت عزت تھی۔ وہ ہماری ہم وطن ہے نہ ہم مذہب، لیکن ہم سے زیادہ نہ سہی تو ہم جتنی پاکستانی ضرور بن چکی ہے اور سب کچھ چھوڑ کر یہاں پڑی ہوئی ہے۔ میں سلطان شاہ کو اس کے لیے کافی سمجھتی تھی۔ اسے کسی ایسی ساتھی کی ضرورت تھی جو اس کی ہمدرد ہو اور وہ اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ میں بھی جارحانہ تیور اپنا لیتی تو ابتدا میں ہمیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاتی۔"

"بس، تو پھر مجھ سے اس کی شکایت نہ کرو" یہ کہہ کر میں بستر پر دراز ہو گیا۔

"یہ سب زندگی بھر برداشت نہیں کیا جا سکتا" غزالہ بھی مسہری پر آ گئی "میرے حساب سے اسے اب تک سلطان شاہ سے شادی کر کے اعتدال پر آ جانا چاہیے تھا۔ جب تک وہ اپنا گھر نہیں بسائے گی، اس کے مزاج میں ٹھہراؤ اور بردباری نہیں آ سکے گی۔"

"ساری امیدوں اور کوششوں کے باوجود یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"وہ بہت ہی عجیب اور الجھی ہوئی عورت ہے۔ دنیا جہاں کے سارے تجربوں سے گزرنے کے باوجود خود کو الڑ لڑکی سمجھتی ہے۔ اپنے کردار کی حد تک اس کے قول اور فعل میں بہت گہرا تضاد ہے۔ جو کہتی ہے اس پر عمل نہیں کرتی اور جو کچھ من میں ہوتا ہے اسے زبان تک نہیں آنے دیتی۔"

"تم نے یہ رائے کس بنا پر قائم کی ہے؟" میں نے اس کے نرم بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو مجھ سے زیادہ باخبر ہونا چاہیے" غزالہ نے ایک ادا سے منہ بنا کر کہا "میں کئی بار آپ سے کہہ چکی ہوں کہ وہ آپ کو عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہر وقت آپ سے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی یہ حرکتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ اب وہ بھارت کے سفر میں بھی آپ کے سر پر سوار رہے گی۔"

"تم سب کچھ اپنے کانوں سے سن چکی ہو۔ اس کے جانے کی بنیادی شرط یہی ہے کہ وہ ہم پر بوجھ نہیں بنے گی۔ اگر تم اس سے اسی قدر بدظن ہو تو دعا کرو کہ وہ اس سفر میں را کے کسی ایجنٹ کا نشانہ بن جائے۔ اس سے ہمیشہ کے لیے تمہاری جان چھوٹ..."

غزالہ نے بے اختیار میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا اور تڑپ کر بولی "ایسی بدفال منہ سے نہ نکالیں۔ میں اس کی بدخواہ نہیں ہوں۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ اپنی حد میں رہا کرے۔ ہر وقت حد سے تجاوز کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"کسی بھلے وقت میں تم ہی یہ بات اسے سمجھا دینا۔ میری

Downloaded from https://paksociety.com

ناصحانہ باتوں پر وہ سنجیدگی سے کان نہیں دھرتی۔"

"اب بھارت کے سفر کی مثال لے لیں۔ کیا ایسا ممکن ہوگا کہ ہم نئی دہلی میں کام کررہے ہوں اور وہ مدراس یا کلکتے چلی جائے؟ مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے' وہ ہمارے ارد گرد منڈلاتی رہے گی اور ہماری سرگرمیوں پر نگاہ رکھے گی۔ جب بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے سروں پر کوئی منڈلا رہا ہے' وہ اچانک درمیان میں آکودے گی۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے یہ بات کھل کر بیان کردی۔ میں ابھی اس کے کان کھول دوں گا۔ اس نے ایسے مربیانہ انداز میں خود کو مسلط کرنے کی کوشش کی تو ہم سے پہلے خود ہی کوئی بڑا نقصان اٹھائے گی۔"

"اب بھی اگر وہ اپنا فیصلہ واپس لے لے تو ہم تینوں کے لیے بہتر ہوگا۔ وہ یہ بات....."

"بس' اب اس کا ذکر ختم کرو" میں نے اس کی بات کاٹ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے "یہ ہمارا بستر ہے۔ یہاں ہمیں آپس کی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کے بارے میں ہم سارا دن باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

غزالہ کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تیر گئی جس پر اپنائیت اور سپردگی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میرے ذہن کے کسی گوشے میں ماسٹر کی انتقامی کارروائی کا موہوم سا خطرہ موجود تھا لیکن آپس کی میٹھی اور جذبات آفریں باتوں کے دوران میں گہری نیند سوگیا۔ اس وقت تک غزالہ پر نیند کا خمار گہرا نہیں ہوا تھا۔

اگلی صبح میں وقت سے پہلے بیدار ہوگیا۔ رات کے خوشگوار لمحات نے میرے ذہن سے تکان کے سارے اثرات زائل کردیے تھے۔

مقررہ وقت پر اول خان آپہنچا۔ میں تیار تھا۔ فوراً ہی اس کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔

"اگر ضرورت پیش آگئی تو تم کسی تصادم کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو نا!" اول خان نے تائید طلب انداز میں پوچھا۔

"سپاہی ہر وقت لڑنے مرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ قول تم نے مجھے سنایا تھا" میں نے کہا۔

"گڈ!" اول خان خوش ہوکے بولا "میں نے ضروری ہتھیار اپنے ساتھ لے لیے ہیں۔ آدمی کے بغیر ہتھیار بے کار ثابت ہوتے ہیں۔"

حسن اسکوائر کا چوراہا گھوم کر یونیورسٹی روڈ کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اول خان گلیوں میں ہوتا ہوا' تھوڑی دیر میں افضل کے فلیٹ والے بلاک کے قریب جانکلا۔ رات کے اندھیرے کے مقابلے میں دن کا بھرپور اجالا زیادہ بے رحم تھا۔ سورج کی بھرپور روشنی نے افضل والے بلاک کے سارے ڈھکے چھپے عیوب نمایاں کردیے تھے۔ عمارت خاصی پرانی اور خستہ حال تھی۔ اس کے مکین بھی قرب وجوار کے دوسرے مکانات اور فلیٹوں میں رہنے والوں جتنے خوش حال نہیں تھے اور یوں وہ عمارت ان کے دم قدم سے آباد تھی۔

افضل اپنے دفتر جانے کی پوری تیاری کے ساتھ باہر کھڑا ہوا تھا۔ گاڑی رکتے ہی میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ پچھلے حصے میں سوار ہوگیا۔

اول خان نے اگلے موڑ سے گاڑی مین روڈ کی طرف گھمائی اور ہم تینوں میونسپل کارپوریشن کی طرف روانہ ہوگئے۔

"تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے کہ تم نے ان دو فوٹو کاپیوں کے سوا کچھی کو کچھ نہیں دیا تھا" راستے میں' میں نے اس کی مکرر تائید چاہی۔

"نہیں' کچھ نہیں دیا' نہ کسی کاغذ پر دستخط کیے۔ اگر پھر بھی اس نے میرے نام پر فون کا کنکشن لیا ہوا ہے تو اس نے جعل سازی کی ہوگی۔ میری بیوی اس واقعے سے بہت پریشان ہے۔ کچھی کو پانچ سو کی جگہ ہزار روپے لوٹانے کو تیار ہے۔" افضل نے بتایا۔

"کچھی بیچ کی عورت تھی۔ سارا کیا دھرا تیسرے آدمی کا ہے۔ ہماری اصل لڑائی اسی سے ہے۔ بھول کر بھی کچھی سے فون والی بات نہ کرنا۔ اس سے یہی کہنا کہ تم نے بھول سے اسے غلط کاغذ دے دیے ہیں۔" اول خان بولا۔

"تم بہت نرم دل اور ہمدرد انسان ہو۔" وہ تشکر سے لبریز لہجے میں بولا "چاہتے تو رات بھر حوالات میں بند رکھ سکتے تھے مگر تم نے مجھے گھر پر رہنے کی اجازت دے دی۔ میری طرح کچھی بھی بہت غریب اور سادہ عورت ہے جو کچھ ہوا' اس میں کچھی کی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میری طرح اسے بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ یہ مجھ پر تمہارا بڑا احسان ہوگا۔ میں بالکل وہی کروں گا جو تم چاہتے ہو بلکہ اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم جو چاہو' اس سے کہہ دینا۔"

میں نے سوچا کہ کچھی کے تعاون کے لیے افضل کا مطمئن ہونا ضروری تھا۔ میں نے جواب دینے کی ذمے داری سنبھالتے ہوئے کہا "اگر اس کی نیت صاف تھی تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ اس کا فیصلہ تم ہماری صوابدید پر چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔"

افضل میونسپل کارپوریشن میں نچلے درجے کا ملازم تھا لیکن شاید خاصا پرانا ہوچکا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمیں پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

Downloaded from https://paksociety.com

اس نے ہمیں گاڑی میں چھوڑا اور تھوڑی دیر میں بچھی کو اپنے ساتھ لانے کا وعدہ کرکے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔ اسے اپنی ساکھ اور عزت بہت عزیز تھی۔ ہم دونوں کو اپنے ساتھ دفتر میں لے جاکر چہ میگوئیوں کا موضوع نہیں بننا چاہتا تھا۔

اس کی واپسی بہت دیر میں ہوئی۔ اس کے ساتھ مناسب قدوقامت اور فربہی مائل جسم والی ایک پختہ عمر کی خاتون بھی تھی۔ رنگین سوتی ساڑی میں اس کا گہرا گندمی رنگ چمک رہا تھا۔ ناک نقشے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اپنی چڑھتی ہوئی عمر میں خاصی پرکشش رہی ہوگی۔

افضل اسے لے کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا "یہ بچھی ہے۔" کانسی کی چوڑیوں کی کھنک میں افضل کی آواز ابھری "یہ تمہیں اپنے مالک کا گھر دکھادے گی۔"

"کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چل رہے؟" اول خان نے چونک کر پوچھا۔

"میں جاکر کیا کروں گا؟" افضل کی آواز خوشامدانہ ہوگئی "مجھے دفتر سے چھٹی نہیں ملے گی۔ بچھی کو وہیں چھوڑ کر تم واپس چلے جانا۔ ضرورت ہو تو مجھے گھر یا دفتر میں پکڑ سکتے ہو۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔ اس وقت سارے انسپکٹر دفتر آکر اپنے اپنے عملے کی حاضریاں جمع کراتے ہیں۔ میرے غائب ہونے سے دفتر میں خاصی گڑبڑ ہوجائے گی۔"

"تمہیں ہمارے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" اول خان نے مڑکر پوچھا۔

"مجھے تو وہیں جانا ہے۔ تم چھوڑ دو گے تو بس کا کرایہ بچ جائے گا۔ دور سے صاحب کا گھر دکھادوں گی۔"

بچھی کی رضامندی پاکر اول خان نے افضل کو واپسی کی اجازت دے دی اور انجن اسٹارٹ کرلیا۔

"بابو! کیا گڑبڑ ہوگئی؟ افضل بے چارہ پریشان تھا اور افسوس کررہا تھا کہ اس نے اپنے دونوں کاغذ کیوں بیچے تھے ..." گاڑی میونسپلٹی کے احاطے سے باہر نکل آنے کے بعد بچھی اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکی۔

"افضل نے تمہیں کیا بتایا ہے؟" میں نے مڑکر ٹٹولنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بار بار گڑبڑ کا ذکر کررہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ دو سرکاری افسر میرے صاحب کا گھر دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ افضل کے دونوں کاغذوں کے بیچے جانے کی تصدیق کرسکیں۔" اس نے بگڑی ہوئی اردو میں بتایا "میں گواہ ہوں کہ افضل نے پانچ سو روپے میں وہ کاغذ میرے ذریعے بیچے تھے۔"

"تمہارے صاحب کا کیا نام ہے؟" میں نے اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ افضل نے ہماری ہدایت پر عمل کیا تھا۔

"جوگیندر نام ہے ان کا۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنے مالک کا نام بتایا "بہت اچھے اور سیدھے آدمی ہیں۔"

بچھی کی زبان پر آنے والے نام نے مجھے چونکا دیا۔ ہم مذہب کی بنیاد پر تفریق کے مسئلے سے جتنا بچ رہے تھے، وہ مسئلہ اسی شدت سے ابھر کر ہمارے سامنے آرہا تھا۔ جوگیندر اور میجر بخشی کے درمیان ہونے والا... گٹھ جوڑ یکایک قابل فہم اور فطری نظر آنے لگا تھا۔

"تمہارے جوگیندر صاحب کس دفتر میں کام کرتے ہیں؟" میں نے بچھی کی خادمانہ انا کو مجروح کیے بغیر پوچھا۔

"بس اتنا پتا ہے کہ ان کے دفتر سے بھارت جانے کا ویزا ملتا ہے۔" بچھی کا معصومانہ انکشاف دھماکا خیز تھا "صاحب جسے چاہیں بھارت یاترا کا ویزا دلواسکتے ہیں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔"

لمحہ بھر کے لیے میری اور اول خان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ ہم دونوں اس نئے موڑ پر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ میونسپلٹی میں کام کرنے والی ایک معمولی بھنگن نے اچانک ماسٹر کے پراسرار چہرے سے ہر نقاب اتار پھینکی تھی اور اس اہم ترین پیش رفت کا بیشتر کریڈٹ افضل کو جاتا تھا جس نے کسی مزاحمت کے بغیر بچھی تک ہماری رسائی کو ممکن بلکہ آسان بنایا تھا۔

"کیا افضل کو تمہارے مالک کے بارے میں یہ باتیں معلوم نہیں تھیں؟" میں نے اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

"کبھی میں نے باتوں باتوں میں بتایا ہو تو اسے بے چارے کو کہاں یاد رہا ہوگا۔" وہ ہر وقت اپنے دفتر اور گھر کے مسئلوں سے پریشان رہتا ہے۔ چار اوپر تلے بیٹیاں ہیں اور سب پڑھ رہی ہیں۔ غریب آدمی بچوں کو پڑھانا چاہے تو اسے فاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پیٹ بھرلے تو بچوں کو نہیں پڑھا سکتا۔ ایسے پریشان حال آدمی کو میرے صاحب کے نام اور کام سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔"

"تم اپنے صاحب سے بات کرکے کوئی اچھی نوکری دلاسکتی ہو۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"اس نے کبھی یہ نہیں سوچا۔ پنشن اور فنڈ ملنے کی امید میں دن رات گدھے کی طرح کام میں جتا رہتا ہے۔" افضل کا ذکر کرتے کرتے بچھی کو اپنے مصائب یاد آگئے۔ اور اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی "ہمیں بھی کیا ملتا ہے؟ کچھ نہیں۔ بس پکی سرکاری نوکری ہے۔ ہمیں بھی فنڈ

Downloaded from https://paksociety.com

کے ساتھ پنشن ملے گی ورنہ آدھی تنخواہ سپروائزر کھا جاتا ہے۔ بس یہ فائدہ ہے کہ حاضری لگوانے کے بعد ہم باہر ڈیوٹی کرنے کے بہانے غائب ہو جاتے ہیں۔ خود باتھ آئی لینڈ کے دو گھروں میں کام کرتی ہوں تو گزر بسر ہوتی ہے۔ افضل اور اس جیسے منشی دن بھر ایک کھونٹے سے بندھے رہتے ہیں۔"

بچھی جس رفتار سے بول رہی تھی، میں اس سے کہیں زیادہ رفتار سے سوچ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا "افضل سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر وہ دونوں کاغذ واپس چاہئیں۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔" بچھی نے میری بات کاٹ کر اطمینان سے کہا "میں صاحب سے بات کروں گی۔ کاغذ ان کے پاس ہیں تو وہ واپس دے دیں گے۔ شاید پیسے بھی واپس نہ لیں۔ افضل کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ مجھے اس بے چارے پر ہمیشہ ترس آتا ہے۔"

وہ ہمدردی کے جذبے سے اس قدر سرشار تھی کہ اپنے مطلب کی بات پر آنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میں نے اس کی تجویز بے دلی سے سنی پھر کہا "تمہیں ان کاغذوں کی اہمیت معلوم نہیں ہے اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔ جو گینڈر وہ کاغذ نہیں لوٹائے گا۔ تم نے اس بارے میں بات کی تو وہ ان کاغذوں کو کسی ایسی جگہ چھپا دے گا جہاں ان تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میری فلابازی نے اول خان کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے انگریزی میں پوچھا "یہ تم نے کیا چکر شروع کر دیا؟"

"خاموشی سے سنتے رہو۔ میں ہزار لیکسی لینسی کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔" بچھی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

"صاحب کے گھر میں تم کیا کام کرتی ہو۔ وہاں اور کون کون رہتا ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"سارے ہی کام کرتی ہوں۔ صاحب ایک کتے کے ساتھ اکیلے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے ہلا ہوا ہے۔ کام کرنے جاتی ہوں تو دم ہلاتے ہوئے ساتھ ساتھ پورے گھر میں پھرتا رہتا ہے۔ وہ بیمار ہو تو بند کیا جاتا ہے ورنہ کھلا رہتا ہے۔"

مجھے اپنی دلی مراد بر آنے کا سنہرا موقع سامنے نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوال کیا "پھر تم گھر میں کیسے آتی جاتی ہو؟"

"میرے پاس گھر کی چابی ہے۔" اس نے فخر سے بتایا "دوسرے گھر سے فارغ ہو کر میں آخر میں وہاں جاتی ہوں۔ ہانڈی چڑھا کر دوسرا کام کاج کرتی ہوں۔ ڈھائی تین بجے صاحب واپس آتے ہیں تو میں ہانڈی چولھے سے فارغ ہو چکی ہوتی ہوں۔ انہیں کھانا دے کر برتن صاف کرتی ہوں اور سورج ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آتی ہوں۔ پچھلے ایک برس سے میں ان کے گھر میں کام کر رہی ہوں۔"

"تم چاہو تو افضل کی مدد کر سکتی ہو۔ کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ غریب افضل مصیبتوں سے بچ جائے گا۔"

"ہم جاہل لوگ ہیں بابو!" بچھی نے بے چارگی سے کہا "مجھے صاف صاف بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بات میرے بس میں ہوئی تو افضل کے لیے کر گزروں گی ورنہ تم سے معافی مانگ لوں گی۔ مجھے یہ سب کچھ خطرناک سا لگ رہا ہے۔"

"ابھی تک افضل کے لیے سب خطرناک ہے۔ تم ہم کو اپنے ساتھ صاحب کے گھر میں لے جاؤ۔ ہم احتیاط سے وہ کاغذ ڈھونڈیں گے۔ مل گئے تو لے کر واپس آ جائیں گے۔ نہ ملے تو یہ افضل کی بدقسمتی ہو گی۔"

"نہیں!" بچھی نے گھبرا کر اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "مالک نے مجھ پر بھروسا کیا ہے۔ میں ان سے پوچھے بغیر دوسروں کو گھر میں نہیں لے جا سکتی۔ یہ مالک کی نمک حرامی ہو گی۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"ہم تم پر زور نہیں ڈال سکتے۔" میں نے مایوسی سے کہا "افضل کی بھلائی کے لیے ایک مشورہ تھا۔ تم نہیں مانو گی تو پھر ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ہر آدمی اپنے کیے کا پھل پاتا ہے۔ افضل نے غلطی کی ہے تو اب وہی نتیجہ بھگتے گا۔"

"میں یہ بھی نہیں چاہتی۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بچھی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی پھر بلند آواز میں پوچھا "اس کے ساتھ کیا برا ہو گا؟ تم اسے پکڑ لو گے اور پھر اسے سزا ہو جائے گی یا اس سے زیادہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تمہاری طرح ہم بھی بیچ کے آدمی ہیں جو غریب ہیں اور غریبوں پر ترس کھاتے ہیں۔ ہمیں وہ کاغذ لوٹانے ہیں یا اوپر والوں کو سب کچھ بتانا ہے۔ افضل کے ساتھ کیا ہو گا، یہ فیصلہ وہ بڑے لوگ کریں گے۔ انہیں کسی کی غربت اور مجبوری سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہر بڑا آدمی میرے صاحب جیسا نہیں ہوتا لیکن تم غریب تو نہیں لگتے۔ اتنی اچھی موٹر میں آئے ہو۔" اپنے مالک کی مداح سرائی کرتے کرتے اس کا لہجہ اشتباہ آمیز ہو گیا "تمہارے کپڑے بھی بہت مہنگے اور صاف ستھرے ہیں۔"

"گاڑی دفتر کی ہے۔ بڑے لوگوں کے پاس آنے جانے کے لیے ہمیں پیٹ کاٹ کر ایسے کپڑے پہننا پڑتے ہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا "اس بھنگن کے دل میں اترنے اور اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم

Downloaded from https://paksociety.com

خود کو بھی اسی کے درجے کا مظلوم و بے بس شہری ثابت کر سکیں۔ افضل اور بچھی سے گفتگو کے بعد میں اس فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ان دونوں کے درمیان انسانی ہمدردی کے سوا لالچ کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔

"تم نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ہے۔" وہ فکر مند ہو گئی "سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہیں کیا جواب دوں۔"

"ایک کام اور بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کے دماغ میں زہر انڈیلنے کا سلسلہ جاری رکھا "تم گھر دکھا کر چابی ہمیں دے دو اور دوسری جگہ کام کرنے چلی جاؤ۔ ہم گھر میں جا کر ذرا سی دیر میں اپنا کام کر لیں گے۔ تم وہاں لوٹو گی تو چابی تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر چھپی ہوئی ملے گی۔"

"یہ اس سے بھی بری بات ہوگی کہ میں پورا گھر نئے آدمیوں کے حوالے کر دوں۔ میرے صاحب بہت وہمی آدمی ہیں۔ اپنی رکھی ہوئی کسی چیز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ پسند نہیں کرتے۔ تم نے بھول میں کسی چیز کو ہٹا دیا تو ان کو شبہ ہو جائے گا۔ میں ایسا غلط کام مر کر بھی نہیں کروں گی۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کتا کسی چڑیا کو بھی گھر میں پر نہیں مارنے دیتا۔ میرے بغیر تم وہاں پھٹک بھی نہیں سکتے۔ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالے گا اور تمہیں زخمی کر کے بھگا دے گا۔ سارا محلہ تماشا دیکھے گا اور بات میرے صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔"

"پھر پہلی ترکیب ہی بہتر رہے گی۔" میں نے اسے اپنی طرف سے لقمہ دیا۔

بچھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی خاموشی سے سفر کرتی رہی۔

میری اور بچھی کی گفتگو اول خان کے لیے اعصاب شکن ثابت ہو رہی تھی۔ ہمارے درمیان پہلے سے کچھ طے نہیں پایا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میرے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ اس نے دبے لہجے میں 'انگریزی میں کہا "تم وہاں گھسنے میں کوئی افادیت سمجھ رہے ہو تو اس احمق عورت کو بے بس کرو اور گھر کی چابی چھین لو کیوں بلاوجہ اس پر اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں نے اسے مختصراً جواب دے کر خاموش کر دیا۔

حقیقت یہ تھی کہ اول خان کے مشورے سے پہلے میں خود اس امکان پر غور کر چکا تھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ بچھی عورت ذات تھی اور زیادہ قصوروار نہیں تھی۔ ان دو حقائق کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ کوئی جبر کیا جاتا تو وقت سے پہلے یا قدرے تاخیر سے اس کی کہانی جو گیندر یا اس کے ساتھیوں تک پہنچ جاتی' راز کھل جاتا اور افضل کا نام بھی منظر عام پر آجاتا۔

ان واقعات کی تشہیر ہمارے حق میں نہیں تھی۔ جو گیندر نے ماسٹر کے روپ میں خاموشی سے روی کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔ اس سے پہلے ہم اپنا دامن بچا کر پوری احتیاط سے میجر بخشی کو معذور کر چکے تھے۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسی طرح جو گیندر کا معاملہ بھی مکمل خاموشی اور راز داری کا متقاضی تھا۔ اس بارے میں بات باہر نکل جاتی تو ناقابلِ تصور پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔

میونسپل کارپوریشن سے باتھ آئی لینڈ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اول خان نے میرے اور بچھی کے مذاکرات کی سست روی کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم رکھی تھی اور دانستہ بس کے روٹ والا طویل راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ چاہتا تو سٹی اسٹیشن کے ریلوے پل کے برابر والی سڑک سے ہو کر ذرا سی دیر میں مولوی تمیز الدین روڈ پر نکل سکتا تھا۔ اپنے طبعی اور فطری اضطراب کے باوجود اس نے کسی غیر ضروری عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"تم اسی طرح سوچتی رہیں تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہمارے ہاتھ کٹ جائیں گے۔ افضل کے ساتھ کچھ ہوا تو اس کی بیوی اور چاروں بچیاں بے سہارا ہو جائیں گی۔ تمہیں جلد از جلد فیصلہ کر لینا چاہیے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اس وقت تمہاری رضامندی میں افضل کی خوشی قسمتی ہوگی۔ تم نے انکار کر دیا تو ہم اسے افضل کی بدقسمتی سمجھ کر خاموش ہو جائیں گے" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

بچھی ہمارے ساتھ آرام سے گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی مگر اس پر ذہنی دباؤ بہت تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس کے چڑھے ہوئے سانسوں کی آواز واضح طور پر سن رہا تھا۔ وہ اندرونی ہیجان میں مبتلا تھی۔

"میں تمہیں چابی نہیں دوں گی" آخر کار اس کے اعصاب جواب دے گئے "تم گاڑی دور کھڑی کر کے ٹھیک گیارہ بجے آجانا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اندر لے جاؤں گی۔ تم آدھے پون گھنٹے میں کاغذ ڈھونڈ کر باہر نکل جاؤ گے۔ اس سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرو گے۔"

بچھی کی وہ تجویز بہت حوصلہ افزا تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے دیے ہوئے وقت سے پہلے باہر آجائیں گے۔"

ہماری گاڑی کشادہ سڑک پر سیدھی دوڑتی رہی۔ بچھی کے ایما پر ایک جگہ اول خان نے رفتار کم کر لی۔ گاڑی ایک سڑک پر گھوم گئی۔ وہاں سڑک پر دونوں طرف بڑے بڑے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہماری گاڑی کا سفر جاری رہا۔ بچھی

Downloaded from https://paksociety.com

کے کہنے کے مطابق اول خان نے اس صاف ستھری آبادی کی کئی پر پیچ گلیاں طے کیں اور پھر ایک جگہ گاڑی روک دی۔

"وہ پیلا مکان!" بچھی نے ہاتھ اٹھا کر جوگیندر کے گھر کی نشاندہی کی اور گاڑی سے اتر گئی۔ وہ مڑ کر دیکھے بغیر، بہت تیزی سے ایک قریبی گلی کی طرف جا رہی تھی۔

"جوگیندر کے گھر میں گھس کر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟" بچھی سے نجات ملتے ہی اول خان پھٹ پڑا۔

میں نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سفّاکانہ انداز میں کہا "وہی جو وہ ہمارے ساتھ کرنا چاہ رہا ہے۔"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اب تم یہاں کے واقعات میں نہیں الجھو گے۔ حالات کے مطابق میں خود فیصلے کرتا رہوں گا۔ تم کسی بھی صورت میں اس کا سامنا نہیں کرو گے۔ ذرا سی چوک ہو گئی تو سب کچھ قابو سے باہر ہو جائے گا۔"

"مجھے اس کا سامنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تک بخشی کی ایک دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری دھمکی پر بھی عمل کر گزرے، ہم کو بے رحمی سے اس کا سر کچل دینا چاہیے..."

"میجر بخشی کے بارے میں قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہمارا بھرم رہ گیا" وہ گاڑی کو واپسی کے راہ پر ڈالتے ہوئے بولا "ہر ایک کے ساتھ ہم وہ سلوک نہیں کر سکتے۔ تم بھول رہے ہو کہ جوابی کارروائیوں کا کوئی سلسلہ چل پڑا تو تلخیاں بہت بڑھ جائیں گی۔"

"ہم اسے فائرنگ کر کے نہیں ماریں گے۔ ٹائم بم اور ریموٹ کنٹرولڈ بم۔ میرے ذہن میں یہ دو تجاویز ہیں۔"

اول خان کی آنکھیں تحیر زدہ انداز میں پھیل گئیں "تو تم بم نصب کرنے کے لیے اس کے گھر میں گھسنا چاہتے ہو؟"

میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی "گہرے سکوت میں بہترین ساخت کے ٹائم بم کی گھڑی کی آواز گونجے گی۔ وہ گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کے لیے ریموٹ کنٹرول سب سے بہتر رہے گا۔ ٹھیک گیارہ بجے بچھی دیوی ہمارے دروازے پر دستک دے گی۔ اس سے پہلے یہ بندوبست ہو جانا چاہیے۔"

"بخشی کے واقعے کو ہم حادثہ قرار دے رہے ہیں۔ بم کے دھماکے کے لیے ایسی کوئی آڑ نہیں مل سکے گی۔"

"کچھ روز پہلے اسلام آباد میں بم کا دھماکا ہوا تھا۔ کئی پاکستانی ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔ دنیا کے ترقی یافتہ شہروں تک میں ایسی دہشت گردیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہماری حکومت کا تعزیتی بیان اور ہمدردانہ ردِّ عمل ہمیں الزامات سے بچائے گا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم اتنی آسانی سے بخشی کے قریب ترین ساتھی تک پہنچ جائیں گے۔ اس بار بھی مقدر نے ہماری یاوری کی ہے ورنہ ہم سولی پر ٹنگے ہوئے تھے۔"

"تم بچھی کو کیسے خاموش رکھو گے؟ وہ گھر میں دو اجنبیوں کے داخلے کی کہانی سناتی پھرے گی۔"

"اسے ہماری نیت کا علم نہیں ہے۔ وہ ہمیں کسی اور کام کے لیے جوگیندر کے گھر میں لے جا رہی ہے۔ دھماکا ہونے کے بعد بس وہ سوچتی رہ جائے گی۔ اس کے اندر کا چور اسے زندگی بھر لب کشائی سے روکے رہے گا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ محض اسی لیے میں اسے رضاکارانہ آمادگی کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ زبردستی کی صورت میں وہ سمجھ جاتی کہ ہماری نیت صاف نہیں ہے۔"

"یہ دھماکا رایگاں بھی جا سکتا ہے" اول خان ہر منفی پہلو اجاگر کرنے کے موڈ میں آ چکا تھا۔ میرے ارادے کے خلاف اس کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قدم اٹھانے سے پہلے ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنا چاہ رہا ہو۔

"رایگاں نہیں جائے گا" میں نے مسکرا کر اسے یقین دلایا "ایک مرتبہ بم اس کے گھر میں پہنچ جائے تو وہ بچ نہیں سکے گا۔"

"اس وقت تمہارے ذہن میں واضح خاکہ موجود ہونا چاہیے، مجھے بتاؤ کہ تم اس کی موت کو یقینی کیسے بناؤ گے۔ میں نے جوگیندر پال کا نام سنا ہوا ہے۔ وہ لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خونی آدمی ہے اور بہت کامیابی سے پس پردہ رہ کر یہاں اپنا ایک سال پورا کر چکا ہے۔"

"دھماکا اس وقت ہو گا جب وہ فون پر مجھ سے بات کر رہا ہو گا۔ پہلے سے اسے خوف زدہ نہیں کیا جائے گا۔"

"موبائل فون کے ساتھ وہ شہر کے کسی بھی حصے میں ہو سکتا ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہے؟"

بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی "بعض اوقات تمہاری سوچ بالکل یکطرفہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے کب کہا کہ میں اس سے موبائل فون پر بات کروں گا۔ اس کے گھر میں عام فون بھی ضرور ہو گا۔ وہ اسے کہاں لے جا سکتا ہے؟"

اول خان بھی خفّت آمیز انداز میں میری ہنسی میں شریک ہو گیا "تم سے بات کرتے ہوئے چاروں کھونٹ چوکس رہنا پڑتا ہے۔ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کب کیا کہہ ڈالو گے۔ یہ چکر موبائل فون نمبر سے چلا ہوا تھا۔ میرا ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔"

"مجھے صرف ایک فکر تھی کہ جوگیندر پال کے گھر میں ہونے والے دھماکے سے اس کے پڑوسیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کا گھر دیکھ لینے کے بعد یہ خدشہ دور ہو گیا ہے۔ آپس میں ملی ہوئی دیواروں والا گھر یا فلیٹ ہوتا تو ہم اپنے

Downloaded from https://paksociety.com

منصوبے کو بھول جانے پر مجبور ہو جاتے۔"

"جوگیندر پال کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا کہ موت اس پر سایہ فگن ہونے والی ہے۔ افضل کے نام پر موبائل فون حاصل کرنے کے بعد اسے کبھی خیال نہیں آیا ہوگا کہ اس کی یہی حرکت اس کے لیے موت کا پھندا بن جائے گی۔"

"ہر مجرم کے ساتھ یہی ہوتا ہے جس گھر کو وہ اپنے لیے محفوظ خیال کرتا ہے' وہیں اسے مات ہوتی ہے۔"

"اسے یہ جان کر دکھ ہوگا کہ ایک بھنگن کی وجہ سے وہ جہنم واصل ہو رہا ہے" میں نے محظوظ ہو کر کہا۔

اول خان نے کچھ کہنے کے لیے بے ساختہ منہ کھولا مگر کچھ کہے بغیر سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کہو' کہو!" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی "تم کچھ کہتے کہتے رک گئے۔"

"کچھ نہیں۔ ذرا سا مغالطہ ہوا تھا پھر بات سمجھ میں آگئی۔ تم اس سے فون پر جو کچھ کہو گے' بم پھٹنے سے چند ثانیوں قبل ہونے والی دوسری اور آخری گفتگو میں کہو گے۔ اسے کسی کو کچھ بتانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"تم دھماکے کے لوازم کے لیے حامد کو فون کرو گے یا ہمیں اسٹیشن فور کی طرف دوڑ لگانی پڑے گی؟"

"ہمارے پاس کافی وقت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ حامد کو بلا لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ جوگیندر پال کے گھر میں دھماکے کے لیے پندرہ سے بیس کلومیٹر کی حد میں کام کرنے والا ریموٹ کنٹرول یونٹ کافی رہے گا" اس نے میری رائے جاننی چاہی۔

"مرنے والوں پر اپنے وسائل اتنی بے دردی سے ضائع مت کرو۔ یہ یونٹ خاصے مہنگے ہوں گے۔ ایک دو کلومیٹر کی رینج والا کوئی سستا یونٹ بھی ہمارے لیے اسی قدر کارآمد ثابت ہوگا۔ اگنیشن سے منسلک کرنے سے پہلے اس کا ٹیسٹ کیا جانا ضروری ہے۔ اسے فون پر سب کچھ بتا دینے کے بعد ڈیوائس نے کام نہیں کیا تو ساری احتیاط اور رازداری دھری کی دھری رہ جائے گی۔"

"تمہارے ایسے اندیشے روح تک کو لرزا دیتے ہیں۔ میں حامد کو ٹینشن کے لیے خاص طور پر کہہ دوں گا۔"

مین روڈ پر نکلنے سے پہلے اول خان نے اپنی گاڑی کنارے سے لگا دی اور موبائل فون پر اسٹیشن فور سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

وہ فون پر دھیمی آواز میں حامد کو ہدایات دیتا رہتا۔ میں سگریٹ سلگا کر اپنے ذہن میں آنے والے لمحات کا نقشہ جمانے میں مصروف ہو گیا۔ غیر معمولی آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچنے والے کاموں کے بارے میں' میں آخری تمبا تک شکوک و شبہات میں مبتلا رہتا تھا کیونکہ آسانیوں کے باعث ایسے معاملات میں کسی سنگین بھول چوک کے امکان زیادہ غالب رہتے ہیں۔

اپنی بات ختم کر کے اول خان نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی "ہم پی آئی ڈی سی کالونی کے قریب حامد کا انتظار کریں گے۔ میں نے اسے پانچ کلو طاقت والی ڈیوائس کے لیے کہا ہے۔ وہ تین چار سو گز کے رقبے میں تباہی پھیلانے کے لیے کافی ہوگی۔"

"اسے دو گز زمین میں اتارنے کے لیے کم از کم اتنے رقبے کی تباہی لازمی ہے' ضروری نہیں کہ ہم اس کی مسہری کے نیچے یا خواب گاہ میں بم نصب کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ دھماکے سے دو تین کمروں کو اڑ جانا چاہیے۔" میں نے اس کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

اول خان ریلوے پل عبور کر کے' گاڑی کو ڈھلان سے اتارتے ہوئے' دھیرے دھیرے داہنی طرف لاتا چلا گیا۔ پھر اس نے گاڑیوں کے ہجوم میں سست روی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں وہ رک سکتا تھا۔

اس نے دوسری کئی گاڑیوں کے باہر نکلنے کی راہ مسدود کر دی تھی لیکن خود ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ اس لیے قریب ہی منڈلاتے ہوئے ٹریفک کے عملے نے اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے موبائل فون پر گھر کا نمبر ملا لیا۔

"کبھی کبھی تم بہت سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہو" رابطہ قائم ہو جانے پر میرے کان میں ویرا کی چہکتی ہوئی آواز گونجی "ہم یہی سوچ رہے تھے کہ تم دونوں کیا کر رہے ہو گے۔ یہ بتاؤ کہ بھنگن پروجیکٹ کی کامیابی کی کوئی امید ہے یا معاملہ کہیں ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔"

"تمہارا اندیشہ درست ہے۔ ہم شہر کی سڑکیں ناپ کر ایک بجے سے پہلے گھر واپس پہنچ جائیں گے۔"

"مجھے رات ہی سے کامیابی مشکوک معلوم ہو رہی تھی" میرے جواب سے ویرا کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی "اپنے مسائل میں گھرے ہوئے مفلوک الحال اور ناخواندہ لوگوں سے کوئی امید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ افضل کی کہانی کمزور اور بودی تھی۔"

"دونوں کو جاہل قرار نہ دو۔ افضل اتنا پڑھا لکھا ضرور ہے کہ میونسپلٹی میں کلرکی کر رہا ہے۔ تمہاری صنف سے تعلق رکھنے والی کو جاہل ہی ہونا چاہیے۔ لکھ پڑھ کر کوئی بھی اس پیشے کا رخ کرنا پسند نہیں کرتا۔"

ویرا نے محظوظ ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "اس کا مطلب ہے کہ اس حسینہ عالم سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ شہر کی کسی سڑک پر جھاڑو پھیرنے کے لیے نکلی

Downloaded from https://paksociety.com

ہوئی ہوگی۔ مل جائے تو مجھے ضرور بتانا کہ وہ کیسی ہے اور تمہارے کس کام آسکتی ہے۔"

"ویرا! خدا کا خوف کیا کرو" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اسے تادیب کی "تعلیم اور دولت کسی کی میراث نہیں ہوتی..."

"مجھے معلوم ہے" اس نے میری بات اڑادی "کبھی کبھی تم غریبوں اور مظلوموں کے ایسے ہمدرد بن جاتے ہو کہ کامریڈ معلوم ہونے لگتے ہو۔"

"کامریڈ بننے کا فیشن اب لد گیا لیکن زمین کے حقائق آج بھی وہی ہیں..."

وہ میری بات سننے پر آمادہ نہیں تھی پھر بیچ میں بول پڑی "یہ باتیں کھانے کی میز پر موزوں رہیں گی۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ استاد کے موبائل کا کیا کیا جائے۔ رات اطمینان سے گزار لینے کے بعد ماسٹر اس سے رابطے کے لیے بے چین ہے۔ بار بار گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ ہر بار درمیانی وقفہ گھٹتا جارہا ہے۔"

"وہ بجتا ہے تو بجنے دو۔ بھول کر بھی اسے ہاتھ نہ لگانا" میں نے جلدی سے کہا۔

"جب بات ہی نہیں کرنی تو فون بند نہ کردوں۔ گھنٹی ناقابلِ برداشت ہوتی چلی جارہی ہے۔"

"ایسی حماقت نہ کرنا۔ فون کی حالت میں ذرا بھی تبدیلی آئی تو ماسٹر کے کان کھڑے ہوجائیں گے۔ جواب کے بغیر گھنٹیاں سن کر وہ یہ سمجھے گا کہ استاد سے فون کہیں گر گیا ہے یا پھر وہ خود کہیں بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ تبدیلی اس کے لیے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوگی۔ ابھی اس کا غافل رہنا ہی سودمند ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم اس سے بات کرنے کا مشورہ دوگے۔ جب کہیں سے کوئی پیش رفت نہیں ہورہی تو اس سے بات کرنی چاہیے۔ کچھ پتا تو چلے کہ وہ کون ہے؟"

"ہم اسی کام کے لیے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس میں دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"شاید تم بھنگن کی طرف سے ابھی تک پُرامید ہو۔ تمہاری واپسی پر یہ نتیجہ بھی سامنے آجائے گا" ویرا کی بات سن کر میں نے فون بند کردیا۔

میری گفتگو سے اول خان نے اندازہ لگالیا کہ میں نے ویرا کو اپنی کامیابی کی بھنک تک نہیں دی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا "آج تم نے ویرا کو بھی نچا دے دیا۔"

"مجبوری ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "اسے ذرا سا بھی اشارہ مل جاتو وہ پے در پے سوالات کرکے میرا دماغ چاٹ جاتی۔ اس وقت میں اپنا ذہن بالکل صاف اور پرسکون رکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ کام پورا ہوجائے تو ہر بات ہر ایک کے علم میں آجائے گی۔"

"میرا خیال تھا کہ تم گھر پر موجود رہ کر جوگیندر پال پر اپنا آخری وار کروگے لیکن تمہارے عزائم کچھ اور نظر آرہے ہیں" اول خان نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دھیمی آواز میں سوال کیا "دھماکے کے وقت ہمارا اس علاقے میں موجود رہنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگالیا؟" میں نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر پوچھا "کیا میں نے ایسی کوئی بات کی تھی؟"

"اب تم ذہنی دباؤ میں آئے ہوئے ہو" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے براہِ راست کچھ نہیں کہا لیکن ریموٹ کنٹرول یونٹ کی رینج کو پندرہ بیس کلومیٹر سے گھٹا کر دو تین کلومیٹر کرنے کا مشورہ ضرور دیا تھا۔ یہ رینج قرب وجوار سے ہی استعمال کی جاسکتی ہے۔"

"میں کہہ کر بھول گیا۔ اسی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جوگیندر پال کا مسئلہ کس طرح میرے اعصاب پر سوار ہے" میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر جواب دیا "میں دھماکے کے بعد ہونے والی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا بس چلتا تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کرتا۔"

"اس کے بارے میں تم کچھ زیادہ ہی انتہا پسندی کا مظاہرہ کررہے ہو۔ اس کے جرائم کرشن کمار سے زیادہ سنگین نہیں ہوں گے۔"

"وہ را کا ایجنٹ تھا۔ جو کچھ کررہا تھا' اپنے حساب سے ٹھیک کررہا تھا۔ سفارتی کیڈر میں چھپے ہوئے بھیڑیوں سے مجھے ہمیشہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔"

اس وقت ہمارے پاس ان سلگتے ہوئے حسّاس موضوعات پر بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم بھیڑ بھاڑ والے ایک مصروف مقام پر کھڑے ہوئے تھے جہاں ہمارا کوئی بھی لفظ یا فقرہ کسی کو ہماری طرف متوجہ کرسکتا تھا۔ دونوں کو اس حقیقت کا ادراک تھا۔ ہم نے اپنی زبانیں بند کرلیں اور خاموشی سے حامد کا انتظار کرنے لگے۔

سوا دس بجے تک میں اپنے ذہن میں اٹھنے والی آندھیوں کو چھپائے سکون سے بیٹھا رہا۔ جب گھڑی کی سوئیوں نے ساڑھے دس کا رخ اختیار کیا تو میری طبیعت میں ہلکا سا اضطراب پیدا ہونے لگا۔ کسی ناگہانی حادثے یا رکاوٹ کی وجہ سے حامد کو وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوجاتی تو ہمارا پورا کھیل تباہ ہوسکتا تھا۔ اول خان میرے کچھ کہے بغیر وہ تبدیلیاں محسوس کررہا تھا۔ اس کی نظریں بھی رہ رہ کر رسٹ واچ کا طواف کررہی تھیں۔ ساڑھے دس بج گئے تو اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے اسٹیشن فور پر فون کیا تو پتا چلا کہ

Downloaded from https://paksociety.com

حامد دس بجے سے پہلے وہاں سے نکل چکا تھا۔

دس بج کر پینتیس منٹ پر اول خان کے چہرے پر ہیجان کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ایس ٹی ایف کی وہ گاڑی دیکھ لی جو اس وقت حامد کے استعمال میں تھی۔ حامد نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ایسے تار کر گاڑی نے دوبارہ آگے رینگنا شروع کردیا۔ اس وقت پارکنگ میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ حامد کے داہنے ہاتھ میں ایک وزنی تھیلا جھول رہا تھا۔

میری نگاہوں میں وہ بڑے بڑے، رنگین دیواری پوسٹر گھوم گئے جو دہشت گردی سے عوام کو ہوشیار کرنے کے لیے شہر کے بارونق بازاروں اور پرہجوم کاروباری علاقوں میں کثرت سے چسپاں کیے گئے تھے۔ ان میں سارا زور مشتبہ تھیلوں اور بریف کیسوں پر تھا جو تباہی کا پیش خیمہ بن سکتے تھے۔

مجھے احساس تھا کہ حامد نے مطلوبہ اشیا یک جا کرکے اسٹیشن فور سے روانہ ہونے میں دانستہ کوئی تاخیر نہیں کی ہوگی مگر پھر بھی اسے پہنچنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ اگر ہم اسے بلانے کے بجائے خود دوڑ لگاتے تو محدود وقت میں ہماری واپسی ہرگز ممکن نہ ہوتی۔

کچھی کا دیا ہوا ڈیڑھ گھنٹا گزرنے میں بس ذرا سی دیر باقی تھی۔ حامد نے وہ تھیلا اول خان کے حوالے کیا اور یقینی آواز میں کہا "فائیو کے جی، فائیو کلومیٹر... آل ٹسٹڈ اوکے اینڈ ریڈی فار یوز۔"

اول خان گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ تھیلا میرے سپرد کرکے اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

وہ ایک مہلک بارودی بم تھا جو کھلونے کی طرح میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ ڈالا تو وہ دو نرم چرمی پیکٹ تھے۔ میں نے بہت احتیاط سے دونوں پیکٹ نکالے اور خالی تھیلا قدموں میں ڈال دیا۔ ایک پیکٹ بڑا اور وزنی تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے چرمی غلاف میں مضبوط دستہ لگا ہوا تھا۔ وہ اصل دھماکا خیز اور مہلک بم تھا جس کے ساتھ بم کو چلانے والے حساس لاسلکی آلات موجود ہونے چاہییں تھے۔ دوسری جیبی کیلکولیٹر کے سائز کی ایک ہلکی پھلکی ڈبیا تھی جس پر صرف تین بٹن تھے۔ سرخ بٹن پر سخت مگر شفاف پلاسٹک کا حفاظتی خول منڈھا ہوا تھا تاکہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے سرخ بٹن اچانک نہ دب جائے۔

"ریموٹ کنٹرول یونٹ جیب میں رکھ لو۔ بڑا پیکٹ اندر چھوڑنا ہوگا" اول خان نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے مجھے بریف کیا۔

میں نے ہلکا پھلکا ریموٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ٹریفک کی بھیڑ اور پل کے اختتام پر واقع موڑ کی وجہ سے ٹریفک کی رفتار سست ہوگئی۔ کہیں سے آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں رسٹ واچ دیکھتا اور ٹریفک کی بدنظمی پر سلگتا رہا۔ آخر کار ہم اس تنگ مقام سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ پہلے سے دیکھی ہوئی گلیوں سے گزرنے کے بعد اول خان نے ایک درخت کے سائے میں گاڑی روک کر انجن بند کردیا۔

اس مقام سے جوگیندر پال عرف ماسٹر کا پیلا مکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ہمیں گاڑی اس گھر سے دور روک کر پیدل کچھی تک پہنچنا تھا۔ رسٹ واچ پونے گیارہ بجا چکی تھی۔ میں نے اول خان کی طرف دیکھا، وہ تیار تھا۔ ہم دونوں بے پروایانہ انداز میں آگے بڑھنے لگے لیکن حقیقت میں ہم اپنے گردوپیش سے پوری طرح باخبر تھے۔ بم والا چرمی کیس میرے بائیں ہاتھ میں جھول رہا تھا۔

وقت پورا کرنے کے لیے ہم نے رفتار دھیمی رکھی تھی لیکن کچھی بھی ہم سے کم دباؤ میں نہیں تھی۔ اس غریب اور جاہل بھنگن کو شاید یہی احساس مارے ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے اچھے مالک کی اجازت اور مرضی کے بغیر دو اجنبیوں کو اس کے گھر میں لے جانے والی تھی۔ موڑ پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کچھی اپنے دیے ہوئے وقت سے پہلے، سامنے والی گلی سے نمودار ہورہی تھی۔

اس نے بھی دور سے ہمیں دیکھ لیا اور اپنا رخ پیلے مکان کی طرف کرلیا۔ ہم نے اپنی رفتار قدرے تیز کرلی اور درمیانی فاصلہ کم کرکے کچھی کے پیچھے جوگیندر پال کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

احاطے کا چوبی پھاٹک مقفل نہیں تھا۔ کچھی اسے کھول کر اندر غائب ہوگئی۔ اس نے ہمارے لیے پھاٹک کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یکے بعد دیگرے ہم دونوں بھی اس پھاٹک سے گزر گئے۔ اول خان نے آخر میں دونوں پٹ ملا کر اندرونی کنڈی کو خفیف سا سرکا دیا تاکہ ہوا سے چوبی پھاٹک نہ کھل سکے۔ اس وقت تک کچھی گھر کے داخلی دروازے کا قفل

انتباہ

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

Downloaded from https://paksociety.com

کھول چکی تھی۔ ہم بڑھے اور ہمارے قدم اپنی جگہوں پر جم کر رہ گئے۔ کچھی اندر جا چکی تھی اور کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے سے ایک گراں ڈیل کتا' ہانپتے ہوئے ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔

اس وقت کوئی رائفل بردار میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی پروا نہ کرتا لیکن ایک کتے کے کھلے ہوئے' خوفناک جبڑے کو نظرانداز کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میرے پورے وجود میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرایت کرگئی۔ کچھی اس کتے کی آڑ میں پناہ لے چکی تھی اور وہ کسی بھی لمحے جست لگا کر ہم پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

تذبذب اور بے یقینی کی وہ کیفیت چند لمحوں سے زیادہ برقرار نہ رہ سکی۔ فضا میں کچھی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ کتے کو ٹونی کہہ کر پچکار رہی تھی۔ کتے نے اپنی دم کو فضا میں زور زور سے ہلاتے ہوئے رخ بدل لیا۔ لیکن ہماری نظروں کے سامنے موجود رہا جبکہ کچھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ آگے بڑھ سکوں۔ میں نے گنبھیر نظروں سے اول خان کی طرف دیکھا پھر تقریباً بہ یک وقت ہم دونوں کے سر ہل گئے۔ دونوں ایک دوسرے کو آگے جانے کا اشارہ کررہے تھے۔ کوئی پہل کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

ایک حقیر کتا ہمارے راستے کی دیوار بنا ہوا تھا اور ہم دونوں اس سے ڈر رہے تھے۔ میرا خون جوش میں آگیا۔ میں نے ہمت کرکے ایک ہی قدم بڑھایا تھا کہ وہ خبیث کتا چونک کر دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس بار اس نے اپنے حلق سے ایک ہلکی سی جارحانہ آواز بھی نکالی تھی' جس کے نتیجے میں' میں بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔ پروگرام طے کرتے ہوئے ہم نے اس دیوہیکل کتے کی موجودگی کے سنگین مضمرات کو سرے سے نظرانداز کردیا تھا۔

"جلدی اندر آؤ! مجھے دروازہ بند کرنا ہے۔ ٹونی تمہیں کچھ نہیں کہے گا" کچھی نے کھلے ہوئے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر خوف زدہ آواز میں تیز سرگوشی کی۔

اس کا چہرہ غائب ہوگیا۔ کتا دوبارہ ہمارے سامنے تھا۔ اس کے دونوں کان کھڑے ہوئے تھے اور ہمارے سانسوں کے زیروبم کے ساتھ کسی ریڈار کے اینٹینا کی طرح' اپنے محور پر چھوٹے چھوٹے جھٹکوں سے گھوم رہے تھے۔ ٹونی کے بارے میں کچھی کی یقین دہانی مجھ پر کوئی اثر نہیں کرسکی۔ یہی حال شاید اول خان کا تھا کیونکہ اس نے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

کچھی کو اندازہ ہوچکا تھا کہ کتے کے سامنے جانے سے ہم دونوں ہچکچا رہے تھے۔ وہ کسی تدبیر سے کتے کو دروازے کے سامنے سے ہٹا لے گئی۔ کتے کے منظر سے دفعان ہوتے ہی میرے خون کو طرارہ آگیا۔ ایک پالتو کتا مجھے زیادہ سے زیادہ کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی مگر مجھے فیصلہ کرنے میں تاخیر ہوچکی تھی۔ مجھ سے پہلے اول خان حرکت میں آچکا تھا اور مربیانہ انداز میں مجھے اپنے پیچھے آنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

اس مرتبہ ٹیں اول خان کے پیچھے تھا اس لیے اندرونی دروازہ مجھے بند کرنا پڑا۔ کچھی کتے کا پٹا تھام کر اسے اندر کہیں لے جارہی تھی۔

"تم ٹھہرو' میں اسے ایک کمرے میں بند کرکے آتی ہوں۔" کچھی نے پیچھے مڑ کر پیغام دیا۔

جوں ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی' میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ زیادہ بڑا مکان نہیں تھا۔ کشادہ لابی میں چار دروازے تھے اور چاروں ہی کھلے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا کسی کی خواب گاہ کے طور پر زیراستعمال تھا کیونکہ اس کا بستر شکن آلود تھا۔ میں پھرتی سے اسی کمرے میں گھس گیا۔ جو کچھ ہوا' وہ کتے کی وجہ سے حادثاتی طور پر ہوا تھا۔ اس میں میرے کسی منصوبے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کمرے میں انسانی وجود کی بو رچی ہوئی تھی۔ جوتوں کے اوپر شب خوابی کا ایک دھاری دار لباس بکھرا ہوا تھا' ڈریسنگ ٹیبل پر موجود' مردانہ استعمال کی چیزیں بے ترتیب تھیں۔ سرہانے والی تپائی پر فون رکھا ہوا تھا۔ قالین پر اسکاچ کی ایک خالی بوتل بھی لڑھکی ہوئی تھی۔

آثار بتا رہے تھے کہ وہ جو گیند ربال کی خواب گاہ تھی۔ بم رکھنے کے لیے روئے زمین پر اس سے بہتر مقام ملنا محال تھا۔ قسمت نے اتفاق سے وہ موقع فراہم کردیا تھا۔ میں نے چشم زدن میں اپنے ہاتھ میں موجود ریموٹ کنٹرول بم' جوں کا توں مسہری کے نیچے رکھ کر دور تک کھسکا دیا اور جس تیزی سے اس کمرے میں داخل ہوا تھا' اسی تیزی کے ساتھ باہر نکل کر واپس اول خان کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے وہ کارروائی اتنی سرعت سے انجام دی تھی کہ کچھی تقریباً ایک منٹ بعد کتے کے بغیر واپس آئی۔ تو اسے میری حرکت کا اندازہ تک نہیں ہوسکا۔ وہ مکان پوری طرح بند اور گفتگو کے لیے محفوظ تھا مگر ہم تینوں کے ذہنوں پر ایک خوف سوار تھا۔ کچھی دبی دبی سرگوشیانہ آواز میں بولی "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم دونوں پالتو کتوں سے اتنا ڈرتے ہو۔ میرے ہوتے ہوئے وہ تمہیں کچھ بھی نہ کہتا۔ میں نے اسے بند کردیا ہے۔ جلدی سے کاغذ ڈھونڈ لو اور واپس چلے جاؤ۔"

"تمہیں بھروسا ہو تو ہم دونوں الگ الگ کمروں کی تلاشی لے لیں تاکہ وقت بچ جائے۔" میں نے سادگی سے

Downloaded from https://paksociety.com

پوچھا۔

"نہیں!" وہ اس سوال کے لیے شاید پہلے سے تیار تھی "میں تم دونوں کے ساتھ ساتھ رہوں گی تاکہ کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ ہوجائے۔"

اس کی عائد کی ہوئی شرط بہت کڑی تھی۔ اگر قسمت اور کتے نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو شاید بم والا چرمی پیکٹ ہمیں اپنے ساتھ واپس لے جانا پڑتا۔

لابی میں کھلنے والے کمروں میں پہلا دروازہ سادہ سے ڈرائنگ روم کا تھا۔ اس سے ملحق ڈائننگ روم میں چار کرسیوں کے ساتھ ایک چھوٹی مگر خوب صورت میز پر پڑی ہوئی تھی۔ ان سے نکلنے کے بعد پھپھی ہمیں جوگیندر پال کی خواب گاہ میں لے گئی "یہ میرے صاحب کا کمرا ہے۔"

"تم چیزوں کے ہلنے جلنے کی بات کررہی تھیں۔ یہ تو پورا کمرا ہی بکھرا ہوا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہاں ہر چیز کی ایک جگہ مقرر ہے۔ صاحب پھیلاتے ہیں' میں ہر چیز کو سمیٹ کر واپس اس کی جگہ پر پہنچاتی ہوں۔ گھر میں سب سے مشکل کام یہی ہے۔"

ہم دونوں کمرے کے مختلف حصوں میں اِدھر اُدھر چکراتے رہے۔ پھپھی دروازے کے قریب کھڑی' ہمیں دیکھتی رہی۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ پر نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ جگہ خالی تھی۔ اس کمرے میں کچھ وقت برباد کرنے کے بعد ہم دونوں نے اپنی ناکامی کا اعلان کردیا۔

"پھر افضل کے دونوں کاغذ صاحب کے پاس ہوں گے۔" پھپھی نے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کہا "چوتھا کمرا خالی پڑا ہوا ہے۔ اسٹور میں ٹونی رہتا ہے۔ باورچی خانے میں وہ کاغذ ہو نہیں سکتے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہمیں چوتھے دروازے پر لے گئی۔ وہ ملحق باتھ روم کے ساتھ ایک خواب گاہ تھی مگر بھائیں بھائیں کررہی تھی۔ جوگیندر نے وہاں اپنی ضرورت سے زیادہ کوئی چیز جمع نہیں کی تھی۔

"یہ بہت برا ہوا۔ ہم تینوں کی محبت بھی افضل کے کسی کام نہیں آسکی۔" میں نے افسردگی سے کہا "پتا نہیں اب اس کا کیا بنے گا۔"

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ آج میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے کسی مالک سے نمک حرامی کی ہے۔"

"پھپھی! تم واقعی بہت ہمدرد اور نیک دل عورت ہو۔ تم مجھے یہاں کا فون نمبر دے دو۔ میں دیکھوں گا کہ افضل کے لیے کیا ہوسکتا ہے۔ کل یا پرسوں میں تمہیں فون پر پوری بات بتادوں گا۔" میں نے باتوں کی روانی سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذہن میں چکرانے والا سوال بھی کرڈالا۔

"فون کرو گے!" اس نے دھیرے سے کہا' کچھ سوچا اور پھر اپنے مختصر بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وسط میں کچھ ٹٹولا۔ اس کا ہاتھ واپس آیا تو اس میں زپ والا ایک ننھا سا پرس موجود تھا۔ پھپھی زپ کھول کر اس کے اندر کچھ تلاش کرنے لگی۔

ذرا سی محنت کے بعد اس نے کئی تہوں والا ایک چھوٹا سا کاغذ میرے سامنے کردیا "یہ یہاں کا نمبر ہے۔ صاحب نے خود لکھ کر دیا تھا کہ کبھی کوئی مجبوری ہو تو فون کرکے ان سے پہلے سے چھٹی لے لوں مگر میں نے آج تک کام سے کوئی چھٹی نہیں لی۔ میں دل لگا کر کام کرتی ہوں۔"

میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر وہ نمبر نوٹ کرلیا۔ پھپھی حیرت ناک طور پر ہمارے سارے مسائل حل کرتی جارہی تھی۔

"مجھ سے بات کرنی ہو تو گیارہ بجے سے پہلے اور ایک بجے کے بعد کبھی فون نہ کرنا۔" پھپھی تاکید کررہی تھی "کبھی کبھی صاحب دفتر سے چھٹی کرکے ڈیڑھ دو بجے تک گھر آجاتے ہیں۔ ہفتے اور اتوار کو ان کی چھٹی ہوتی ہے۔"

"پھر ہفتے اور اتوار کو بھی فون نہ کروں۔" میں نے پھپھی کا دل رکھنے کے لیے خوامخواہ پوچھ لیا۔

"ہاں! ہولی' دیوالی اور دوسرے تہواروں پر بھی فون نہ کرنا۔" پھپھی نے دور تک کے لیے وضاحت کردی "اب تم جاؤ' ڈر سے میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔ میں پانی پی کر کچھ دیر بیٹھوں گی تو دل ٹھکانے پر آئے گا۔ اس کے بعد میں کام شروع کروں گی۔"

میں نے اس کے لیے چند توصیفی الفاظ کہے پھر ہم دونوں نکاس کے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ہمیں اندرونی دروازے سے رخصت کرکے پھپھی نے فوراً قفل لگالیا۔ ہم نے باہر نکل کر جوبی پھاٹک بند کیا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف چل دیے۔

"آج جوگیندر پال کی بدقسمتی کا دن ہے۔ ہمارے سارے کام توقع سے زیادہ آسان ہوتے چلے گئے۔" اول خان نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

"مجھے آج پتا چلا کہ تم کتوں سے ڈرتے ہو۔" میں نے ہنسنے کی دبی ہوئی آرزو پوری کرتے ہوئے کہا "اسے دیکھ کر تمہارے پیر زمین پر گڑ کر رہ گئے تھے۔"

اول خان بھی ہنسنے لگا "تم بھی تو اس خوں خوار بلا سے ڈر رہے تھے۔ اصل کام اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں؟" میں نے حیرت سے کہا "میں تو بالکل بھی نہیں ڈرا تھا۔ تم سے پہلے آگے بڑھا تھا۔"

"ایک قدم بڑھے تھے۔ اس کے غراتے ہی دو قدم پیچھے آگئے تھے۔ تم چل پڑتے تو مجھے حوصلہ مل جاتا۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"اچانک شیر بھی سامنے آجائے تو انسان ساری ہمت یک جا کر کے اس سے لڑلیتا ہے لیکن جان بوجھ کر ایک ذلیل اور خطرناک کتے کے منہ میں جانا مشکل کام ہے۔" میں نے اس کے مشاہدے سے آگاہ ہوتے ہی ہتھیار ڈال دیے "کتے کے ذکر کے بغیر آج کی کہانی ادھوری رہے گی لیکن گھر جا کر میرے اور اپنے خوف کی کہانی نہ لے بیٹھنا۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا آج پہلی بار اندازہ ہوا ہے۔ میں جلد ہی اسے دور کرلوں گا۔"

اول خان کچھ نہ بولا ہم دونوں کم وبیش یکساں تجربے سے گزرے تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ ناخوش گوار واقعہ ہمارے درمیان موضوع سخن نہیں بنے گا۔ اس واقعے کی کوکھ سے جنم لینے والی ہماری کامیابی نے کم از کم میرے دل میں ندامت کے احساس کو خاصا کمزور کردیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم کچھ دور نکلے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں یک بہ یک بچھی 'جوگیندر پال اور ٹونی کے ٹرانس سے نکل آیا ہوں۔ وہ واقعات بہت تیزی اور تسلسل کے ساتھ رونما ہوتے چلے گئے تھے۔ اس دوران میں میرا ذہن پوری طرح ان حالات کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ ہماری وہ مہم کامیابی سے ہم کنار ہوچکی تھی۔ جوگیندر پال کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے بنیادی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ کھیل کے اس حصے کی تکمیل کے ساتھ میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوا تو مجھے یاد آیا کہ اس دن کے لیے ہم نے کچھ اور ترجیحات بھی طے کی ہوئی تھیں۔

"آج ان چکروں کی وجہ سے ہمارے پاسپورٹوں کی تیاری کا کام اٹک گیا۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"صبح گھر سے نکلنے سے پہلے' میں نے اپنے گھر پر آئے ہوئے آدمی کو بریفنگ کے ساتھ تمہاری تصاویر دے دی تھیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ واقعات کا پہیا چل نکلا تو میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ وہ کام ہو رہا ہے۔ کل صبح تک تینوں پاسپورٹ آجائیں گے۔"

"گڈ!" اول خان کی زبان سے خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی "فرد اور تنظیم میں یہی فرق ہوتا ہے۔ تم اس نکتے کا ہر وقت دھیان رکھتے ہو۔"

"ایک مصروفیت کی وجہ سے دوسرا کام متاثر ہونے لگے تو میں شدید کوفت محسوس کرتا ہوں۔"

"استاد کا موبائل فون گھر میں ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "ویرا بتا رہی تھی کہ اس پر بار بار کال آرہی ہے۔"

"جوگیندر' استاد جیکب سے رابطے کے لیے بے چین ہوگا۔ شاید استاد اور ارجن کے انجام کی خبر ابھی تک دبی ہوئی ہے۔"

"وہ اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں گرے ہیں۔ مجھے اس ویران علاقے میں لے گئے تھے۔ اب وہاں ان کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ کوئی مشکل سے ان تک پہنچ سکے گا۔ اس وقت تک جنگلی جانور لاشوں کو نوچ کر مسخ کرچکے ہوں گے۔"

"جوگیندر پال کی موت کے ساتھ تمہارے سر پر منڈلانے والے سب خطرات ٹل جائیں گے۔" اول خان نے قدرے توقف کے بعد کہا "اب تمہارے گھر کا فون نمبر صرف ماروتی کے علم میں ہے اور وہ پوری طرح تمہاری مٹھی میں ہے۔"

"وہ واقعی عجیب اور بدقسمت عورت ہے۔ اپنے شوہر کے لیے بے پناہ محبت کے ساتھ بے وفائی کا جو سنگم میں نے ماروتی میں دیکھا ہے' وہ کبھی میرے گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ موہن ہاؤس والوں کے ساتھ اس کا گزارہ ہونا مشکل ہے۔"

"زندگی تجربات کا دوسرا نام ہے۔ ماروتی کے جگائے ہوئے فتنوں کا تماشا دیکھنے کے بعد میں خود اندر سے لرز کر رہ گیا تھا۔"

"اسے روی کی موت کی خبر ملے گی تو وہ مجھے تلاش کرے گی۔ اب میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔"

"تمہارا فیصلہ مناسب ہے۔ تنہا ہوجانے کے بعد وہ تمہاری ذات میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرسکتی ہے۔ تم اس سے دور رہو گے تو وہ خود ہی مایوس ہوکر کوئی دوسرا سہارا تلاش کرلے گی۔ جوان اور خوب صورت بیواؤں کو آسانی سے ہمدرد مل جاتے ہیں۔"

اول خان نے سچ کی بات کہی تھی۔ کم سنی کی شادی کے باعث ماروتی اس وقت بھی جوان نظر آرہی تھی جب کہ میری اطلاعات کے مطابق وہ خود ایک جوان بیٹے کی ماں تھی۔ اس نے اپنی آزادیوں کی خاطر بیٹے کو میرپور خاص کے دیہی علاقے میں چھوڑا ہوا تھا جہاں اس لڑکے کو بھی اپنی خاندانی حیثیت کی بنا پر فرصت کے ساتھ ساتھ وہ تمام آزادیاں حاصل تھیں جو چڑھتی ہوئی منہ زور جوانی کے ساتھ انسان کی طلب بن جاتی ہیں۔

"مجھے ماروتی کا انجام افسوس ناک نظر آتا ہے۔" میں نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہا "وہ روی کے آزاد دوستوں کی صحبت میں گھر کر ایک کھلونا بن جائے گی اور پھر ہمیشہ کے لیے بکھر جائے گی۔"

"یہ بہت اچھا ہے کہ چند روز بعد تم بھارت کی طرف نکل جاؤ گے۔ سلطان شاہ میرے پاس آجائے گا۔ میں عارضی

Downloaded from https://paksociety.com

طور پر تمہارا فون بند کروادوں گا۔ رابطے میں مسلسل ناکامی سے تھک ہار کر وہ تم سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہوجائے گی۔"

"ارجن اور جیکب سے ٹکراؤ میں میرا چہرہ نہ بگڑا ہوتا تو میں کل ہی یہاں سے نکل جاتا!" میں نے حسرت سے کہا۔

"تم چاہو تو اب بھی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتے ہو۔" اول خان نے تجویز پیش کی "تم کو لاہور میں رک کر آگے جانا ہے۔ تم یہ چند دن لاہور میں گزار سکتے ہو۔ جب زخم مندمل ہوجائیں تو اسلام آباد سے جلال کو لاہور بلالینا۔ وہ تمہیں سرحد پار بھیجنے کا بندوبست کردے گا۔"

وہ بہت موزوں تجویز تھی جس پر کسی تاخیر کے بغیر عمل کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

ہم دونوں پچھلے چند گھنٹوں کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں آئندہ کے امکانات پر باتیں کرتے ہوئے تقریباً بارہ بجے گھر پہنچ گئے۔ مجھ سے فون پر ہونے والی مایوسانہ گفتگو کے نتیجے میں ویرا چیک رہی تھی۔

"غنیمت ہے کہ تم جلد ہی لوٹ آئے۔" ویرا نے مجھ سے سامنا ہوتے ہی کہا "مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھنگن تمہارا سارا دن برباد نہ کردے۔"

"یہ تمہاری اور ڈینی کی آپس کی گفتگو ہے۔ میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔" اول خان نے اس کے تبصرے پر ہلکا سا قہقہہ لگا کے کہا۔

اول خان کی خوش دلی نے ویرا کو مخمصے میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھے گھورا پھر خشک لہجے میں پوچھا "اصل کہانی کیا ہے؟"

"آرام سے بیٹھ جاؤ! اصل کہانی آج شام تک ختم ہوجائے گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے ریموٹ کنٹرول نکال لیا۔ اول خان اسے میرے ساتھ مصروف پاکر خاموشی سے فون کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

میں... کچھ دیر تک ویرا کو زچ کرتا رہا۔ میں نے جوگیندر پال کے خلاف جو کامیابی حاصل کی تھی، وہ اتنی اہم تھی کہ میں اپنے مزاج پر اس کے مثبت اثرات کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ ویرا کے ساتھ غزالہ اور سلطان شاہ نے بھی میرے چہرے سے پڑھ لیا کہ بات وہ نہیں تھی جو ویرا سمجھ رہی تھی۔ یہ ویرا کے سیمابی مزاج کی خوبی تھی کہ وہ فوراً ہی استہزائیہ انداز ترک کرکے میری خوشامد پر اتر آئی۔

جوگیندر پال تک رسائی کے سلسلے میں پھپی نے جو کردار ادا کیا، وہ ان سب کے لیے ناقابل یقین حد تک حیران کن تھا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک ان پڑھ اور معمولی عورت ایسے اہم مجرم تک رسائی میں کوئی کلیدی کردار ادا کرنے کی اہل ہوسکتی تھی۔

"وہ اپنے مالک سے خائف تھی اور کسی قیمت پر ہم سے اتنا زیادہ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔" اول خان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "میں اکیلا ہوتا تو اپنی کوششیں ترک کرکے ہتھیار ڈال دیتا لیکن ڈینی نے ہمت نہیں ہاری۔ پھپی کو آمادہ کرنا اسی کے بس کی بات تھی۔"

"اس طبقے کے بعض لوگ اپنے مالکوں کے بہت وفادار ہوتے ہیں مگر وہ تو میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہے۔ جوگیندر کے گھر تک کیسے پہنچ گئی؟"

پچھلی رات اس بارے میں تفصیل سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ اول خان نے پورا پس منظر دہرانے کے بعد کہا "پھپی اور ڈینی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر میں ایک عجیب نتیجے پر پہنچا ہوں۔ یہ ان پڑھ اور مفلوک الحال لوگ جیسے بھی ہوں، برے وقت میں ایک دوسرے کے بہترین ہمدرد ثابت ہوتے ہیں، ان میں کسی تعلیم اور تربیت کے بغیر ایسی طبقاتی سوچ پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ پھپی کے تیور اس وقت نرم ہوئے جب ڈینی نے اسے یقین دلایا کہ ہم بھی اسی کی طرح غریب اور بے سروسامان طبقے سے تعلق رکھتے ہیں..."

"تمہاری گاڑی دیکھ کر بھی اس نے ڈینی کے اس ڈھکوسلے کو تسلیم کرلیا؟" ویرا نے اول خان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہ ڈینی کی چرب زبانی کا کمال تھا کہ اسے تسلیم کرنا پڑا۔ ایک بار وہ راہ پر آئی اور کام بنتا چلا گیا۔"

"خاصی سنسنی خیز صورت حال ہے۔" ویرا نے سوچتے ہوئے کہا "جوگیندر پال اپنے دفتر میں ہے۔ اس کی خواب گاہ میں، مسہری کے نیچے پانچ کلو بارودی طاقت والا ایک ریموٹ کنٹرولڈ بم پوشیدہ ہے جس کا ریموٹ ڈینی بے پروائی سے لیے پھر رہا ہے۔ سب کچھ تیار ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ جوگیندر دفتر سے اپنے گھر واپس پہنچ چکا ہے۔"

"یہ معلومات بھی پھپی نے فراہم کی ہیں۔ ہم اس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔" اول خان نے بتایا۔

"چار نہیں، چھ بجے!" میں نے اس کی تصحیح کی "میں چاہتا ہوں کہ ہماری پہلی کوشش ہی بار آور ثابت ہو۔ چھ بجے تک اسے اپنے معمولات سے فارغ ہوکر کمرے میں پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے اس کے کمرے میں اسکاچ کی ایک خالی بوتل دیکھی تھی۔ شراب نوشوں کے لیے شام کا دھندلکا

Downloaded from https://paksociety.com

دعوت انگیز ہوتا ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں' شام ہوتے ہی اس ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے چین ہوجاتے ہیں جہاں سے انہیں ان کی خوراک مل سکے۔"

اچانک میز پر رکھے ہوئے اس موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی جو میں نے استاد جیکب کی لاش سے حاصل کیا تھا۔ گھنٹی کی آواز واقعی کرخت اور ناگوار تھی۔ جب تک گھنٹی بجتی رہی' سب خاموش رہے۔ وہ سلسلہ منقطع ہوا تو ویرا منہ بنا کر بولی "یہ گھنٹیاں سن سن کر میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"جب اس پر آنے والی کوئی بھی کال نہ سننے کا فیصلہ ہوچکا ہے تو تمہیں اس سے جان چھڑا لینی چاہیے تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تمہاری ہدایت تھی کہ فون بند نہ کیا جائے۔ جوگیندر یا ماسٹر چونک پڑے گا۔"

"فون سے نجات حاصل کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔" ویرا کو جواب دے کر میں سلطان شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا "یہ موبائل لے جاؤ اور اپنے بستر پر تکیے کے نیچے رکھ دو۔ یہ خیال رہے کہ اس کا کوئی بٹن نہ دبنے پائے۔"

"اتنی سی بات تم مجھے پہلے بھی بتا سکتے تھے۔" ویرا نے میری ہدایت پر برہمی سے کہا۔

"یہ حل تم خود بھی سوچ سکتی تھیں۔ ضروری نہیں کہ میں ایسی معمولی باتیں بھی بتاتا رہوں۔"

"سوچنے میں تھوڑی سی عقل خرچ ہوتی ہے۔" سلطان شاہ نے جاتے جاتے گرہ لگائی "عورتیں عقل بہت کفایت سے استعمال کرتی ہیں اسی لیے کبھی گنجی نہیں ہوتیں۔ مرد بے چارے سوچ سوچ کر جوانی میں ہی گنجے ہوجاتے ہیں۔"

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میری اور اول خان کی کارگزاری سے واقف ہونے کے بعد ہر ایک بہت خوش نظر آرہا تھا۔ جوگیندر پال کے متوقع انجام کے پیش نظر سب پرجوش تھے۔ خوش گپیوں کے دوران میں' شکم سیر ہوکر کھانا کھایا گیا اور پھر سستی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

میں نے جوگیندر پال کے خلاف آخری قدم اٹھانے کے لیے ایک وقت کا تعین کردیا تھا جو خاصی دور تھا۔ ویرا اور سلطان شاہ کو آرام کی سوجھنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے' کسل مندی سے انگڑائیاں لیتے رہے پھر خاموشی سے اپنے اپنے کمروں کی طرف کھسک گئے۔ غزالہ عام حالات میں بھی خانہ داری کے فرائض میں مصروف رہتی تھی اور ہمارے ساتھ کم وقت گزارتی تھی۔ اس وقت وہ اول خان کی فرمائش پر چائے بنانے میں مصروف تھی۔

تخلیہ ہوتے ہی اول خان بولا "راستے میں تم نے پانچ بجے کا وقت مقرر کیا تھا لیکن اب چھ بجے اس خبیث کو فون کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو۔ اسے بلاوجہ ایک گھنٹے کی رعایت کیوں دے رہے ہو؟ یہ کام جتنا جلد ہوجائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔" اس کے چہرے سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس سوال نے کافی دیر سے اسے پریشان کیا ہوا تھا لیکن وہ دوسروں کے سامنے خاموش رہا تھا۔

"ہمارا نشانہ صرف جوگیندر پال ہے۔" میں نے بتایا "اس کے ساتھ پچھی کو خراش بھی آئی تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کروں گا۔ میں نے ایک گھنٹے کی مدت ایسے کسی اتفاق کو ٹالنے کے لیے بڑھائی ہے۔ چھ بجے سے پہلے وہ وہاں سے جاچکی ہوگی۔"

"پچھی کا محفوظ رہنا بہت ضروری ہے۔" اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "میں اس کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔"

"وہ اپنے ٹونی کے ساتھ کسی کتے ہی کی موت مارا جائے گا۔ اس بے زبان جانور کو بچانا میرے بس سے باہر ہے۔"

ہم دونوں ڈرائنگ روم میں صوفوں پر نیم دراز ہوکر باتیں کرتے رہے۔ ویرا اور سلطان شاہ کا قیلولہ زیادہ طول نہیں پکڑ سکا۔ انتظار کی اعصاب شکن کیفیت میں گہری نیند سونا محال تھا۔ ان کی واپسی کے ساتھ غزالہ بھی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ تینوں نے روانگی کے لیے کپڑے تبدیل کرلیے تھے۔ وقت رینگ رینگ کر گزرتا رہا۔ سب کی نظریں بار بار دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اول خان کے سوا کسی کو یہ سوال نہیں سوجھا تھا کہ جوگیندر کے مقدر کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ بجے کے وقت کا انتظار کیوں ضروری تھا۔

پانچ بجے اول خان پر بھی اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ سب تیار تھے۔ اول خان کی گاڑی میں ہم پانچوں آسانی سے سوار ہوسکتے تھے۔ موبائل فون ساتھ لے کر ہم نے گھر کو مقفل کیا اور وہاں سے باتھ آئی لینڈ کے لیے روانہ ہوگئے جہاں جوگیندر پال کو آنے والے بدترین وقت سے بے خبر' اپنے گھر میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ اول خان نے ڈرائیونگ سیٹ سلطان شاہ کے حوالے کردی اور خود مجھے ریموٹ کے استعمال کا آسان طریقہ سمجھا رہا تھا۔ جوگیندر پال کی خواب گاہ کو ہولناک دھماکے کے ساتھ اڑانے کے لیے ہمیں بہرحال اس کے گھر سے پانچ کلو میٹر کی حد میں رہنا تھا۔ اس رینج سے باہر ریموٹ کنٹرول بے کار تھا۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

Downloaded from https://paksociety.com

کی برادریوں کا آغاز ہوا اور وہ ڈی ڈسٹارٹر اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے کیمپ کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظریں منتصب ٹھہرا۔ اپنے مشن کی کامیابی کے ساتھ ہم پاکستان واپس پہنچے' یہاں مدن موہن کے نیٹل انفارمیشن سیل کے حد مہربان سے تفتیش کے نتیجے میں کھوئل راجواڑی کا ہم سامنے آیا' اپنی سیاسی حیثیت کے باعث وہ ہمارے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوا اور ہمارے ہاتھوں سے پھسلی مچھلی کی طرح نکلنے کے بعد اسلام آباد پہنچا مگر اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے اسے واپس کراچی لایا گیا اور وہ میری نگہبری کے نتیجے میں امریکی ایجنٹوں سمیت جہنم واصل ہوا۔ اب ہمارے سامنے امریکی کونسلیٹ کا ملازم اور ائی ائی منٹ تھا۔ میں اس سے امریکن گرین کارڈ کے لالچی کرنل جمالی دستی کے روپ میں ایس ٹی ایف کے غدار کی حیثیت سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ میں ڈیتی کو تلاش کر کے اس کے حوالے کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ وہ دوسرے امریکیوں کے مقابلے میں قدرے مشکل ثابت ہو رہا تھا' اس نے میرے اور اول خان کے تذکرہ پر شبہ بھی حاصل کر لیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اول خان نے حکام سے بات کی اور انہوں نے فیصلہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے ابوبی سے رابطہ کیا مگر وہ محتاط ہو چکا تھا' اس نے مجھے انڈین کونسلیٹ کے میجر بخشی کے سپرد کر دیا۔ جس نے مجھے دھمن راج سے بھی متعارف کرا دیا۔ میجر بخشی ہمگر عمل جمالی دستی کا فنی ماضی جاننا چاہتا تھا اس چکر میں اس نے مجھے اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تاہم بعد میں اسے کرنل جمالی دستی کی حیثیت پر یقین آگیا۔ ابوبی منٹ نے اپنی کامیابیوں کے ڈھنڈورے پیٹنے کے بعد وہ دلی فرار ہو گیا۔ میجر بخشی کی طرف سے مجھے اغوا کی آخری کوشش کے نتیجے میں رستم ایرانی ہمارے سامنے آیا وہ پاکستان میں رہ کر ایران کے خلاف سازشوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ کرائے کے قاتل بھی فراہم کیا کرتا تھا میں نے اس تک رسائی حاصل کی اور بھاری معاوضے پر ابوبی منٹ کے قتل کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ حسب توقع اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی دوران میں رستم ایرانی نے انکشاف کیا کہ ڈیتی کی تلاش کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ علم ہوا کہ پنڈت منوہر لال اس کے گہرے مراسم ہیں جس کے بعد میں نے پنڈت منوہر لال کے گھر کی تلاشی لی جہاں سے ایسے کاغذات ملے جن سے پنڈت منوہر لال کا اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کا ایجنٹ ثابت ہوتا تھا۔ رستم نے ان کاغذات کے لیے خطیر رقم کی پیش کش کی۔ میں نے جواب میں پنڈت منوہر لال کو مانگ لیا۔ اس کے انکار پر اس کے گھر کا محاصرہ کیا گیا اور رستم نے خودکشی کر لی۔ پنڈت منوہر لال کو وہاں سے بازیاب کرا لیا گیا۔ پنڈت نے بتایا کہ رستم نے اسے موساد میں شامل کرایا تھا۔ رستم کی خودکشی پر ایک نام نہاد بین الاقوامی این جی او فریڈم انٹرنیشنل پاکستان میں انسانی حقوق کے حوالے سے واویلا پر ہم اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا کرتا دھرتا اکرم الٰہی تھا جو کچھ عرصے سے ملک سے باہر تھا تاہم اس کی غیر موجودگی میں اس کا بھانجا مقبول چوہدری رستم کی خودکشی پر شور مچا رہا تھا۔ ہم نے فریڈم انٹرنیشنل کے دفتر پر کامیاب چھاپہ مار کر دو افراد کو گرفتار کر لیا۔ ان میں مقبول چوہدری اور اکرم الٰہی کا سیکرٹری منظور الحق تھا۔ مقبول چوہدری وہاں سے کامیاب ہو گیا اور اپنی حفاظت کے لیے اکرم الٰہی کے گھر پناہ لے لی۔ فریڈم انٹرنیشنل کے دفتر میں متعدد اکرم الٰہی کے ساتھ تصاویر ملیں۔ ان سے پتا چلا کہ اسے مقبول چوہدری نے اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے قید کیا ہوا تھا۔ اس کی ذات بھی شک و شبے سے بالاتر نہیں تھی اس لیے اس کے ٹیلی فون پر آبزرویشن لگا کر اسے فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا۔ میں نے نامی ایک لڑکی کی مدد سے مقبول الٰہی کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے انٹیشن فور پہنچا دیا گیا۔ اکرم الٰہی کے فون پر لگائی گئی آبزرویشن کے نتیجے میں ہمیں علم ہوا کہ یوب راجیل نامی ایک امریکی سفارت کار اس ملاقات کے لیے کراچی آرہا ہے۔ اکرم الٰہی کی سخت نگرانی کی جا رہی تھی ہم اسے یوب راجیل سمیت گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی نگرانی کرنے والوں کو چکل دے کر یوب راجیل سے ملنے ہوٹل پہنچا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ اکرم الٰہی نے ہمیں دیکھتے ہی ہوٹل سے رام فرار اختیار کی مگر ہمارے ایجنٹ نے اپنی جاں فروشی اور اسے ملنے والے محبِ وطن شہری ڈرائیور مجید کی معاونت سے اکرم الٰہی کا قابو میں کر لیا۔ یوب راجیل نے اپنی گلوخلاصی کی کوشش کی مگر ناکام ہوا اور بالآخر امریکی صدر کے فرمان کے تحت اپنے عہدے سے برخاست ہو کر امریکا عازم سفر ہوا۔ اکرام الٰہی نے تحقیق کے دوران میں بتایا کہ وہ فورڈ فاؤنڈیشن کو ان کے بیانات کے حوالے سے بلیک میل کرتا رہا ہے اور اس نے فاؤنڈیشن کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی فائل بنا رکھی ہے۔ ہم نے وہ فائل حاصل کر لی۔ مقبول چوہدری اور اکرام الٰہی بے مصرف ہو چکے تھے لہٰذا انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اکرام الٰہی کی مرتب کردہ فائل سے ہمیں بہت ساری معلومات حاصل ہوئیں۔ ان میں ایک نام مراد شریف کا تھا جو اندرون سندھ ایک این جی او چلا رہا تھا۔ فائل سے ظاہر ہوا کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے اسے مقبول چوہدری کے حوالے سے بلانا چاہا مگر وہ قابو میں نہیں آیا۔ سلطان شاہ اس کی تلاش میں حیدر آباد گیا اور بدقسمتی سے مراد شریف کے شکنجے میں پھنس گیا۔ سلطان شاہ کو چھڑانے کے لیے ہم نے پہلے مراد شریف کو حیدر آباد سے گرفتار کیا اور پھر ایک مختصر سے معرکے کے بعد سلطان شاہ کو بازیاب کرا لیا گیا۔ مراد شریف نے ہماری تحویل میں خودکشی کرنے سے پہلے تفتیش کے دوران میں انکشاف کیا کہ بھارتی ایجنٹ کرشن کمار نیا چھور کے علاقے میں مسیح تربیت کا کیمپ چلا رہا تھا اور اب فرار ہو کر بھارتی علاقے سوناپاؤ کی طرف چلا گیا ہے۔ آئی بی کے جلال کا خیال تھا کہ ان کی سرکیولیٹ کے لیے ہمیں سرحد پار جانا چاہیے۔ میں نے اس پر کوئی رائے نہیں دی۔ اکرام الٰہی کی فائل میں مندرج دیگر افراد بھی اپنے انجام کو پہنچ رہے۔ اس دوران میں کرشن کمار کے آدمیوں نے حیدر آباد میں موجود ہماری کار کا تعاقب کیا اور ہمارے گھر تک رسائی حاصل کر لی۔ ایک رات انہوں نے ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا مگر اپنی بدقسمتی سے حیدر آباد کے رجسٹریشن والی کار سمیت ایک مردہ اور دو زندہ شکاروں کی صورت میں ہمارے ہاتھ آگئے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ کرشن کمار اب انڈیا نہیں گیا بلکہ پاکستان میں ہی موجود ہے اور ہماری رہائش گاہ دیکھ چکا ہے۔ ہم نے انہیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ کرشن ہمارے ٹھکانے سے واقف ہونے کے بعد ہم سے ضرور ٹکرائے گا۔ اسی امید کے تحت میں اور سلطان شاہ گھر سے باہر سڑکوں پر منڈلاتے رہے جب غیر متوقع طور پر وہ ہمارے گھر میں داخل ہوا اور ہوا کو یرغمال بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اسے اغوا کر کے ہمیں لاکھ ڈالر انعام حاصل کرنے کا خواہش مند تھا مگر میرا اپنی حاضر دماغی کے باعث اسے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی اور اسے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ ہمارے گھر پر شب خون کی کارروائی کے دوران میں استعمال ہونے والی کار کا رجسٹریشن شراب فروخت کرنے والی ایک کمپنی موہن اینڈ موہن کے نام پر تھا۔ کمپنی کا مالک عبدالیل کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ ہم نے اس کے گھر پر اس سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ حیدر آباد سے منتقل کاروباری معاملات اس کا بھائی روی دیکھتا ہے۔ ہم روی سے ملنا چاہتے تھے مگر وہ ہمیں چکل دے کر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم ہمارے تیور دیکھ کر روی کی خوب صورت بیوی ماروتی نے مجھے روی کی سلامتی اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے عوض کرشن کمار کا پتا بتا دیا۔ اس کی نشاندہی کے بعد کرشن کمار کا شکار بہت آسان ثابت ہوا۔ کرشن کمار کے بعد ہری چندیانی روپ گیا تھا کہ کراچی سے فرار تھا۔ وہ ہمیں حیدر آباد کے قریب ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہو کر ملا اور پوچھ گچھ کے دوران دلی میں موجود اغل بہسواس نامی بھارتی افسر کا نام بتا سکا۔ ہمیں بعد میں علم ہوا کہ اغل بہسواس نئی دہلی میں را کے پاکستان ونگ کا سربراہ تھا۔ اسی اثنا میں روی کے ملازم شیام کی مخبری کے باعث میجر بخشی ہمارے فرضی ناموں اور ٹیلی فون نمبر سے آگاہ ہو گیا۔ اس نے مظہر خان کو فون کر کے دھمکی دی۔ اس کو نہایت صفائی سے عقل و خرد سے بے گانہ کر کے بھارتیوں کے لئے بے مصرف کر دیا گیا۔ مجھے اب غزالہ کے ہمراہ بھارت روانہ ہو جانا تھا مگر ویرانے قاتل کر لیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گی۔ روی کو ہمارا ساتھ دینے کی سزا ملی اور اسے بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ ماسٹر نامی شخص کے آدمی مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ میرے مقابلے میں بہت بودے ثابت ہوئے اور کراچی سے باہر کے ویرانے میں واصل جہنم ہوئے۔ مجھے ان سے ماسٹر کا موبائل فون مل گیا۔ ماسٹر نے موبائل فون کے حوالے سے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا۔ مگر میوچل کارپوریشن کی ایک ملازمہ مجھی کے ذریعے ہم اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ وہ بھارتی قونصلیٹ کا ملازم تھا اور اس کا اصل نام جوگیندر پال تھا۔ ہم نے اس کی خواب گاہ تک رسائی حاصل کی اور وہاں محدود طاقت کا ریموٹ کنٹرول ہم نصب کر دیا۔ اب ہمیں جوگیندر پال کے گھر پہنچنے کا انتظار تھا۔

ب پ: زبردست واقعات ملاحظہ کیجیے

اول خان کی گاڑی شہر کی سڑکوں پر تیزی سے سفر کر رہی تھی اور میرا ذہن جوگیندر کی ذات میں الجھا ہوا تھا۔

Downloaded from https://paksociety.com

پچھلا دن طلوع ہوا تو ہمارے سامنے میجر بخشی کا نام تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس نے قلیل سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر کسی کو اپنا راز داں بنالیا ہوگا۔ جوگیندر پال اس کا خاموش اور بہت چالاک حلیف تھا۔ اس نے ہمیں ہوشیار ہونے کا کوئی موقع دیے بغیر اپنا وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ میجر بخشی کا انجام سامنے آنے کے بعد اس نے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ خاموشی سے اپنی کمین گاہ میں دبکا رہا۔ اپنے کرائے کے آدمیوں کو ان کاموں پر مامور کردیا جن کو پورا کرنے کی حسرت میجر بخشی کے دل میں رہ گئی تھی۔

جیکب گینڈے اور ارجن نے روی کو شہر کے ایک معروف اسپتال سے بہت مکاری سے اغوا کیا اور ٹھکانے لگادیا۔ ان دونوں نے اپنی دانست میں مجھے بھی تقریباً مار ہی لیا تھا لیکن میرے ستارے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ عین وقت پر ان کی بازی الٹ گئی اور میں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ صرف خود کو بچانے میں کامیابی حاصل کرلی بلکہ ان دونوں کو موت کے خونی جبڑوں میں دھکیل دیا۔

وہ سارے مرحلے طے ہونے تک جوگیندر پال کا نام پردے میں رہا۔ مجھے یا کسی اور کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کرائے کے قاتلوں کو میرے اور روی کے خون کی بو پر لگانے والا کون تھا پھر ایک سراغ ملا۔ ڈور کا سرا ہاتھ میں آنے کے بعد گتھی سلجھتی چلی گئی۔

افضل اور بچھی محض دو نام تھے۔ بے وقعت اور غیر اہم۔ ایک میونسپلٹی کا غریب کلرک تھا' دوسری اسی شہری ادارے کی معمولی سی بھنگن۔ ان دونوں نے ہمارے ساتھ مل کر ایسا کام دکھایا تھا کہ اس وقت جوگیندر حقیقت میں پانچ کلو طاقت والے بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے اپنے ذہن میں بچھی کی گفتگو ایک بار پھر تازہ کی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا مالک اپنے دفتر سے ڈھائی' تین بجے واپس آتا ہے۔ اسے کھانا دے کر وہ ہانڈی اور برتن وغیرہ صاف کرتی ہے اور وہاں سے روانہ ہوکر سورج ڈھلنے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

بچھی کی مہربانی سے میں جوگیندر کا گھر دیکھ چکا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں لڑھکی ہوئی اسکاچ کی بوتل سے اس کے فارغ اوقات کے مشغلے کا معاملہ بھی واضح ہوچکا تھا۔ میرے تصور میں اس گھر کا ایک نیا خاکہ سر ابھارنے لگا جس میں جوگیندر پال کپڑے وغیرہ بدلنے کے بعد' اپنی خواب گاہ میں مسہری پر دراز ہوکر ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک عادی اور پرانا شرابی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو خالی بوتل اس کے کمرے میں لڑھکی ہوئی نہ ملتی۔ قرینے سے کسی الماری یا خانے میں رکھی ہوئی ہوتی۔ میں اپنے تجربے اور دوسروں کے مشاہدے کی بنا پر اچھی طرح جانتا تھا کہ بے پروائی کا وہ دستور' عادی شرابیوں میں عام ہوتا ہے۔ وہ پیتے ہیں اور پھر پیتے ہی چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ غم نہیں ہوتا کہ بوتل کہاں پڑی ہے اور پیمانہ گلاس کہاں رہ گیا۔ نہ یہ یاد رہتا ہے کہ وہ پینے کے لیے جیتے ہیں یا جینے کے لیے پیتے ہیں۔ ان کا ہاتھ اسی وقت رکتا ہے جب پیندا صاف نظر آنے لگتا ہے اور ہر چیز وہیں رہ جاتی ہے جہاں وہ ہوتی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ دفتر سے واپسی پر بچھی' جوگیندر کو جو کھانا دیتی ہوگی' وہ اس کا لنچ ہوتا ہوگا۔ وہ سہارے کے لیے تھوڑا بہت کھالیتا ہوگا اور بچھی اپنے صاحب کے رات کے کھانے کا بندوبست کرکے چلی جاتی ہوگی۔ سرِشام وہ پینے کا سلسلہ شروع کرتا ہوگا۔ شاید اس کے دفتر کا کوئی ساتھی بھی اس کے پاس آجاتا ہو۔ صحیح معنوں میں وہ اپنی شکم سیری سے نوشی کے بعد ہی کرتا ہوگا۔

میری چشمِ تصور دیکھ رہی تھی کہ وہ مسہری پر لیٹا ٹیلی وژن کے ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ مشروب سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی بے خبری میں بارود کا ایک پیکٹ اس کی مسہری کے نیچے پہنچ چکا ہے۔

"چھ بج رہے ہیں... کب اسے فون کرو گے؟" ویرا کے اضطراری سوال نے مجھے تصورات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

میں نے سر جھٹک کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا "بس' صدر کے علاقے میں داخل ہوتے ہی نمبر ملالوں گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اول خان نے میری تائید کی "ریموٹ کنٹرول کی رینج پانچ کلومیٹر ہے۔ وہ یہاں سے بھی کام کرے گا مگر بہتر یہی ہے کہ اس کے گھر سے ہمارا فاصلہ کم سے کم ہو تاکہ بم پھٹنے کے بارے میں شک و شبے کی گنجائش نہ رہے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ اپنی ہر شام اپنے گھر پر ہی گزارتا ہو۔" سلطان شاہ نے پُرخیال لہجے میں زبان کھولی "وہ کوئی بڑا افسر ہے۔ سفارتی حلقوں میں آئے دن کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے۔ تم نے اپنے کام میں دیر کی تو

Downloaded from https://paksociety.com

ایسا نہ ہو کہ وہ گھر سے نکل جائے۔"

میں دل ہی دل میں سلطان شاہ کے ذہن کی رسائی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بہت پتے کی بات کہی تھی مگر مجھے پھر بھی تشویش نہیں تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک سے محفوظ' ایک خاموش اور تباہ کن بم جوگیندر پال کی مسہری کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ وہ گھر پر نہ ہوتا تو فون پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ہماری وہ بھاگ دوڑ ضائع ہوتی اور ہمیں بے نیل و مرام اپنے گھر لوٹ جانا پڑتا۔

ایسی کسی ناگہانی صورت حال میں جوگیندر پال کو چوبیس گھنٹوں کی چھوٹ مل جاتی۔ ہم اپنا وہی کام اگلے دن کے لیے ملتوی کرسکتے تھے۔ اس وقت سب کچھ بظاہر ہمارے اختیار میں تھا۔ ہم اسے اتنی چھوٹ نہ دینا چاہتے تو وہیں کہیں رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرسکتے تھے۔ یہ طے ہوچکا تھا کہ جب تک اس کی طرف سے فون پر جواب نہیں ملے گا' ریموٹ کنٹرول یونٹ کو نہیں چھیڑا جائے گا۔

وہ بات قابلِ فہم تھی۔ سلطان شاہ قائل ہوگیا۔ اس نے جلد از جلد صدر کے علاقے میں پہنچنے کے لیے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

صدر کی حدود شروع ہوتے ہی میں نے اپنا موبائل سنبھالا اور جوگیندر پال کا فون نمبر ملا ڈالا۔ یکھی کا بتایا ہوا وہ نمبر میں نے دل ہی دل میں اتنی بار دہرایا تھا کہ مجھے زبانی یاد ہوچکا تھا۔ سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے بزی ٹون سنائی دی اور میں نے لائن کاٹ دی۔

"فون بزی ہونے کا مطلب ہے کہ وہ گھر پر موجود ہے۔" سلطان شاہ نے رائے زنی کی۔

"یہ ضروری نہیں ہے۔" ویرا نے اپنا فرض گردانتے ہوئے اس کی تردید ضروری سمجھی "ہوسکتا ہے کہ اس کے بے لگام کتے نے منہ مار کر ریسیور یا پورا فون نیچے گرا دیا ہو۔ جب تک جوگیندر پال اپنے گھر نہیں لوٹے گا' فون بزی ہی ملتا رہے گا۔"

"ویرا پلیز!" اول خان کی آواز سے بے چینی مترشح تھی "ایسے کلمات زبان سے مت نکالو۔" ڈبنی وقفے وقفے سے کوششیں کرتا رہے گا۔ دو تین ناکامیوں کے بعد ہی ایسا کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ ابھی سے مایوسی مت پھیلاؤ۔"

جب اعصاب پر دباؤ زیادہ ہو تو انتظار کا ایک ایک لمحہ بھاری ہونے لگتا ہے۔ میں نے کوئی معقول وقفہ دیے بغیر دوبارہ کوشش کی اور اس مرتبہ بھی وہی بزی ٹون گنگنانے لگی اور میرے ذہن میں وسوسے سر ابھارنے لگے۔ اگر ویرا نے درمیان میں شرانگیزی نہ کی ہوتی تو یہ بات میں بھی سمجھ سکتا تھا کہ اگر جوگیندر اپنے فون پر کسی سے بات کررہا تھا تو اسے گفتگو کو اختتام تک پہنچانے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا لیکن اس وقت میری ذہنی رو بھی بہک گئی تھی۔ میں نے سلسلہ منقطع کرتے ہی ری ڈائل والا بٹن دبادیا۔ میری اس کوشش کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

میں نے کسی وقفے کے بغیر وہ عمل بار بار دہرانا شروع کردیا۔ جوگیندر کا فون مسلسل بزی تھا۔ اس وقت جو کیفیت میری تھی' شاید وہی سب کی تھی۔ کسی نے مجھے روکنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے تسلسل کے بجائے کچھ وقفہ دے کر جوگیندر سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ جلد از جلد اس خبیث سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو تاکہ اسے اس کے انجام تک پہنچایا جائے۔

جب گاڑی پی آئی ڈی سی ہاؤس سے اگلے پل پر سے گزر رہی تھی تو میں شاید دس مرتبہ رابطے میں ناکامی سے دوچار ہوچکا تھا۔ اگلی کوشش پر دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز سنتے ہی مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ میرے چہرے سے اس کا اظہار ہونے لگا۔ سلطان شاہ ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ دوسروں کی پر امید نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ سب خاموش تھے مگر میں نے پھر بھی فضا میں ہاتھ اٹھا کر انہیں اشارہ کرنا ضروری سمجھا۔

دوسری گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔ میں افضل کی تلاش کے سلسلے میں ایک بار جوگیندر پال کے موبائل پر اس سے بات کرچکا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کی آواز پہچان لی۔ اس وقت اس کی آواز خاصی نرم تھی۔

"ہیلو جوگی!" میں نے اس کے نام کا بے تکلفانہ استعمال کرتے ہوئے شستہ انگریزی میں اسے مخاطب کیا "کیا ہو رہا ہے؟"

"تم کون ہو...؟ کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟" دوسری طرف سے میرے سوال کو نظر انداز کرکے پوچھا گیا۔

"یہ تمہاری ذہانت کا امتحان ہے۔" میں نے خوش دلی سے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے!"

اول خان' سلطان شاہ کی طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں شاید اسے راستے کے بارے میں ہدایت دے رہا تھا۔ جوگیندر سے فون پر رابطہ ہونے کے بعد ہمارا جلد از جلد اس کے گھر کے قریب پہنچنا ضروری ہوگیا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ

Downloaded from https://paksociety.com

کس لمحے بھڑک کر فون کا سلسلہ منقطع کردیتا اور ریموٹ کنٹرول کے فوری استعمال کی ضرورت پیش آجاتی۔ اس نکتے کو محسوس کرتے ہوئے سلطان شاہ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

"بے تکلف ہونے کی کوشش مت کرو!" ریسیور سے جوگیندر پال کی آواز خشک غراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ "اگر مجھ سے بات کرنے کی ذرا بھی خواہش رکھتے ہو تو سب سے پہلے اپنا تعارف کراؤ ورنہ میں فون بند کردوں گا۔"

"شاید وقت نے تمہیں مغرور بنا دیا ہے ورنہ میں تمہارے لیے اتنا اجنبی نہیں ہوں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اجنبی نہ ہوتے تو تمہیں یہ ضرور معلوم ہوتا کہ میں جوگی کہلانا پسند نہیں کرتا۔ جو لوگ مجھ سے بے تکلف ہیں وہ مجھے پال کہتے ہیں۔ یہ میری پہلی' آخری اور فیصلہ کن وضاحت ہے۔ نام بتاؤ ورنہ میں فون بند کرتا ہوں۔"

"میرا نام کاواؤ نہیں چل سکا مگر میرا اصل مقصد پورا ہوچکا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے گھر میں بلکہ اپنی خواب گاہ میں موجود تھا۔ اس سے کسی قسم کی رازداری برتنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ موت کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس سے چند کھری باتیں کرنے کا موقع ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے خالی ہاتھ استعمال کرتے ہوئے' اپنی جیب سے ریموٹ کنٹرول یونٹ نکال لیا۔

"میں استاد جیکب کا باپ بول رہا ہوں۔ اسے تم نے کہاں بھیجا ہوا ہے؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

"مم..... میں کسی جیکب کو نہیں جانتا۔ اس کے کسی باپ کو جاننے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!" وہ لمحہ بھر کے لیے ہکلایا مگر پھر سنبھل گیا۔

"پھر تم ارجن' روی اور مظہر کو بھی جاننے سے انکار کردو گے؟" میں نے ایک ہی سانس میں اسے تین نام گنوا دیے۔

"تم نت نئے نام لے کر مجھے بلاوجہ ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم ان ناموں سے ہراساں ہوئے ہو۔ ان میں سے مظہر کے سوا سب جہنم واصل ہوچکے ہیں....."

"اوہ' تو کیا تم مظہر ہو؟" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی تحیر زدہ آواز ابھری "تم تو روی کے بہت بڑے سرپرست ہو۔"

میں کبھی کسی موذی کا سرپرست نہیں رہا۔ روی میرے کام آرہا تھا' میں اس سے کام لیتا رہا۔ تم نے اسے اسپتال سے اٹھا کر مروا دیا..... بہت اچھا کیا۔ زمین کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔ اپنا بدلہ لینے کے لیے وہ بے چینی سے وہاں تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

"تم ٹیلی فون پر گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔" میری دھمکی پر وہ مشتعل ہوگیا۔ "میں بخشی نہیں ہوں۔"

"یہ مجھے معلوم ہے کہ تم بخشی نہیں ہو اسی لیے بخشے نہیں جاؤ گے۔ وہ زندہ رہے گا مگر تم کو نہیں چھوڑا جائے گا۔ اب یہ بھی سن لو کہ میرا نام ڈینی ہے۔ میرا ہاتھ اس وقت تمہاری شہ رگ پر ہے....."

اس نے ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ مظہر نام کا کوئی نیا آدمی میدان میں اترتے ہی اتنی پھرتی نہیں دکھا سکتا۔ اس کے پردے میں کوئی پرانا پاپی چھپا ہوا ہے۔ اب تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔" وہ انگریزی بھول کر اردو پر اتر آیا تھا۔

"تم لولے ہوچکے ہو۔" میں نے بھی اردو میں زہریلی آواز میں جواب دیا "جیکب اور ارجن تمہارے داہنے اور بائیں ہاتھ تھے۔ وہ کاٹے جاچکے ہیں۔ تم اپنی بزدلی کی وجہ سے پردہ نشین ہو۔ کبھی کھلے مقابلے پر آنے کی غلطی نہیں کرو گے۔ اس لیے میں نے تمہارا دوسرا بندوبست کیا ہے۔ تمہارے گلے میں طوق پڑچکا ہے' نقارہ بجنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تمہارا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔"

"تم یہ مان رہے ہو کہ بخشی کسی حادثے کا نہیں' تمہاری درندگی کا شکار ہوا ہے؟"

"درندگی کا نشانہ تم بنو گے۔ اسے محبت سے گوش مالی کرکے چھوڑ دیا گیا ہے۔"

"تم میرے قریب آؤ گے تو تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ یہ حرکت تمہیں کتنی مہنگی پڑے گی۔"

"مجھے ہم جنسوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جنس مخالف کی تلاش میں رہتا ہوں۔ تم پر میں تمہاری بچھی کو ترجیح دوں گا۔ وہ کہاں ہے؟"

"میں سمجھ گیا..... میں خوب سمجھ رہا ہوں۔" اس کی اضطراری آواز ابھری "بچھی کا نام لے کر تم مجھے یہ جتانا چاہ رہے ہو کہ تم نے میرا گھر دیکھ لیا ہے اور میرے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہو مگر یاد رکھو کہ یہ باتیں تمہارے کسی کام نہیں آسکیں گی۔ تم میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکو گے۔"

اس سے گفتگو کے ساتھ ساتھ میری توجہ راستوں پر بھی

Downloaded from https://paksociety.com

مرکوز تھی۔ اول خان کی رہنمائی میں سلطان شاہ ڈرائیونگ کرتا ہوا جوگیندر پال کے گھر کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک موڑ کے بعد کسی بھی لمحے وہ پیلا مکان ہماری نظروں کے سامنے آسکتا تھا۔

"میرے قدم تمہیں پسند نہ آئے تو میں نئی دہلی کے اٹل بسواس سے سفارش کرالوں گا۔" میں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔

"تمہارا وقت قریب آگیا ہے۔" جوگیندر کی آواز سخت اور نیم ہذیانی ہوگئی "تم اپنی اوقات سے بہت زیادہ جان چکے ہو۔ میں دیکھوں گا کہ اب تم کتنی دیر زندہ رہتے ہو۔ اب یہ بخشی کا سونپا ہوا نہیں' میرا اپنا کام بن چکا ہے۔"

"تمہارا کام بنا نہیں بلکہ تمام ہونے والا ہے۔ ذرا سی ہمت کرو اور اپنی مسہری کے سرہانے کے نیچے جھانکو۔ مجھے بتاؤ کہ وہاں رکھا ہوا سیاہ چرمی پیکٹ کیا ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ خاموش ہے لیکن میری انگلی کے ذرا سے اشارے پر بول پڑے گا۔"

اس کی زبان سے مغلظات کا طوفان ابلا جو فوراً ہی معدوم ہوگیا۔ شاید وہ بوکھلاہٹ میں فون کا ریسیور پھینک کر اپنی مسہری کی طرف لپکا تھا۔ میرے ریسیور پر کچھ ناقابل فہم اور مبہم آوازیں آرہی تھیں جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ فون کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا اور جوگیندر پال اپنے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول یونٹ کے سرخ بٹن پر چڑھا ہوا شفاف پلاسٹک کا سخت خول انگوٹھے کے ناخن سے نکال دیا۔

میں نے وہ تیاری جان بوجھ کر کی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ اپنی مسہری کے نیچے سیاہ چرمی پیکٹ دریافت کرنے کے بعد جوگیندر بوکھلا کر فون پر واپس آتا لیکن یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں تھی کہ اس بھیانک خطرے کا ادراک کرتے ہی وہ پوری طاقت سے وہاں سے دوڑ لگا دیتا۔ میں اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہتا اور وہ دھماکے کی زد سے نکل جاتا۔

ریسیور پر نقل و حرکت کی آوازیں آنے کے باوجود میں نے چند ثانیوں سے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ میں سرخ بٹن دبانے والا تھا کہ ریسیور میں جوگیندر پال کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی "وہ کیا ہے؟ یہ پیکٹ میرے کمرے میں کیسے پہنچا؟"

وہ اس کا اضطراری سوال تھا۔ میں نے طنز سے کہا "مچھی سے پوچھ لو!"

"وہ چلی گئی۔ چار بجے چھٹی کرکے اپنے گھر چلی جاتی ہے۔" وہ فون پر بوکھلاہٹ ہانپ رہا تھا۔

"پھر اپنے کتے' ٹونی سے پوچھو!" میں نے استہزائیہ ہنسی کے ساتھ جواب دیا "اس پر تمہیں بہت ناز ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں تمہارے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ پھر وہ چرمی پیکٹ کس نے وہاں رکھا ہے۔ تم بہت عقل مند بن رہے ہو۔ سوچ کر جواب دو!"

"یہ اسی بچ' حرام زادی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ تم نے مچھی کو خرید لیا ہوگا.... بولو' تم کیا چاہتے ہو؟"

"مچھی کے بارے میں اپنی غلط فہمی دور کرلو۔ وہ بکنے والی نہیں ہے اور میں تمہاری موت کے سوا اب کچھ نہیں چاہتا۔"

گاڑی ایک خاص مقام پر رک گئی تھی۔ اس سے آگے جانا خطرناک تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی زرد اور تھکی تھکی روشنی میں جوگیندر پال کا پیلا مکان میرے لیے ایک آسیبی منظر پیش کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہاں ملبے کا ایک طوفان اٹھنے والا تھا۔ سلطان شاہ نے کسی بھی غیر متوقع صورت حال کا مقابلہ کرنے کے خیال سے گاڑی کا انجن بند نہیں کیا تھا۔

"نہیں!" اس کی آواز کانپ گئی "میں ابھی مرنا نہیں چاہتا' میں سمجھ گیا۔ پیکٹ میں کوئی آواز نہیں ہے۔ تم نے اس میں کوئی ریموٹ کنٹرولڈ بم چھپایا ہوا ہے.... دیکھو' ڈینی! میرے بھائی! میں تمہاری طرح جیتا جاگتا انسان ہوں۔ ابھی ابھی میری پتلون گندی ہوگئی۔ مجھے ایسی بے رحمی سے نہ مارو' مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"روی بھی تمہاری طرح جیتا جاگتا انسان تھا۔ تم نے اسے بے دردی سے مروا دیا۔ اب تم کس منہ سے اپنے لیے جان کی امان مانگ رہے ہو؟ تم اپنے کتے کے ساتھ ایک کتے کی موت مارے جاؤ گے' یہ فیصلہ اٹل ہے۔"

"میرے بھائی' میرے باپ!" ریسیور پر جوگیندر پال کی آواز رندھنے لگی "میں سمجھ چکا ہوں۔ اس بم کا ریموٹ کنٹرول تمہارے پاس ہوگا۔ تم جب چاہو گے' ایک بٹن دبا کر مجھے اڑا دو گے۔ مجھ پر رحم کرو' میں تم سے مصالحت چاہتا ہوں۔"

"تم روی کے ہی نہیں' استاد اور ارجن کے بھی قاتل ہو" میں نے سفاکانہ لہجے میں کہا "تم نے ان دونوں کو جانتے بوجھتے ہوئے ایسے خطرناک کام میں لگا دیا کہ وہ دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔ تمہارے سر کم از کم تین خون ہیں۔"

"روی کو ارجن نے مارا۔ ارجن اور جیکب کو تم نے

Downloaded from https://paksociety.com

مارا۔ میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔"

"شٹ اَپ! تم خونی درندے ہو۔ کلیدی رول تمہارا تھا۔ تم کو اپنے انجام کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے تھا۔"

وہ مذاکرات سنتے سنتے اول خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جوگیندر پال کی زندگی کے آخری سانس تھے۔ وہ ہم سے ہونے والی گفتگو کسی کو نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اول خان ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر دانت پیستے ہوئے غرایا "وقت برباد مت کرو۔ وہ تمہیں باتوں میں الجھا رہا ہے۔ بھاگ نکلا تو ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

اول خان کے وہ الفاظ میرے موبائل کے ماؤتھ پیس کے ذریعے جوگیندر پال کے کانوں تک پہنچ گئے اور اس نے تڑپ کر ملتجیانہ لہجے میں کہا "تم نے اپنا ہتھیار دکھا کر میرے فرار کا ہر راستہ مسدود کردیا ہے۔ میں بھاگتے ہی مارا جاؤں گا۔ مجھ سے ایسی حماقت کی توقع مت کرو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک مرتبہ میرے ساتھ بیٹھ کر روبہ روبات کرلو۔"

میں نے بہت تیزی سے بس لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ ہمارے لیے اس کی تجویز کی کوئی افادیت نہیں تھی۔ اس میں خطرات ہی خطرات مضمر تھے۔ اس وقت وہ بہت بری طرح ہمارے شکنجے میں آیا ہوا تھا۔ ذرا سے اشارے کے نتیجے میں اسے جہنم واصل کیا جاسکتا تھا۔ اس سے مل بیٹھنے کی کسی بھی کوشش کے نتیجے میں اسے وقت مل سکتا تھا۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کسی اور کو ہماری راہ پر لگا سکتا تھا۔

اس بارے میں ہم ایک بدترین تجربے سے گزر چکے تھے۔ ہم نے میجر بخشی کو اپنی دانست میں ذرا بھی مہلت نہیں دی تھی مگر وہ پھر بھی جوگیندر پال کو اعتماد میں لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہم ایسے کسی دوسرے جھٹکے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

"تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو' چپ کیوں ہو؟" موبائل پر قدرے توقف کے بعد جوگیندر پال کی پھنسی پھنسی اور دہشت زدہ آواز ابھری "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ سے مل کر تم فائدے میں رہو گے۔"

"ہم کبھی فائدے کی پروا نہیں کرتے۔ دشمن سے لڑتے ہوئے مرجائیں گے یا اسے ماردیں گے" میں نے سرد لہجے میں کہا "وہ سب یا ان کی بدروحیں تمہارا انتظار کررہی ہوں گی۔ اب تم کو جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی چیخ وپکار پر کوئی دھیان دیے بغیر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبادیا۔ کسی تاخیر کے بغیر فضا ایک خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ چند ثانیوں پہلے جہاں جوگیندر پال کا پیلا مکان تھا' وہاں صرف غبار' دھواں اور ملبے کے بڑے بڑے ٹکڑے اڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

دھماکے کے نتیجے میں قرب وجوار کی آبادی میں خوف وہراس پیدا ہونا یقینی تھا۔ وہاں رہنے والے کسی بھی لمحے اپنے گھروں سے باہر آسکتے تھے۔ ایسے میں ہمارا وہاں رک کر تماشا دیکھنا مناسب نہیں تھا۔ سلطان شاہ نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی آگے بڑھادی۔

طاقت ور بارودی بم کا دھماکا بہت شدید تھا۔ اس کی آواز دور دور تک سنی گئی تھی جس کے نتیجے میں خوف زدہ لوگوں نے بوکھلا کر اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلنا شروع کردیا تھا۔ خوف اور تجسس میں مبتلا' بھاگتے دوڑتے لوگوں کے درمیان ہماری گاڑی سست رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔ وہ علاقہ ہمارے لیے اجنبی تھا مگر سمتوں کے بارے میں سلطان شاہ کے اندازے سو فیصد درست نکلے۔ کچھ دیر تک متعدد گلیوں میں گھومنے اور موڑ کاٹنے کے بعد ہم دوبارہ جوگیندر پال کے مکان کے قریب جانکلے۔ وہاں پیلے مکان کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ دھماکے کے نتیجے میں پورا مکان اپنی بنیادوں سے اڑ گیا تھا۔ گرد وغبار کا طوفان ختم ہوچکا تھا اور جوگیندر کے گھر کی جگہ ملبے کا ایک اونچا ڈھیر عبرت کا نشان بنا ہوا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس ملبے کے گرد ایک ہجوم اکٹھا ہوچکا تھا۔

وہی واقعہ غریبوں کی کسی گنجان آبادی میں پیش آیا ہوتا تو وہاں جمع ہونے والوں کی تعداد دس گنا سے بھی زیادہ ہوتی۔ گرد دبتے ہی لوگ ملبے میں گھس پڑے ہوتے تاکہ کسی جاں بہ لب زخمی کو زندہ درگور ہونے سے بچاسکیں۔ مگر وہ آسودہ حال شہریوں کی بستی تھی جو ہر حال میں بس اپنی ذات میں کھوئے رہتے ہیں۔ کسی شخص کو کسی ناگہانی آفت میں گھرا ہوا دیکھ لیں تو سب سے پہلے' اشتباہ آمیز انداز میں اسی کا کوئی قصور دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو محتاط انداز میں زبانی کلامی ہمدردی کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی میں بے خوف وخطر حد سے بڑھ جانا' ان کے نزدیک احمقانہ فعل ہوتا ہے۔ وہاں جمع ہونے والے سب ہی تماشائی' چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

سلطان شاہ نے جائے حادثہ سے کچھ دور گاڑی روک دی۔ جوں ہی میں نیچے اترا' اول خان نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" میں نے سپاٹ لہجے میں اول

Downloaded from https://paksociety.com

خان سے سوال کیا۔

"وہیں جہاں تم جارہے ہو" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تمہیں اپنی کامیابی پر شبہ ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس ملبے میں جوگیندر اور اس کے کتے کے چیتھڑے ہی مل سکیں گے۔ ملبے میں اب کچھ بھی نہیں رہا۔"

"ایک سرسری نظر ڈال لینے میں کیا حرج ہے" میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

وہ واقعہ ایک بھری پری آبادی میں پیش آیا تھا۔ چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے حیران و پریشان تماشائیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سنا کہ وہ سب ہی کسی بم وغیرہ کے پھٹنے کے امکان پر تبادلہ خیال کررہے تھے۔

وہاں پھٹنے والے بم کا دھماکا اتنا طاقت ور اور شدید تھا کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ آواز گیس کی پائپ لائن پھٹنے یا بجلی کا شارٹ سرکٹ ہونے کی آوازوں سے یکسر مختلف تھی۔ کسی کا خیال تھا کہ مکان میں رکھا ہوا آتش گیر مادہ حادثاتی طور پر پھٹ گیا تھا' کوئی باہر سے بم پھینکے جانے کے امکان پر اظہار خیال کررہا تھا۔ بعض لوگ جو قریب کے رہنے والے تھے' جوگیندر سے واقفیت کی بنا پر یہ بھی کہتے ہوئے پائے گئے کہ اس گھر میں دہشت گردی کے لیے ہتھیار وغیرہ بنائے جاتے ہوں گے جو کسی بے احتیاطی کی وجہ سے ایک دھماکے کا شکار ہوگئے۔

دور سے میں حیران تھا کہ کسی نے بھی کنکریٹ اور آہنی سریوں کے ملبے میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن قریب سے ملبے کا جائزہ لینے کے بعد لوگوں کی اس لاتعلقی کا سبب بھی سمجھ میں آگیا۔ ایک دوسرے کے سہارے ٹکے ہوئے بیم اور ٹوٹے پھوٹے ستون بہت بھیانک حالت میں تھے اور کسی بھی لمحے نیچے گرسکتے تھے۔ کوئی ان کے درمیان پھنس کر اپنی جان گنوانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دوسرا اور شاید اہم تر سبب یہ تھا کہ ملبے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہاں سے کسی ذی روح کی کوئی خفیف ترین آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ اس سکوتِ مرگ سے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ دھماکے کے وقت وہ گھر خالی تھا اور اگر وہاں کوئی موجود تھا تو وہ دھماکے کے نتیجے میں راہی ملک عدم ہوچکا تھا۔ اس راستے پر جانے والے کسی کی مدد سے بالکل بے نیاز ہوجاتے ہیں۔

جوگیندر پال کے گھر کے ملبے اور وہاں جمع ہونے والوں کی آرا کا جائزہ لے کر ہم دونوں چند منٹ بعد گاڑی میں لوٹ آئے اور فوری طور پر ہمارا گھر کی طرف واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

"جوگیندر تمہارا سب سے آسان اور بے ضرر شکار ثابت ہوا" ویرا نے کچھ دیر بعد سکوت توڑا۔

"بخشی نے بھی تنگ نہیں کیا۔" اول خان نے کچھ کہنا چاہا مگر سلطان شاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دونوں میں بہت فرق ہے۔ بخشی زندہ ہے۔ جوگیندر پال موت کی بے رحم وادیوں میں پہنچ چکا ہے۔"

"وہ ہمارا فیصلہ تھا" میں نے اول خان کا ساتھ دیا "ہم چاہتے تو اسے ذبح بھی کرسکتے تھے۔"

"جوگیندر خوش نصیب تھا" ویرا بولی "اس کے حصے میں بہت آسان موت آئی ہے۔"

"مجبوری تھی" اول نے کہا "اگر ہم اسے وقت دیتے' اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے یا مارنے سے پہلے اسے اغوا ہی کرلیتے تو ہر طرف کھلبلی مچ جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ جوگیندر کو ہی موقع مل جاتا اور اس نے جو کچھ بخشی سے سنا تھا' اسے آگے بڑھادیتا۔"

ہم میں سے کوئی بھی اتنا کند ذہن نہیں تھا کہ اول خان کی کہی ہوئی بات کے مضمرات کو نہ سمجھ پاتا۔ کسی بڑی بحث کے آغاز سے پہلے وہ مسئلہ وہیں ختم ہوگیا۔ سب اپنے اپنے خیالات کی دنیا میں کھوگئے۔ میرے ذہن پر اس وقت صرف ایک ہی خیال سوار تھا کہ جوگیندر پال کے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر بھارتی کس ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پاکستانی حکام کس انداز میں اس کا سامنا کرتے ہیں۔

پس پردہ اسباب کتنے ہی گمبھیر اور سنگین رہے ہوں' سامنے کی بات یہ تھی کہ دو دنوں میں دو انتہائی اہم بھارتی سفارتی اہل کار ناقابلِ توجیہہ واقعات کا شکار ہوچکے تھے۔ میجر بخشی کی یادداشت جاتی رہی تھی اور جوگیندر پال مارا گیا تھا۔ دونوں واقعات پاکستان کی سرزمین پر اور کراچی کی شہری حدود میں رونما ہوئے تھے۔ ان پر بھارتیوں کا پھٹ پڑنا بعید از قیاس نہیں تھا۔

اول خان پہلے سے ان خدشات کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن میں نے اس نکتے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی' اس وقت کام کی گرمی میں مجھے محسوس ہورہا تھا کہ بات آسانی سے سنبھال لی جائے گی لیکن جوگیندر کا کام تمام ہونے کے بعد میرا ذہن تصورات سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آگیا تھا جو اتنی سہل نہیں تھی۔ بات اگر بخشی تک محدود رہتی تو بھارتی اسے شاید اتفاقی حادثہ سمجھ کر صبر کرلیتے لیکن جوگیندر کی موت کے بعد بخشی والے واقعے میں بھی جان پڑسکتی تھی۔ یہ سوال اٹھایا جاسکتا تھا کہ کراچی میں حادثات اور دہشت گردی کے

Downloaded from https://paksociety.com

واقعات صرف بھارتی سفارت کاروں کے ساتھ کیوں رونما ہو رہے تھے۔ بھارتیوں کو اس سوال کا مثبت اور منطقی جواب دیا جانا بہت ضروری تھا۔ اس میں ذرا سی بھی کوتاہی ہوتی تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔

سفارتی تلخی پیدا ہونے کے نتیجے میں بھارتی سرزمین پر بھی کوئی جوابی حادثہ یا واقعہ رونما ہو سکتا تھا جس کے بعد کشیدگی میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا۔ اس وقت ایسے تناؤ کا پیدا ہونا ہمارے لیے کسی بھی طرح سودمند نہیں تھا۔ ہمیں اپنے وطن کی سوندھی مٹی کو خیرباد کہہ کر دشمن کی سرزمین پر جانا تھا جہاں ہمارے چند بدترین دشمن چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ دشمن کے علاقے میں' اس کے خلاف کارروائی کے لیے وہ حالات کٹھن ثابت ہو سکتے تھے۔

ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں' ہم گھر پہنچ گئے جہاں چھت پر اول خان کے آدمی بدستور موجود تھے۔

"ماروتی بے چاری اب لنڈوری رہ گئی" گھر پہنچتے ہی ویرا کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی "وہ وقت بے وقت فون کر کے تمہارا سر کھاتی رہے گی اور تمہیں حیلوں بہانوں سے اپنے پاس بلاتی رہے گی۔"

"روی کے غائب ہونے کے بعد وہ بہت پریشان اور بدحواس تھی" میں نے سنجیدگی سے کہا "اس وقت تم نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو ایسے غیر ذمے دارانہ کلمات اپنی زبان سے نہ نکالتیں۔ وہ اپنے شوہر کو ٹوٹ کر چاہتی تھی۔"

ویرا نے لمحہ بھر کے لیے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا پھر مسکراتے ہوئے بولی "رومان زدہ اور چاہنے والی عورتیں شوہر سمیت' ہر مرد کو اسی طرح ٹوٹ کر چاہتی ہیں کہ وہ ان کا دیوانہ ہو جاتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ماروتی کے جادو سے اب تک کیسے محفوظ ہو۔"

"وہ اس وقت تمہیں کیوں یاد آ گئی؟" اول خان نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ قصہ روی سے چلا تھا۔ ہر واقعے میں اس کا کوئی نہ کوئی کردار تھا۔ ان واقعات کی آخری تان جو گیندر پال پر آ کر ٹوٹی ہے تو روی کا یاد آنا بھی ضروری ہے۔ ہم روی تک ماروتی کے ذریعے پہنچے تھے۔ میں اس بے چاری کو کبھی فراموش نہیں کروں گی۔ کبھی کبھی تو میرے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں کسی بہانے سے اس سے مل کر بیٹھوں اور دیکھوں کہ وہ اندر سے کیسی عورت ہے۔"

"بھول کر بھی ایسی کوشش نہ کرنا" اول خان نے تادیبی لہجے میں کہا "اس وقت وہی باہر کی عورت ہے جو یہاں کے فون نمبر سے واقف ہے۔ ڈینی کو بھی جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑانا ہوگا ورنہ وہ کسی بھی وقت بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ایک خوبصورت اور آزاد خیال عورت کسی کے لیے کیا خطرہ بن سکتی ہے؟"

"یہاں کا فون نمبر وہ کسی غلط آدمی کو بھی دے سکتی ہے۔ یہ نہ بھولو کہ ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جسے موقع ملا' وہ ہم پر مہلک وار کرنے سے نہیں چوکے گا۔ ماضی کے تلخ تجربات آج بھی تمہارے ذہن میں تازہ ہونے چاہئیں۔"

"تم کہتے ہو تو مانے لیتی ہوں ورنہ ماروتی مجھے ایسی عورت معلوم نہیں ہوتی۔"

اول خان نے ویرا کی بات کاٹ دی "میری بات مان لی تو اب یہ قصہ یہیں ختم کر دو۔ میں حامد سے بات کرنے جا رہا ہوں۔ وہ ہمارے مشن کے بارے میں فکر مند ہوگا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ سب کی دلچسپی کا موضوع تھا۔ اول خان نے کسل مندی سے کام لیا اور ریسیور اٹھانے کے بجائے اسپیکر فون پر اسٹیشن فور کا نمبر ملا لیا۔

رابطہ قائم ہو جانے پر اول خان نے اسے بتایا "مشن پورا ہو گیا۔ میں دوستوں کے ساتھ ہوں' تمہاری کیا خبریں ہیں؟"

"سر! مجھے حالات کی نزاکت کا احساس تھا۔ میں مشن میں کوئی خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لیے رابطہ نہیں کیا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے میرے پاس موہن ہاؤس کے بارے میں کچھ مشتبہ اطلاعات آ رہی ہیں جو میں۔"

"موہن ہاؤس!" اول خان نے چونک کر اس کی بات کاٹ دی "وہاں کی خبریں کون دے رہا ہے؟"

"سر! آپ بہت مصروف تھے۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر اپنا ایک آدمی وہاں مامور کر دیا تھا۔"

"بہت اچھا کیا لیکن تم نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی؟" اول خان نے تجسس لہجے میں پوچھا۔

"مجھے آپ نے بتایا تھا کہ روی کے غائب ہونے کے بعد اسپتال میں اور اس کے باہر کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔ مظہر خان بدترین حالات سے گزرے تھے۔ میں نے سوچا کہ عورت کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ کہیں اس پر کوئی وار نہ ہو جائے" حامد کی آواز بھرپور اعتماد سے عاری تھی جیسے اسے

Downloaded from https://paksociety.com

اول خان کی طرف سے اپنی کارروائی کی مکمل تائید کا یقین نہ ہو۔

"تم نے بہت صحیح فیصلہ کیا' میں دوسرے معاملات میں الجھ کر یہ پہلو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب بتاؤ کہ خبریں کیا ہیں؟"

"وہاں کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ملازمین بدحواس ہیں' کچھ دیر پہلے دو گاڑیاں وہاں سے نکل کر تیزی سے کہیں روانہ ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے آدمی کو عمارت کی نگرانی کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے گاڑیوں کا پیچھا نہیں کیا جاسکا۔"

"ملازمین سے کچھ معلوم نہیں ہوسکا؟" اول خان نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نو سر!" اسپیکر فون پر حامد کی آواز ابھری "چوکیدار گھبرایا ہوا ہے مگر اندر کے حالات سے بے خبر ہے۔ ویسے موہن ہاؤس سے جانے والی گاڑیاں عجلت میں روانہ ہوئی تھیں۔ دونوں میں کئی کئی افراد سوار تھے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اندر روی کی آخری رسوم کے لیے کافی مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

حامد کی رپورٹ سن کر میرا ذہن الجھ گیا۔ جگدیش موہن کی خودکشی کی تیسری رات آنے بھی نہ پائی تھی کہ سوگوار عورتوں کو گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ وہ بہت عجیب بلکہ ناقابلِ فہم سی اطلاع تھی جس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"تمہارا آدمی ابھی تک وہیں موجود ہوگا؟" اول خان میری الجھن سے بے خبر' حامد سے پوچھ رہا تھا۔

"یس سر! اس کے پاس اپریٹس بی ٹی نائن ہے" حامد کی طرف سے جواب آیا۔

"گڈ۔۔۔ ویری گڈ!" اول خان بے ساختہ بول پڑا "اس کا پاس ورڈ کیا ہے؟"

"برنی۔۔۔ وہ ہمارا قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ براہِ راست میرے رابطے میں ہے۔"

"اوکے! میں دیکھتا ہوں۔ اگر بی ٹی نائن یہاں موجود ہوا تو میں خود لائن پر آتا ہوں ورنہ تم میرے موبائل پر رپورٹ کروگے" اول خان نے اپنا فقرہ مکمل کرنے کے بعد فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

"میں نے بلاوجہ ماروتی کا نام نہیں لیا تھا۔ قدرت نے وہ خیال میرے ذہن میں ڈالا تھا" ویرا فوراً بول پڑی۔

"بات موہن ہاؤس کی ہورہی ہے" سلطان شاہ نے طنز سے کہا "ضروری نہیں کہ نئے قصے میں ماروتی کا ذکر شامل ہو۔"

"ذکر ہو یا نہ ہو' وہ بھی موہن ہاؤس کے مکینوں میں شامل ہے" ویرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

"تجسس میں مبتلا رہنے سے بہتر ہے کہ تم ماروتی کو فون کرلو" اول خان نے مجھے مشورہ دیا۔ "وہ خود تمہیں پوری بات بتادے گی۔ ویسے بھی کل اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد تم نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اب وہ بیوہ ہوچکی ہے' اسے تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

"ہمدردی کو بس ہمدردی تک رہنا چاہیے۔ اس سے تجاوز نہ کرنا" ویرا نے مجھے تاکید کی "وہ خطرناک بیوہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے آج صبح کے اخبارات آنے سے پہلے ہی روی کے قتل کی خبر مل گئی ہوگی۔ اب تک اسے صبر آجانا چاہیے۔"

میں نے اسے کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بس اسے گھور کر رہ گیا اور پھر موہن ہاؤس کا وہ نمبر ملانے لگا جس پر ماروتی سے براہِ راست بات ہوا کرتی تھی۔ فون کی دوسری گھنٹی پر میرے کانوں میں کسی نوجوان کی اداس سی مردانہ آواز آئی تو میں چونک پڑا۔

"ہیلو۔۔۔! کون بول رہا ہے؟ میں ماروتی سے بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے سنبھل کر کہا۔

"چچی نہیں ہیں' تم کون ہو؟" آواز میں رچی ہوئی اداسی گہری ہوگئی اور لہجہ کھردرا ہوگیا۔

اس کی زبان سے ماروتی کے لیے چچی کا لفظ سن کر مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ یقینی طور پر جگدیش موہن کا بیٹا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر بے دھڑک جواب دے ڈالا۔ "میں مظہر خان ہوں' روی کا دوست!"

"اپنے نام کی کوئی وضاحت مت کرو!" دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز یکایک جذباتی ہوگئی "میرا نام زریش موہن ہے۔ میں جگدیش موہن جی کا بیٹا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تمہارا نام ہمارے لیے ایک گالی بن چکا ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے دوسروں کی طرف دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے کان سے لگے ہوئے ریسیور میں آنے والی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچ گئی ہو۔ میرا وہ اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ سب کے چہروں سے اشتیاق اور تجسس جھلک رہا تھا۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" مفہوم پاجانے کے باوجود میں زریش کی پوری بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

"میں نے اپنا تعارف صرف اس لیے کرایا ہے کہ تم جان لو کہ میں اب موہن خاندان کا بڑا ہوں" اس بار اس کی

Downloaded from https://paksociety.com

آواز استہزائیہ اور دبی دبی سی تھی۔ وہ الفاظ چبا چبا کر بول رہا تھا "اپنے گھر کی عزت اور ناموس کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔ میں اس پر کوئی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر تم کو چچی سے ذرا بھی سچی یا جھوٹی محبت ہے تو اب بھول کر بھی موہن ہاؤس فون نہ کرنا۔ اسی میں ہماری اور تمہاری بھلائی ہے۔"

"تم کسی سنگین غلط فہمی میں مبتلا ہو' نریش! کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں۔ یہ سب۔۔۔"

"مجھے سب معلوم ہے مظہر خان!" نریش نے سخت مجروح لہجے میں میری بات کاٹ دی "کسی اور نے یہ کہا ہوتا تو میں بھی خود کو فریب دینے کے لیے' اسے جھوٹ کہہ کر اپنے دل اور ضمیر کو ہلکا رکھتا۔ دکھ اور صدمے کی بات یہ ہے کہ دو دن پہلے میں بہت چھوٹا ہوا کرتا تھا۔ اب اچانک سب سے بڑا بن گیا ہوں کیونکہ میرے بڑوں کو تم نہیں تو تمہارا نام نگل چکا ہے۔ بڑا بنتے ہی مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ سارے فساد کی جڑ تم ہو۔ یہ بات ہر شک اور شبے سے بالا ہے کیونکہ یہ سب چچی نے اپنے قلم سے لکھا ہے جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔"

میرے ذہن کو یکے بعد دیگرے جھٹکے لگ رہے تھے۔ نوجوان نریش کی باتیں بہت کڑوی اور زہریلی تھیں مگر ان باتوں نے میرے دماغ میں تجسس کی آگ بھڑکا دی تھی۔ نریش نے میرا نام سن کر فون بند کیا نہ میں نے اس کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر ریسیور رکھا۔ میں نے بہت نرمی سے کہا "آواز سے تم اس وقت دکھی معلوم ہو رہے ہو۔ تمہاری باتیں ذو معنی ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ماروتی کہاں ہے۔ اس سے میری بات کرادو۔"

"نہیں' مظہر خان! اب چچی تم سے کبھی بات نہیں کر سکے گی۔ یہ یاد رکھنا کہ تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ ہم کوئی گرے پڑے لوگ نہیں' خاندانی لوگ ہیں۔ اپنی عورتوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

نریش کے دماغ میں بھی وہی گھنڈ تھا جو اس کے باپ کی جان لے بیٹھا تھا۔ جگدیش کو غم تھا کہ ماروتی نے اس کا خاندانی غرور خاک میں ملا دیا تھا اور اسی صدمے میں اس نے خودکشی کر لی۔ نریش سے بھی کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

اس نے کھل کر کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ماروتی زندہ تھی اور کسی خوفناک خاندانی عذاب میں مبتلا ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا وہاں کہیں بھی ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے پر تعیش اور خوابناک کمرے میں جنم لینے والی کہانی سراسر ماروتی کی ضد اور جبر کا نتیجہ تھی۔ اس میں میرا اس کے سوا کوئی کردار نہیں تھا کہ ماروتی نے حالات کا فائدہ اٹھا کر بہت بے رحمی سے مجھے بلیک میل کیا تھا۔ میں اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کے سامنے سپر نہ ڈالتا تو کرشن کمار شاید کبھی ہمارے ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔

"بات نہ کراؤ۔ یہ تو بتا دو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" میں نے بہت تحمل سے کہا۔

"خواب آور دوا کی شیشی خالی پڑی ہوئی ہے۔ شاید پرچہ لکھنے کے بعد اس نے ساری گولیاں کھالیں" وہ غم زدہ آواز میں رک رک کر کہہ رہا تھا "ماں اوپر آئی تو وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ سب اس کی جان بچانے کے لیے اسے لے کر اسپتال بھاگے ہیں مگر میری آرزو ہے کہ چچی اب کبھی اس گھر میں زندہ نہ آسکے۔ اس کا لکھا ہوا پرچہ مجھے اس کے تکیے کے نیچے سے ملا ہے۔ وہ مر گئی تو میں پرچہ جلا دوں گا ورنہ۔۔۔ ورنہ میں کیا بتاؤں کہ کیا ہوگا۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ اندازہ لگا لو کہ میں کس دل سے تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"یہ سب اس طرح نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔" میں نے کہنا چاہا مگر اس نے درمیان سے میری بات کاٹ دی۔

"صفائی پیش مت کرو۔ نیچے مہمان بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے کل باپ کی چتا جلائی تھی' آج چچا کا کریا کرم کرنا ہے۔ دعا کرو کہ کل چچی کی ارتھی بھی اٹھ جائے تاکہ میری ہیٹ ٹرک مکمل ہو جائے۔ یہ یاد رکھو کہ مرنے والے جھوٹ نہیں بولا اور لکھا کرتے۔ چچی نے صاف لکھا ہے کہ میرے پتا کی ضد میں تم پہلی بار اس کی زندگی میں آئے۔ چچا کے قتل کی خبر ملنے کے بعد اس نے دسیوں بار تمہیں فون کیا اور تم سے بات کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ میرے چچا سے بہت محبت کرتی تھی مگر ساتھ ساتھ تم کو بھی چاہنے لگی تھی۔ ایسی عورتیں زندہ رہیں تو پورے خاندان والوں کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن جاتی ہیں۔ چچی ماروتی کا مرجانا ہی ہمارے اور اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ میری یہ بات یاد رکھنا کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم مجھے مل گئے اور میں نے تمہیں پہچان لیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پتا اور چچی نے خودکشی کی' چچا قتل ہوا' میں پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ ایسا شاید کبھی نہیں ہوا ہوگا کہ ایک گھر کے لوگوں نے مرنے کے لیے ایسے الگ الگ راستے ڈھونڈے ہوں۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"میں تمہارے دکھ اور صدمے کو سمجھ رہا ہوں" میں نے کسی اشتعال میں آئے بغیر کہا "تم نے تھوڑی دیر پہلے خط پڑھا ہوگا۔ ابھی جذباتی ہو رہے ہو مگر وقت ہر زخم کا بہت بڑا مرہم ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ میں بے قصور ہوں۔"

"اپنا قصور تم اس وقت سمجھو گے جب میں تمہاری گردن' دھڑ سے الگ کردوں گا" اس کی آواز میں عجیب سی سفاکی عود کر آئی۔ وہ کہہ رہا تھا "میرے لیے تم صرف ایک نام ہو۔ میرے سامنے تمہارا کوئی پتا' ٹھکانا یا فون نمبر نہیں ہے ورنہ میں آج اور اسی وقت تم پر ٹوٹ پڑتا۔ تم گندے مسلے... تم نے میری چچی کو پلید کیا' میں تمہاری مٹی پلید کردوں گا۔ تمہاری سادھی پر روز پیشاب کیا کروں گا۔"

میرے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آسکی۔ اس نے یک لخت ٹیلی فون بند کردیا۔

میرے ایک ایک لفظ پر ان سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ ان میں ویرا بھی تھی جو مجھے نیچا دکھانے کے ہر موقع کی تاک میں رہتی تھی اور غزالہ بھی جو میری بڑائی کے گن گاتی رہتی تھی۔ اگر وہ میری زبان سے کوئی غلط لفظ یا فقرہ سن لیتی تو یہ میں ہی سمجھ سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزرتی۔ میں نے نرمش سے گفتگو کے دوران الفاظ بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیے لیکن میرا لہجہ صورتِ حال کا تابع تھا۔ ویرا نے وہی ایک نکتہ پکڑلیا۔

"کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟ بہت مدافعانہ انداز میں تم بات کررہے تھے اس سے!"

"بھایا جی کا بڑا بیٹا' نرمش موہن تھا۔ بتا رہا تھا کہ ماروتی نے خودکشی کی۔"

میری زبان سے خودکشی کا لفظ سنتے ہی سب حیرت اور بے یقینی سے اپنی جگہوں سے اچھل پڑے اور اولِ خان نے بے اعتباری سے پوچھا "کیا واقعی اس نے خودکشی کرلی؟ تمہاری کسی بات سے تو ایسا ظاہر نہیں ہوا تھا۔"

"خودکشی کرلینے اور اس کی کوشش کرنے میں بڑا فرق ہے" میں نے زور دے کر کہا "ماروتی نے بھاری تعداد میں خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔ گھر والے اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئے ہیں مگر نرمش کو امید ہے کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔"

"خس کم جہاں پاک" ویرا بے ساختہ بولی "اب ہمیں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ کوئی ہمارے فون نمبر سے واقف ہے۔ ماروتی نے اپنے لیے انتہائی فلمی انداز کا انجام منتخب کیا ہے۔ یہ ایک بہت کامیاب المیہ کہانی ثابت ہوسکتی ہے۔ تمہارے یہاں کی عورتیں رلانے والی دل گداز فلموں پر جان دیتی ہیں۔ ماروتی پر فلم بنی تو مہینوں تک ہر شو ہاؤس فل جائے گا۔"

"ویرا!" غزالہ نے ملامت آمیز لہجے میں اسے مخاطب کیا "ایسی سنگ دل نہ بنو۔ شاید وہ بری عورت رہی ہو لیکن اس نے ہمارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اس نے کھلے دل سے ہمارا ساتھ دیا تھا۔"

"اس نے اچھا کیا یا برا کیا۔ یہ ایک راز ہے جس سے صرف ڈینی واقف ہے" غزالہ کی ملامت ویرا کی زبان نہ روک سکی۔ وہ غزالہ کو جواب دے کر میری طرف متوجہ ہوگئی "تم ایمان داری سے بلکہ حلفیہ بتاؤ کہ ماروتی سے تمہارے کیسے مراسم تھے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے" میں نے ہتھے سے اکھڑ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے اس پر آنکھیں نکالیں "مجھ سے غزالہ ایسے لہجے میں بات نہیں کرتی۔ تم اپنی حد سے تجاوز مت کرو۔ دماغ میں زیادہ کیڑے رینگ رہے ہیں تو جاکر ماروتی سے مل لو' ابھی وہ زندہ ہوگی۔"

ویرا نے میرے جواب کا برا ماننے کے بجائے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور بولی "تم میرے سوال پر بھڑک گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ میں سب کو یہی سمجھانا چاہ رہی تھی۔ اس سے آگے پوچھ گچھ کا حق مجھے نہیں' صرف غزالہ کو ہے۔ میں اسے..."

سلطان شاہ نے استہزائیہ انداز میں اس کی بات کاٹ دی "تم کو شرم آنی چاہیے۔ ہم ایک عورت کی موت و زیست کے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں اور تم قہقہے لگا رہی ہو۔ سنگ دلی اور سفاکی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم ان سرحدوں سے باہر نظر آرہی ہو۔"

"بالکل بجا ارشاد فرمایا آپ نے!" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "شاہ صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے امریکا کی سرحد سے باہر قدم نکالتے ہی ایسی تمام دقیانوسی باتوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اب میں ٹھوس حقائق کی دنیا میں رہتی ہوں اور ہر بات کو اسی میزان پر تولتی ہوں۔ ماروتی کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کی کوشش کرکے یہ ثابت کردیا کہ اس کے بارے میں میری رائے سو فیصد درست تھی۔ تم لوگوں کے طنز اور طعنوں کے باوجود' اب بھی میری دعا ہے کہ اس کی کوشش ضرور اور جلد از جلد کامیاب ہو۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"نریش کی بھی یہی خواہش ہے۔ وہ اپنی چچی سے بہت بدظن ہے" میں نے دھیرے سے کہا۔

"وہ اپنی چچی کو ہم سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی خواہش بے سبب نہیں ہوسکتی۔"

"وہ روی کو بے حد چاہتی تھی۔ اس کی موت کے بعد وہ تنہا اور بے آسرا رہ گئی" سلطان شاہ بولا "ایسی مہیب مایوسی کے عالم میں آدمی کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ ماروتی ایک کمزور عورت تھی۔ کسی کا کچھ بگاڑنے کے بجائے اپنی جان پر کھیل گئی۔"

"جگدیش اس سے شاکی تھا' نریش بھی اس سے بدظن ہے۔ تم لوگ اس کا سبب کیوں نہیں سوچتے؟"

وہ ویرا کا بہت گہرا اور کاٹ دار سوال تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ ماروتی کی چھوڑی ہوئی تحریر کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ میں نریش کے بتائے ہوئے متن کو کتنا بھی توڑ مروڑ لیتا۔ ویرا کی موجودگی میں میرا دامن بے داغ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے زہریلے تجزیوں سے محفوظ رہنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ اسے ماروتی کی تحریر کی ہوا بھی نہ لگنے دی جاتی۔

"ہم تمہاری طرح ذہنی پراگندگی کا شکار نہیں ہیں۔" سلطان شاہ باقاعدہ ماروتی کے دفاع پر تل گیا تھا "جگدیش اور نریش میں باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ دونوں خاندانی غرور کا شکار تھے' ماروتی سے ان کی نفرت کا سبب بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ وہ ان کے خاندان سے باہر کی' نیچی ذات والی عورت تھی۔ روی اسے اپنوں کے خلاف تحفظ فراہم کرتا تھا۔ وہ مرگیا تو ماروتی سے سایہ چھن گیا۔ روی کے بغیر وہ موہن فیملی میں سکھ سے نہیں رہ سکتی تھی۔ تاریک اور غیر یقینی مستقبل سے گھبرا کر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔"

اول خان کو اصل معاملے کی سن گن تھی۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا "تم سب بلاوجہ اس پر مغز کھپا رہے ہو۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ وہ زندہ رہتی ہے یا مر جاتی ہے' صبح تک ہر بات صاف ہوجائے گی۔ وہ ہمارے لیے زیادہ اہم نہیں تھی۔"

اول خان کا آخری فقرہ ٹیپ کا بند تھا۔ کسی نے ماروتی کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور میرے ذہن میں نریش موہن کے الفاظ گردش کرنے لگے۔ وہ تین دنوں میں اپنے تین عزیزوں کا کریا کرم کرکے ایک نئی خاندانی انفرادیت حاصل کرنے کا آرزومند تھا۔

میرے دل کے کسی گوشے میں بھی شدت سے یہ خواہش ابھری کہ ماروتی زندہ نہ بچ سکے۔ اس نے مرنے سے پہلے جو کچھ قلم بند کیا تھا' وہ اسے کبھی سر اٹھا کر جینے نہ دیتا۔ وہ مرجاتی تو ہمیشہ کے لیے اس کا بھرم رہ جاتا۔ اس کی تحریر ایک ناسور بن کر ہمیشہ کے لیے نریش موہن کے سینے میں دفن ہوجاتی۔

اول خان نے چلتی ہوئی گفتگو میں روڑا اٹکا دیا تھا۔ کچھ دیر تک کمرے میں غیر فطری سی خاموشی چھائی رہی۔ جب گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو بات گھوم پھر کر دوبارہ ماروتی اور اس کی سسرال والوں پر آگئی۔ اس بار سب کا لب ولہجہ نرم اور مفاہمانہ تھا۔ ویرا موقع کی نزاکت بھانپ کر اپنے مخالفانہ بلکہ مخاصمانہ رویے سے دستبردار ہوچکی تھی۔

"تمہارے پاس ایس ٹی ایف کے دو اپریٹس ہوں گے۔ ذرا وہ لے آؤ۔" اول خان نے فرمائش کی۔

سلطان شاہ کام کے معاملے میں کبھی کوئی حیل وحجت نہیں کرتا تھا۔ فوراً اٹھ کر اندر چل دیا۔ میں نے اسی وقت اندازہ لگالیا کہ اول خان ہم سب کو ماروتی کے بارے میں تذبذب کی کیفیت سے نکالنے کے لیے برٹی سے کچھ کام لینا چاہ رہا تھا۔

سلطان شاہ چند منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو چھوٹے ٹرانسمیٹرز موجود تھے۔ اول خان نے اس کے ہاتھ سے ایک اپریٹس لے لیا اور جائزہ لینے کے بعد اسے آن کردیا۔ وہ کافی دنوں سے استعمال میں نہیں آیا تھا مگر اس کی بیٹری کام کررہی تھی۔ آواز کھولنے پر ہمارے کانوں میں ہلکے ہلکے ریڈیائی شور کی آوازیں آتی رہیں۔ شاید حامد اور برٹی' دونوں ہی ستا رہے تھے۔

"الفا ... کالنگ برٹی... اوور!" اول خان نے اپریٹس کا بٹن دبا کر پیغام نشر کیا۔

"سر! میں لائن پر ہوں۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد حامد کی آواز آئی "موہن ہاؤس میں کافی مہمان بھرے ہوئے ہیں۔ برٹی وہاں اجنبی ہے۔ میں نے اسے صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے اندر بھیجا ہوا ہے۔ اس وقت اس کا اپریٹس آف ہے۔ واپس آکر وہ رپورٹ دے گا... اوور!"

"کوئی نئی خیر خبر؟" اول خان نے نہایت اختصار کے ساتھ سوال کیا۔

"نو سر!" حامد نے جواب دیا "برٹی کو سب کچھ عجیب اور پراسرار سا لگ رہا ہے... اوور!"

"کچھ بھی پراسرار نہیں ہے۔ اس گھر کی ایک عورت نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔ وہ اسے

Downloaded from https://paksociety.com

اسپتال لے گئے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اسپتال کی کیا خبر ہے۔ عورت کے زندہ بچنے کے کیا امکانات ہیں۔۔۔ اوور!"

"سر! یہ برٹی ہی بتا سکے گا۔ میں خود اس کی رپورٹ کا منتظر ہوں۔ اوور۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خود بھی اسٹینڈ بائی ہوں۔ اوور اینڈ آل۔" اول خان نے اپنی بات ختم کردی۔

"تم نے اچھا کیا۔" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "یہ تجسس ختم ہونا چاہیے۔ ہمیں موہن ہاؤس سے صحیح اطلاع مل سکتی ہے۔"

"میرے ذہن میں کوئی تجسس نہیں ہے۔" ویرا نے پھر ٹانگ اڑادی "بس اب ماروتی کے لیے دعائے خیر کرو۔"

میں کڑے تیوروں سے اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی' ایک ادا سے اپنی جگہ اٹھی اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف چل دی۔ ہم چاروں نے اندازہ لگالیا کہ جوگیندر والے کامیاب مشن سے واپسی کے بعد وہ اپنے ہونٹ تر کرنے کی ضرورت محسوس کررہی تھی جس کے لوازم اس کے کمرے میں موجود تھے۔

ہمیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی اپریٹس پر ایک اجنبی مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔

"برٹی کالنگ الفانسو۔۔۔ اوور!" اس پیغام کے جواب میں دوسری طرف سے حامد فوراً لائن پر آگیا۔

"سر! یہاں سخت خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موہن ہاؤس پر موت کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اندر ایک لاش تیار رکھی ہوئی ہے اور ذرا سی دیر پہلے اسپتال سے خبر آئی ہے کہ اسی گھر کی ماروتی نامی کوئی عورت بھی چل بسی ہے۔ اوور!" برٹی نے خبر حاصل کرنے میں کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے بتایا۔

"الفانسو ٹو الفا' سر! آپ نے برٹی کی رپورٹ سن لی ہوگی۔ اوور۔"

"کیا یہ خبر ابھی ابھی ملی ہے؟ اوور!" ماروتی کی موت کے لیے ہم سب ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھے لیکن برٹی کی دی ہوئی اطلاع پر بھی صدمے کا باعث بنی تھی۔ اول خان کو فوری طور پر کوئی معقول سوال نہیں سوجھ سکا۔

"میں اندر گیا تو مہمان انتظار اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ مجھے اتنا معلوم ہوا کہ ماروتی کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ میں جائزہ لے کر نکلنے کی تیاری کررہا تھا کہ اندر سے دوسری خبر آگئی۔ اسپتال سے کسی نے موہن ہاؤس فون کیا تھا۔۔۔ اوور۔"

"اندر رکھی ہوئی لاش کی کیا پوزیشن ہے۔ اوور!" اول خان نے پوچھا۔

"وہ تیار ہے۔ آنے والوں میں سخت اضطراب اور بے چینی ہے۔ لوگ سرگوشیاں کررہے ہیں کہ موت نے یہ گھر دیکھ لیا ہے۔ کل ایک موت ہوئی' دوسری لاش کے کریا کرم کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اب ماروتی مرگئی۔ ضعیف الاعتقاد اور وہمی مہمانوں نے ایک ایک کرکے کھسکنا شروع کردیا ہے۔ یہی رفتار رہی تو تھوڑی دیر بعد قریبی رشتے داروں کے سوا' وہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔ اوور!"

"بس' تمہارا کام پورا ہوگیا۔ واپس اسٹیشن فور لوٹ جاؤ۔ اوور اینڈ آل۔" اول خان نے ایک گہرا سانس لے کر اپنا اپریٹس آف کردیا۔

دنیا میں بھانت بھانت کی ہزاروں بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں وبائی امراض بھی ہوتے ہیں جو ایک سے دوسرے کو لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں' ہزاروں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیتے ہیں۔ ان وباؤں اور بیماریوں سے کوئی دہشت زدہ نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو لگتی ہیں اور کبھی کبھی اڑ کر لگتی ہیں مگر ان سے کوئی دہشت زدہ نہیں ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے کی مزاج پرسی اور عیادت کے لیے جاتے ہیں۔ مریض کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اطمینان سے لوٹ آتے ہیں۔

موت اس سے قطعی برعکس ہے۔ وہ چھوت کی کوئی بیماری نہیں ہے جو مردوں کو چھونے اور نہلانے یا میت کو کندھا دینے والوں کو لگ جائے لیکن یہ اٹل ضرور ہے۔ ہر وہ ذی روح جو پیدا ہوا ہے اور زندہ ہے' اسے ایک نہ ایک دن اور آخر کار مرنا ہے۔ کوئی ڈیڑھ دن میں زندگی کا یہ سفر طے کرلیتا ہے' کوئی ڈیڑھ سو برس بھی جیتا رہتا ہے مگر زندگی کے اس آخری موڑ سے سب ہی گھبراتے ہیں۔ موت کا ذکر آئے تو ان کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں' پیشانیاں عرق آلود ہوجاتی ہیں' جی گھبرانے لگتا ہے۔ موت کا ذکر ہورہا ہو تو ہر سننے والے کی دلی آرزو ہوتی ہے کہ موضوع جلد سے جلد بدل دیا جائے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے۔ یہ روگ ہر نفس کو اپنے چنگل میں لیتا ہے اور نگل جاتا ہے مگر پھر بھی موہن ہاؤس میں جمع ہونے والے' اپنے کمزور عقائد کی بنا پر موت سے خوف زدہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں تعزیت اور آخری رسوم میں شرکت کے لیے آنے والوں میں ہندوؤں کی کثرت ہوگی مگر ان میں مسلمان' عیسائی اور دوسرے عقیدوں کے لوگ بھی شامل رہے ہوں گے۔ ماروتی کی خودکشی نے ان

Downloaded from https://paksociety.com

سب میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ شاید اس وقت تک ان میں سے کسی کو بھنک بھی نہ ملی ہو کہ ماروتی نے خودکشی کی تھی۔ ان کے لیے یہی خوف کافی تھا کہ سوگ اور میت کے گھر میں ایک اور موت واقع ہوگئی تھی۔

ماروتی جیسی اور جو کچھ بھی رہی ہو' وہ روی سے محبت ضرور کرتی تھی۔ شاید وہ وفا کے مفہوم سے آشنا نہیں تھی اسی لیے جگدیش کو جلانے کی خاطر روی سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اس جیسی آزاد خیال عورتوں کے لیے وہ سب شاید ایسا ہی تھا جیسے شکم پری کے لیے کھانا کھالینا۔ جی چاہا تو گھر میں کھالیا' طبیعت مائل نہ ہوئی تو کسی بھی اچھے ہوٹل میں پیٹ بھرلیا۔ جرم اور ندامت کے کسی قابل ذکر احساس کے بغیر!

میرے لیے اس کا انجام بہت سبق آموز تھا۔ وہ واضح طور پر مکافاتِ عمل کا شکار ہوئی تھی۔ بھایا جی کی جھوٹی انا اور پندار کو خاک میں ملانے کے لیے اس نے خود کو لٹا دیا تھا اور پھر اپنے اس کارنامے کی تفصیل سنا کر جگدیش کے دل و دماغ پر نشتر زنی کی تھی' اسے چرکے لگا کر اتنا مشتعل کیا تھا کہ آخر کار اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا تھا۔ جگدیش کی خودکشی کی پوری ذمے داری ماروتی کے سر تھی۔ اس نے جگدیش کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور آخر کار خود بھی خودکشی کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور ہوگئی اس نے جس گڑھے میں جگدیش کو دھکیلا تھا' خود بھی منہ کے بل اسی میں جا گری تھی۔

وہ ایسے مذہب اور معاشرت سے تعلق رکھتی تھی جس میں بیوہ ہونے والی عورت کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ ایسی عورت کو زندہ و سلامت حالت میں اپنے شوہر کی چتا میں جلا کر راکھ کرنے کو مدتوں ستی کی قبیح مذہبی رسم کا درجہ حاصل رہا۔ وقت کے ساتھ ستی کی رسم معدوم ہوگئی مگر بیوہ عورت کو منحوس قرار دینے کا تصور بدستور راسخ تھا۔ ماروتی اس اعتبار سے خوش نصیب تھی کہ اس نے بیوگی کے لمبے دن نہیں گزارے تھے۔ وہ برسوں کی سہاگن تھی۔ بس چند گھنٹوں کے لیے بیوہ ہوئی اور پھر مرگئی۔ اپنے شوہر کی ارتھی اٹھائے جانے سے پہلے اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ اب غالب امکان یہی تھا کہ دونوں کی ارتھیاں ساتھ اٹھائی جاتیں' دونوں کی چتا ساتھ تیار کی جاتی اور دونوں کی راکھ ایک ساتھ سمیٹی جاتی۔ شوہر کے ساتھ ستی نہ ہونے کے باوجود ماروتی نے اپنے روی کی موت پر جان دے کر نئے عہد کی ایک تاریخ رقم کی تھی۔ جسے کوئی بھی واقف حال نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

"تم کالی زبان ہو۔" سلطان شاہ افسردہ لہجے میں ویرا سے کہہ رہا تھا "جو کہتی ہو' ہوجاتا ہے۔"

"میں تمہاری طرح خوش فہم نہیں ہوں۔ حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتی ہوں پھر اس پر جم جاتی ہوں۔" ویرا نے سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر بکھیرتے ہوئے کہا "میں خاموش رہتی تب بھی ماروتی کا انجام یہی ہونا تھا۔ چاہ کن را چاہ درپیش! یہ کہاوت تمہاری ہی ہے۔"

"پھر تو تمہارا انجام بھی بہ خیر نظر نہیں آتا۔ تمہارے ہاتھ نہ جانے کس کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔" اس نے اپنے چہرے پر آیا ہوا دھواں دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے' برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

ویرا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ہم سب نے بہت سے لوگوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ غزالہ نے بھی انگلینڈ میں انسانی خون کی خوب ہولی کھیلی تھی۔ یہ ڈینی کے لیے ایک چھلاوا بن گئی تھی۔ اس کے پہنچنے سے پہلے سب کچھ برباد کرکے کہیں اور نکل جاتی تھی۔" اتنی بات کہہ کر وہ یکایک سنجیدہ ہوگئی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میری زندگی کا ابتدائی حصہ مجرموں میں گزرا مگر انسان کے خون کی حرمت سے کبھی بے خبر نہیں رہی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی بے گناہ میرے ہاتھوں مارا گیا ہو۔ شی کے فیصلوں سے سرکشی اور سرتابی کرنے والے خونی بدمعاش ہوتے تھے اور وہ مارے جاتے تھے۔ بعد کی باتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والوں میں سے کوئی بھی جگدیش موہن جیسا بے گناہ نہیں تھا۔ اسی لیے ہم پنپ رہے ہیں۔ یہ خونِ ناحق ہوتا ہے جو اپنا رنگ دکھاتا ہے اور سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

"جگدیش اتنا معصوم نہیں تھا کہ تم سے ایک مثال بنالو۔" سلطان شاہ آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "تم یہ بات بھول رہی ہو کہ بعض اوقات زبان کا زخم تلوار کے گھاؤ سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ماروتی نہ جانے کب سے اس کے طنز اور طعنے سہہ رہی تھی' اس کی دشنام طرازیاں برداشت کررہی تھی۔ ماروتی نے اس کے سینے میں خنجر نہیں بھونکا تھا۔ اس کی بدزبانی اور بدکلامی کا اپنی زبان سے جواب دیا تھا۔ وہ عورت اتنی مضبوط بھی کہ عمر بھر ظلم سہتی رہی۔ جگدیش اتنا بودا نکلا کہ ماروتی کا ایک وار نہ سہہ سکا۔ بزدلی سے خود کو گولی ماردی!"

میں مہر بہ لب بیٹھا رہا۔ بہتیری تھا کہ وہ دونوں آپس میں نمٹتے رہیں۔ میں بولتا تو بات بہت زیادہ الجھ سکتی تھی۔ ویرا کو

Downloaded from https://paksociety.com

کچھ شبہات ضرور تھے مگر ان دونوں میں سے کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ ماروتی نے جب بھایا جی کے سامنے زبان کھولی تو اسے کھوکھلے الفاظ کی مار نہیں دی تھی۔ ماروتی کا عمل اور بے وفائی کا ایک سفاکانہ تجربہ ان الفاظ کی پشت پناہی کررہا تھا۔

ماروتی کا واقعہ کچھ ایسا عجیب اور دل دوز تھا کہ اس کے بارے میں خبر سنتے ہی ہم سب جوگیندر پال کے تازہ واقعے کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہم نے اس شام کچھ بھی نہ کیا ہو۔ بس بیٹھے ماروتی کی موت کی خبر کا انتظار کرتے رہے ہوں۔

وہ تسلسل اس وقت ٹوٹا جب فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے جلال بول رہا تھا۔

"اوہو... جلال! تم کہاں غائب ہو؟" میں نے اس کی آواز سنتے ہی خوش دلی سے کہا "اس وقت میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا کوئی خاص بات تھی؟" میرے کانوں میں اس کی سنجیدہ اور متجسس آواز آئی۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"مگر میں نے خاص وجہ سے فون کیا ہے۔ کراچی میں اچانک لاشوں کی برسات کیوں شروع ہوگئی ہے؟"

"جرائم پیشہ عناصر کی سرگرمیاں زور پکڑ جائیں تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

"گول مول جواب سے کام نہیں چلے گا۔" اس کی آواز تفکر آمیز تھی "شہر میں امن و امان کے حالات بہت بہتر ہیں۔ کوئی گروپ کسی کے خلاف محاذ آرا نہیں ہے۔ ایک مخصوص حلقے کے لوگ مارے جارہے ہیں۔ میں ان کڑیوں کو یک جا کرنے سے قاصر ہوں۔"

"تم کن لوگوں کے حوالے سے بات کررہے ہو؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"کرشن کمار، ہری چند اور میجر بخشی تک سب ٹھیک تھا۔ تم سے جگدیش موہن کی خودکشی کے بارے میں بات ہوئی تھی مگر کل رات اس کے بھائی روی موہن کی لاش ملی ہے..." اس کی آواز میں شکوہ پنہاں تھا جیسے اسے ہم پر کوئی شبہ ہو۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مخصوص حلقے سے اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ جگدیش کے بعد روی بھی مارا گیا تو یقین رکھو کہ ان معاملات میں ہمارے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ جگدیش کی خودکشی اس کا گھریلو معاملہ تھا۔ روی کو جوگیندر پال نے مروایا ہے..."

اس بار جلال نے مضطربانہ انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟ اس وقت میں جوگیندر کے بارے میں ہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم اس تک کیسے پہنچ گئے۔ شہر میں یہ سب کیا ہورہا ہے؟"

"پہلے تمہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ ہمیں تمہاری سرکاری دشواریوں کا پورا پورا احساس ہے۔ ہم کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر کسی حساس معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا تمہیں جوگیندر پال کے انجام کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے؟"

"ذہبی! میں یہ سب جانتا ہوں۔ مجھے تم لوگوں پر پورا اعتماد ہے لیکن میں بہت سے لوگوں کو جواب دہ ہوں۔ بخشی اور جوگیندر پال پس پردہ رہ کر کام کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے بارے میں ہمارے پاس اطلاعات تھیں، کوئی ثبوت نہیں تھا۔ نگرانی کی کوششیں بھی بار آور ثابت نہیں ہوسکی تھیں۔ اب اچانک خبر ملی ہے کہ اسے اس کے گھر میں بم پھینک کر اڑا دیا گیا۔ یہ اطلاع انڈین ہائی کمشنر کے احتجاج سے ملی ہے۔ اس نے فارن سیکریٹری کو فون کیا تھا۔"

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور حیرت سے کہا "یہ واقعہ چھ بج کر چند منٹ پر رونما ہوا تھا۔ ابھی سات بھی نہیں بجے اور اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہائی کمشنر نے احتجاج داغ دیا۔ کیا ان کی یہ کارکردگی حیران کن نہیں ہے۔"

"قطعی نہیں۔" جلال کی آواز پر یقین تھی "ہر سفارت خانے کا اپنا سیکیورٹی نیٹ ورک ہوتا ہے۔ اہم عہدے داروں کی حفاظت کے لیے دن رات ان کی نگرانی کرائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جوگیندر پال کی دیکھ بھال کرنے والے محافظ نے دھماکا ہوتے ہی اپنے بڑوں کو خبر پہنچادی ہو۔ مجھے اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہے۔ تشویش یہ ہے کہ اب ہم کیا لائن آف ایکشن اختیار کریں؟"

چند روز پہلے اسلام آباد میں بم کا ایک دھماکا ہوا تھا۔ کئی آدمی مارے گئے تھے۔ ہم نے کیا کرلیا؟ اتفاق ہے کہ اس بار جوگیندر پال ایک دھماکے کا نشانہ بنا ہے۔ اس پر ہم ہمدردی اور افسوس کے اظہار کے سوا کیا کرسکتے ہیں؟"

"دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ میں بہت فرق ہوتا ہے ذہبی! جوگیندر پال کے گھر کو ٹاک کر نشانہ بنایا گیا ہے۔ تمہارے لب و لہجے سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ تم اس

Downloaded from https://paksociety.com

ے میں اور کچھ بھی جانتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیسے
۔ اس جیسا محتاط آدمی کس کی نظروں میں آگیا۔"

"یہ میجر بخشی والے واقعے کا تسلسل ہے۔ جوگیندر کو
ی طرح پتا چل گیا کہ روی شہر کے کس اسپتال میں چھپا ہوا
ے۔ اس نے کرائے کے دو آدمیوں کو وہاں بھیجا اور انہوں
نے میرے نام کا دھوکا دے کر روی کو اغوا کرلیا' اسے مارنے
ے بعد وہ دونوں اسی اسپتال سے واپسی پر مجھے گھیرنے میں
یاب ہوگئے۔ میں کل شام موت کے منہ میں جانے سے
ں بال بچا ہوں۔ وہ مجھے شہر سے دور ایک ویرانے میں لے
ئے تھے اور مجھے مار دینے....."

"لانڈھی سے آگے' ایک ویران اور غیر آباد علاقے
ے درندوں کی نوچی ہوئی دو لاشیں ملی ہیں۔ کیا وہ بھی اسی
سلے کی کڑیاں تھیں؟" اس نے تحیر زدہ آواز میں میری بات
میان سے اچک لی۔ "بگڑ جانے کی وجہ سے وہ دونوں لاشیں
ی تک شناخت نہیں ہو سکی ہیں۔"

"ان میں سے ایک کا نام جیکب گینڈا عرف استاد ہے۔
سرا ارجن ہے۔ آخری لمحات پر ان کے ستاروں نے ان کا
اتھ نہ چھوڑا ہوتا تو ان کے بجائے وہاں سے میری بگڑی
ئی لاش ملتی۔ انہوں نے میرے چہرے کو اتنی بے رحمی سے
ندو کا نشانہ بنایا کہ میری صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید
ں کئی دن تک بھارت کے لئے روانہ ہونے کے قابل نہ ہو
لوں۔ جوگیندر نے میرا پورا بندوبست کیا تھا۔" میں نے
پاٹ لہجے میں اسے بتایا۔

شہر میں کوئی نئی لہر نہیں چلی۔ چاروں واقعات ایک ہی
سلسلے میں جڑے ہوئے ہیں" جلال کی آواز سے اطمینان
ھلک رہا تھا "مجھے غصہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کراچی
ں انٹیلی جنس بیورو والے سو رہے ہوں۔ انہیں سرپیر کا کچھ
م نہیں تھا۔ مجھے یہ سن کر صدمہ ہوا کہ انہوں نے تمہارے
اتھ بدسلوکی کی۔ چہرے پر کوئی گہرا زخم تو نہیں آیا؟"

زخم کوئی نہیں ہے' نیل پڑے ہیں۔ کچھ خراشیں آئی
ں اور ورم ہے۔ بس چہرہ بگڑا ہوا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا
نہیں نے جان بوجھ کر وہ مار کھائی تھی۔ ایسے چہرے کے ساتھ
فر کیا تو میں ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بن کر رہ جاؤں گا۔"

"جوگیندر والے واقعے کی تفصیلات بتاؤ۔ وہ تمہارے
امنے کیسے آگیا؟" جلال نے دوبارہ جوگیندر کا ذکر چھیڑ دیا۔

"وہ خود ختم ٹھونک کر میدان میں نہیں اترا تھا" اس تک
پہنچنے میں ہمیں دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ مجھے گمان تک نہیں تھا
کہ آخری سرے پر اس سے سامنا ہوگا۔ پس ہم چھان پٹن
کر رہے تھے ایک بھنگن کی مدد سے اس کا نام سامنے آیا تو
ہمارے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے موقع
ضائع کیے بغیر اس کے گھر میں ریموٹ کنٹرولڈ بم نصب کر دیا
تاکہ اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے معاملہ نمٹ جائے۔"

اپنی تمام تر تشویش کے باوجود جلال اس معاملے
میں دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔ بھنگن کے ذریعے عقدہ کشائی کی
بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ میری متعدد وضاحتوں کے
بعد پورے حالات اس کی سمجھ میں آئے تو وہ قائل ہو چکا تھا
کہ میں نے جو فیصلہ کیا۔ اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش
نہیں تھی۔ جوگیندر پال کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تو وہ میرے لیے
زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا یہ فائدہ حاصل
تھا کہ اسے مقامی مجرموں کا تعاون حاصل تھا۔ استاد جیکب
اور ارجن کی موت کی خبر ملنے کے بعد وہ ہمارے خلاف کسی
اور کو میدان میں اتار سکتا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ سرکاری سطح پر جوگیندر پال کی موت کے
ردِعمل کا کس طرح سامنا کیا جائے۔

جب تک جلال بے خبر تھا' قدرے برہم اور مایوس تھا
لیکن تیزی سے رونما ہونے والے واقعات کے الجھاؤ سے
آگاہ ہونے کے بعد وہ میری اس رائے سے متفق ہو چکا تھا کہ
اس واقعے پر گول مول اور معذرت خواہانہ رویہ ہی وقت کا
تقاضا تھا۔ اگر وہ لوگ اپنی سرزمین پر کسی اشتعال کے بغیر کوئی
جوابی کارروائی کرتے تو اسے روکنا ناممکن تھا۔ جلال اس
بارے میں پوری طرح پر یقین تھا کہ ان دنوں بھارتی سرزمین
پر کوئی پاکستانی خفیہ مشن مصروف نہیں تھا اور نہ ہی کوئی
پاکستانی سیکرٹ ایجنٹ کشت وخون کے کسی اندیشے سے دوچار
تھا۔ اس کے باوجود بھارتی کوئی حرکت کر گزرتے تو وہ مجبوری
تھی۔

"اس بارے میں دوسروں' خاص طور پر امریکیوں کا کیا
ردِعمل ہے؟" ایک طویل مذاکرے کے بعد میں نے جلال
سے پوچھا۔

"کوئی سرکاری طور پر ایسے واقعات کی حمایت اور
سرپرستی نہیں کر سکتا۔ ہم بھی اس واقعے کی بھرپور مذمت
کریں گے۔ ابھی تازہ ترین واقعہ ہے۔ وقت گزرنے کے
ساتھ دوسروں کا ردِعمل سامنے آئے گا۔ شاید امریکیوں کا
رویہ زیادہ سخت ہوگا۔"

"وہ کینہ پرور ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "وہ بوب
رافیل والا قصہ برسوں تک نہ بھول سکیں گے اس کی رہائی
کے لیے امریکی صدر کو بہت خفت اور سبکی اٹھانی پڑی تھی۔

Downloaded from https://paksociety.com

جی اور ڈیوڈ کے معاملے میں بھی ان کا وہ بغض کار فرما رہا۔ سخت پاکستانی جواب نے انہیں اور بھڑکا دیا ہوگا۔"

"پاکستان کا جوابی مراسلہ ایک شاہکار ہے۔ سارے سفارتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے حقائق قلم بند کیے گئے ہیں کہ امریکی ناچ اٹھے ہوں گے۔ یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ بعض امریکی اہلکاروں کی غیر ذمے داری' نا اہلی اور اپنی حدود سے تجاوز کی وجہ سے بے چارہ امریکی صدر رات کو اپنی مرضی کی نیند نہیں لے سکتا۔ اسے ایسے بے ہودہ افسروں کی کھال بچانے کے لیے نا وقت اپنے آرام دہ بستر سے نکل کر دوسرے سربراہانِ مملکت کو فون کرنا پڑتا ہے۔"

"یہ واقعی ہمت کا کام ہے۔" میں نے ستائشی لہجے میں اعتراف کیا "امریکی صدر نے فون پر زبانی گفتگو کر کے وہ قصہ نمٹایا تھا۔ مراسلے کے ذریعے اس واقعے کو ریکارڈ کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ وہ ضرور تلملا اٹھے ہوں گے اور جوگیندر پال کے واقعے پر اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اعلیٰ سطح پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہم کچھ بھی کرلیں' آنے والے چند سالوں تک امریکی سرد مہری برقرار رہے گی۔ امریکیوں کی اصل برہمی ہمارے جوہری اور دفاعی منصوبوں پر ہے وہ انہیں غیر پیداواری' غیر فلاحی اور بے مصرف قرار دیتا ہے۔ وہ لوگ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی ہماری مخالفت کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان سے کسی فلاح کی امید رکھنا بے سود ہے۔"

"بات ہماری مخالفت پر ختم نہیں ہوجاتی۔ وہ ہمارے سب سے بڑے حریف کے حامی' مددگار اور ہم نوا بنے ہوئے ہیں۔"

"جس دن ہمارے اس حریف کے حوصلے پست ہوگئے' بہت کچھ سنور جائے گا۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تم نے بھارت جانے کا ارادہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا ہے۔ میں نے تمہاری روانگی سے بہت سی اور امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں۔"

"مجبوری ہے۔ میں ہوش میں تھا اور مصلحت کی وجہ سے ان دونوں کے تھپڑ کھا رہا تھا۔ تم میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"ایسے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ میں خود بھی تمہیں بھارت جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" جلال نے جلدی سے کہا "مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم کب تک لاہور آنے کے قابل ہوسکو گے۔ میں اپنی مصروفیات اسی حساب سے آگے پیچھے کرلوں گا۔"

"میں اب بھی سفر کے قابل ہوں۔" میں نے زور دے کر کہا "بھارت میں لوگ حیرت سے میرے زخمی چہرے کی طرف دیکھیں گے۔ لاہور اپنا شہر ہے۔ وہاں مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ میں کل ہی وہاں پہنچ جاؤں۔"

"کل کس وقت پہنچ رہے ہو؟" اس نے مسرت آمیز لہجے میں سوال کیا "میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے دیتا ہوں۔"

"یہ میرا طے شدہ پروگرام نہیں ہے۔ جب موڈ ہوا' لاہور پہنچ جاؤں گا۔ کسی کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ اول خان کا خیال ہے کہ میں کراچی میں بیٹھ کر اپنا چہرہ سدھرنے کا انتظار کرتا رہا تو کسی نہ کسی معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا رہوں گا۔ مجھے یہ وقت لاہور میں ہی گزارنا چاہیے۔"

"بالکل آجاؤ۔" اس کی آواز فراخ دلانہ تھی "اس طرح کام سکون سے اور زیادہ بہتر انداز میں ہوجائے گا۔ بیوی کو بھی ساتھ لانے کا ارادہ ہے یا پروگرام میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟"

"تبدیلی ہوئی ہے۔ بیوی کے ساتھ ویرا بھی آرہی ہے۔ اب ہم تین افراد جائیں گے۔"

"میں نے اس کا بہت ذکر سنا ہے۔ اس کے قصے بہت سے پاکستانیوں کو شرمسار کرسکتے ہیں۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہوجائے گی۔"

"اس سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔ وہ ایسی بری عورت نہیں ہے۔" میں کن انکھیوں سے ویرا کی طرف دیکھتے ہوئے ایسا گول مول جواب دیا کہ جلال کو کسی بے ربطی کا احساس نہ ہو مگر ویرا تذبذب میں پڑ جائے کہ جلال نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے۔

"تم دشمنوں کی بھیڑ میں گھسنے جارہے ہو۔ یہ دیکھ لینا کہ ان دونوں کی وجہ سے تمہاری الجھنوں میں اضافہ نہ ہوجائے۔ دشمن کم ظرف ہو تو عورت بہت بڑی کمزوری اور مجبوری بن جاتی ہے۔ کوئی عورت کتنی ہی دلیر کیوں نہ ہو' آخر عورت ہی ہوتی ہے۔"

"یہ بات میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ تم لاہور آؤ گے تو اپنی سی کوشش بھی کرلینا۔"

"ٹھیک ہے۔ پروگرام طے ہوجائے تو مجھے فون پر آگاہ کردینا۔" گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہوگیا۔

Downloaded from https://paksociety.com

جلال سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ مجھے دہشت گردوں کی طرف سے بدترین ردعمل کی توقع تھی۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ میرے اندازے سے کم تھا۔

○☆○

جوگیندر پال کی موت اور ماروتی کی خودکشی کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک مدت سے رونما ہونے والے واقعات کا سلسلہ یکایک ختم ہو گیا ہو۔ میدان میں ہمارے سامنے کوئی حریف نہیں تھا۔ ہمارے بارے میں سینہ بہ سینہ گردش کرنے والی معلومات کا سلسلہ جوگیندر پال کی ذات پر آکر منقطع ہو گیا تھا۔ یوں تو بھارتی سیکرٹ سروس "را" کے لیے کام کرنے والے اور امریکی ایجنٹ ہم سب کے لہو کے پیاسے تھے لیکن ان کے پاس ہمارے ناموں کے سوا کوئی سراغ نہیں تھا۔ فون نمبر کی صورت میں جو سراغ میجر بخشی تک پہنچا تھا، وہ اس کے سینے میں دفن ہو گیا تھا۔ جوگیندر اس کڑی کے آخری سرے پر تھا۔ اسے شاید وہ فون نمبر بھی معلوم نہیں تھا مگر وہ بخشی کے اسپتال کی نگرانی کے ذریعے، خوش قسمتی سے مجھے شناسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جوگیندر پال میرا کھلا دشمن تھا، ماروتی ایک مشتبہ حلیف تھی۔ وہ دونوں ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

میں نے اپنے ذہن پر خاصا زور دیا لیکن ماضی میں پیش آنے والے کسی ایک واقعے کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکا۔ سب کچھ ایک تسلسل کے ساتھ ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس میں ذرا سی گنجائش یہ تھی کہ رستم ایرانی اور پنڈت منوہر لال کو کسی حد تک ایک نیا موڑ قرار دیا جا سکتا تھا۔

رستم سے ہماری ملاقات اوبرائن ڈی ہنٹ کے بارے میں ہوئی تھی۔ یہ عقدہ بہت بعد میں کھلا کہ بظاہر سب سے الگ تھلگ رہ کر، صاف ستھرے انداز میں کام کرنے والا رستم ایرانی بھی اسی تھیلی کے چٹے بٹوں میں شامل تھا اور اوبرائن کو محض اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ وہ سخت گیر اور خود غرض تھا۔ اپنے سامنے رستم کی دال نہیں گلنے دیتا تھا اور یہ بات رستم جیسے جاہ پرست کو بالکل پسند نہیں تھی۔

رستم ایرانی مذہب کے اعتبار سے بہائی اور پیشہ ورانہ طور پر اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد سے قریب تر تھا۔ وہ ختم نبوت کی تحریک کے تو احتجاجی بیانات کے طوفان میں اکرم الٰہی کی فریڈم موومنٹ کنیکشنل نظروں میں آئی جس پر امریکا کی فورڈ فاؤنڈیشن کی بڑی سرمایہ کاری کر رہی تھی۔ فریڈم کے معاملات کریدے گئے تو حیدر آباد میں قائم صحرا نامی این جی او کا نام سامنے آیا جس کا کرتا دھرتا مراد ظریف تھا۔

ان دنوں پریس میں این جی اوز کی زیر زمین، ملک دشمن سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ چھپ رہا تھا۔ فریڈم انٹرنیشنل اور صحرا کے معاملات کی چھان بین کے دوران میں پتا چلا کہ وہ سب افسانے نہیں تھے۔ غیر سرکاری سطح پر چلائے جانے والے بہت سے نام نہاد فلاحی ادارے ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے اور ان کے خلاف ایک الگ اور خصوصی آپریشن کی ضرورت ناگزیر ہو چکی تھی۔

شاید ہم لوگ بھی ایسے اداروں کی بیخ کنی میں لگ جاتے لیکن جب مقامی مہروں کو کٹھ پتلی کی طرح نچانے والے انڈین کمانڈو، کرشن کمار کا نام سامنے آیا تو ہماری ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ این جی اوز والا معاملہ جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔

"ہم باہر کے دشمنوں سے لڑ لڑ کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ آستین میں پلنے والے سانپوں کو ہم نے کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔" جب گفتگو کا سلسلہ متعدد ناموں سے ہوتا ہوا، این جی اوز پر اٹک گیا تو سلطان شاہ قدرے برہم ہو گیا۔

"جب تک اندر سے ایسے سہارے نہ ملیں، باہر والے کامیاب نہیں ہو سکتے۔" غزالہ نے اس کی تائید کی۔

"عوام کی اجتماعی کوششوں سے اصلاح اور فلاح و بہبود کا نعرہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ مغرب میں یہ نظریہ ستر کے عشرے میں رائج ہوا تھا۔ ہمارے یہاں تو ابھی یہ بالکل نیا ہے۔ اس کی بنیادیں بھی مستحکم نہیں ہوئی ہیں مگر بیرونی تخریب کاری روز اول سے ہمارا مسئلہ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں این جی اوز بے قصور ہیں۔ ان کو کھلی چھوٹ دے دینی چاہیے؟" سلطان شاہ نے چیخ کر پوچھا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔" میں نے ہلکے سے طنز سے جواب دیا "میری عرض اتنی ہے کہ سارا زور ان پر نہ دو۔ صرف وہی قصوروار نہیں ہیں۔ تم یہ ضرور کہہ سکتے ہو کہ پہلے بے ضمیر لوگ اپنے ملک اور اپنی زمین سے انفرادی غداریاں کرتے تھے اور چوروں کی طرح چھپتے پھرتے تھے۔ اب ان کے سینے کے بند کھل گئے ہیں۔ اکرم الٰہی، مقبول چوہدری اور مراد ظریف جیسے لوگ سینہ تان کر گھومتے ہیں۔ وہ خود ہی نہیں بکتے، اپنے سادہ لوح رضاکاروں تک کا سودا کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد سے دشمنوں کو اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے منظم اور باقاعدہ پلیٹ فارم میسر آجاتے ہیں۔"

"تم خود اپنی بات کی تردید کر رہے ہو۔ کیا یہ کوئی چھوٹا

Downloaded from https://paksociety.com

ظلم ہے؟ایک شخص اور ایک ٹیم میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"آپ نے تین نام لیے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" سلطان شاہ کی بات پوری ہوتے ہی غزالہ بولنے لگی "انہیں آزادی حاصل تھی تو رستم ایرانی کے واقعے پر فریڈم انٹرنیشنل کے احتجاجی بیان بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ چھپے تھے۔ آپ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کے احتجاج کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ وہ آج تک دوبارہ سر نہیں اٹھا سکے۔"

"جاسوسی اور جوابی جاسوسی۔ دہشت گردی اور اس کی جوابی کارروائیاں۔ ان سب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔" ویرا نے زبان کھولی۔ ایسی کارروائیاں صرف دشمنوں کے خلاف نہیں' دوستی کی آڑ میں بھی ہوتی رہی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" سلطان شاہ نے استہزائیہ انداز میں لقمہ دیا "امریکی ہمیشہ ہمیں اپنا دوست قرار دیتے رہے ہیں۔"

"امریکا میں بھی یہی سب ہوتا رہتا ہے۔" ویرا اس کے طنز کا برا منائے بغیر بولی "آج بھی امریکا کی جیلوں میں سیکڑوں ایسے امریکی سڑ رہے ہوں گے جن پر دشمن قوتوں کے لیے کام کرنے کے سنگین الزامات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔"

"غداری کے واقعات دنیا بھر میں ہوتے رہتے ہیں۔" اول خان نے اعتراف کیا۔ جب تک دنیا میں لالچ کا وجود ہے' ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ کلیدی بات وہی ہے جو ڈینی نے کہی ہے۔"

"اوہ! تو تم نے بھی کچھ کہا تھا۔" ویرا نے تمسخرانہ انداز میں اپنی بھویں اچکا کے کہا "ذرا اپنی بات دہرا دو۔"

"مجرمانہ مقاصد کے لیے کام کرنے والی این جی اوز کا صفایا ہونا ضروری ہے۔" اول خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بلاوجہ اتنی بحث ہوئی۔" سلطان شاہ منہ بنا کر بولا "میں نے بھی یہی بات کہی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب لاہور روانگی تک ہمیں کراچی میں کوئی نہ کوئی مصروفیت مل جائے گی۔" غزالہ ہنس کے بولی۔

"یہ گند صرف کراچی میں نہیں ہے۔ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔" اول خان بولا "این جی اوز کو ہوشیاری اور مکاری سے چلایا جائے تو یہ بہت نفع بخش دھندا ہے۔ بہت سے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتی ہوئے ہیں۔ ایسے ادارے تیزی سے دیہاتوں تک پھیل رہے ہیں۔"

"دیہی این جی اوز میں کیسے عیار اور چالاک آرگنا
کیوں نہ ہوں' وہاں زیادہ سے زیادہ مالی گھپلے اور بد عنوا
ہی ہو سکتی ہیں۔ غداری دہشت گردی اور ملک فروشی
جرائم کے لیے شہری ٹھکانے ضروری ہیں۔" ویرا نے
بے لاگ رائے دی۔

"اس لیے کراچی ہی سب سے بہتر شہر نظر آتا
ہمیں اپنے کام کی ابتدا یہیں سے کرنی چاہیے۔" میں
ہنس کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اب تم کراچی میں نہیں رکو گے۔ شام
پرواز سے لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤ۔" اول خان نے
سے کہا "تم چاہو تو وہاں ایک دو مہینے رہ سکتے ہو۔ میں تمہیں
یہاں نہیں الجھانا چاہتا۔"

"جب یہاں کام ہی نہیں رہا تو ہمارے رہنے یا نہ ر
سے کیا فرق پڑے گا؟"

"اس بارے میں مجھے تمہارے کسی مشورے کی
ضرورت نہیں۔ کام نہیں ہوتا تو تم خوا مخواہ چھیڑ چھاڑ شرو
کر دیتے ہو۔ جان اکمتھ اب بھی کراچی میں ہے اور اس کے
فون نمبر ہم سب کے علم میں ہیں۔ اب یہاں کوئی کشت و خو
نہیں ہو گا۔"

"شاید تم جلال کی مشکلات کے بارے میں فکر مند ہو!
ویرا نے اس سے پوچھا۔

"صرف جلال ہی نہیں' ان حالات کی وجہ سے ساری
ایجنسیاں دباؤ میں ہوں گی۔ وزارت داخلہ پر وقت پڑا ہوا
ہو گا۔ دفتر خارجہ والے بھی مشکل میں گرفتار ہوں گے۔ اند
کی کہانیاں اور ہماری مجبوریاں کسی کے علم میں نہیں ہیں۔
جو گینڈر پال کا قتل اور موہن خاندان میں ہونے والی تین
اموات سب کے سامنے ہیں۔ کسی کو سر پیر کا پتا نہیں ہے تو وہ
پریس اور میڈیا کا سامنا کس طرح کریں گے۔"

"خوب! آج تو تم بھی کوئی ذمے دار سرکاری افسر معلوم
ہو رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"ہمیں کوئی نہیں اپناتا لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے
کہ اسپیشل ٹاسک فورس کو سرکاری ذرائع سے فنڈز ملتے
ہیں۔" اول خان نے جذباتی لہجے میں جواب دیا "میں
دوسروں کی مجبوریوں سے کبھی غافل نہیں رہتا۔"

"اگر کراچی کی سرگرمیوں میں دقفہ اتنا ہی ضروری ہے
اور تم ہمیں لاہور بھیجنے پر تل گئے ہو تو یہ بھی بتاؤ کہ ہم وہاں کیا
کریں گے۔" میں نے پوچھا "میں زیادہ دنوں تک ہاتھ پر ہاتھ

Downloaded from https://paksociety.com

دھرے بیٹھا رہا تو اکتا جاؤں گا۔"

"لاہور میں بھی ایس ٹی ایف کا ایک یونٹ تعینات ہے۔ وہ اسٹیشن تھری کہلاتا ہے۔ میں تمہیں اسٹیشن چیف کا نام اور فون نمبر دے دوں گا۔ اسے بھی بتادوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اس کی مدد کر سکو۔ ہماری فورس میں تم بہت نیک نام گردانے جاتے ہو۔"

"اول خان کے الفاظ پر غور کرو۔" ویرا نے فوراً بات اچک لی "درحقیقت تم نیک نام نہیں ہو مگر گردانے جاتے ہو۔"

"صحت بگڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو تم کچھ دیر کے لیے خاموش رہو۔" میں نے اسے گھور کر کہا "میں اول خان سے بات کر رہا ہوں۔"

"اول خان کے مقابلے میں یہ خود کو دو نمبر خانم تصور کرتی ہے۔" سلطان شاہ بڑبڑایا۔

"خرافات مت بکو۔" میں نے ان دونوں کو ڈانٹا پھر اول خان کی طرف متوجہ ہو گیا "اسٹیشن تھری کے چیف کے بارے میں تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"تعارف کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ وہ یقیناً تمہیں اپنے اعتماد میں لے گا۔ باقی باتیں تم خود دیکھ لو گے۔"

"کیا لاہور میں آج کل این جی اوز کا کوئی قصہ چل رہا ہے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"قیاس ہے کہ ضرور چل رہا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ خالد نے اس پر دھیان نہ دیا ہو۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایس ٹی ایف کا ہر اسٹیشن کمانڈر یا چیف اپنی جگہ خود مختار ہوتا ہے اور صرف سربراہ کو جواب دہ ہوتا ہے۔ باس کو بھی یہ جان کر خوشی ہو گی کہ تم نے لاہور میں کچھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ خالد کو ہدایات دے گا کہ وہ لاہور میں تمہاری موجودگی سے فائدہ اٹھائے۔"

"میرا سوال لاہور کی سرگرمیوں اور مسائل کے بارے میں تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میں بھی یہی بتا رہا تھا۔ میں کراچی زون کے بارے میں جانتا ہوں۔ لاہور کے بارے میں خالد یا باس کو علم ہو گا۔ اسٹیشن کمانڈرز اپنی وقتی ضروریات کے تحت ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں ورنہ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔"

"مجھے یاد آگیا کہ حفاظت اور رازداری کی ضروریات کے پیش نظر ایس ٹی ایف کا ہر یونٹ اپنی جگہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی جملہ سرگرمیاں کمانڈر کی صوابدید پر منحصر ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کام سے حتی الامکان الگ تھلگ رہنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔

"لاہور کے بارے میں وہاں پہنچ کر ہی سوچا جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"اس بارے میں تساہل کی ضرورت نہیں۔ وہی کرو جو کہہ رہا ہوں۔ آج شام کو تم لاہور جا رہے ہو۔"

"وہاں سے مجھے براہِ راست بھارت جانا ہے۔ تصاویر پرسوں رات تمہیں دے دی گئی تھیں۔ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ اب تک نہیں آئے۔ ان کے بغیر وہاں جانا بے سود ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے سلگانے کی کوشش کی۔

"میں حیران ہوں کہ ماروتی کی خودکشی کے بعد تمہارے لیے کراچی میں کیا دلکشی رہ گئی ہے۔" ویرا بولی۔

"تم خاموش رہو تو زیادہ بہتر ہو گا۔" میں نے کہا "اس سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی اور پھر وہ یہاں کی آخری عورت بھی نہیں تھی۔"

"تم ذاتیات پر اتر آتی ہو۔" غزالہ نے خشک لہجے میں ویرا سے شکوہ کیا "یہاں ماروتی کا کیا ذکر تھا۔"

"آخر ڈینی لاہور جانے میں کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا چاہیے۔"

"سبب بننے کے لیے صرف ایک ماروتی ہی رہ گئی ہے؟" غزالہ نے برہمی سے کہا "وہ کسی بلا کی طرح تمہارے ذہن سے چمٹ کر رہ گئی ہے۔"

ویرا کو محسوس ہو گیا کہ اس کو غزالہ کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس نے غزالہ کے خاموش ہونے پر شرافت سے کہا "سوری غزالہ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے مذاق سے تمہاری دل آزاری ہو گی۔ ویسے ڈینی کے تذبذب کے بارے میں میرا سوال اپنی جگہ ہے۔"

"اب تم مذاق سے ہٹ کر سنجیدہ ہوئی ہو تو میں بھی بتادوں کہ میں ایک دو روز یہاں رکنا چاہتا ہوں۔ جوگیندر کی موت کا ردِعمل کھل کر سامنے آجائے تو میں اطمینان سے کہیں بھی جاسکوں گا۔ اس سے پہلے چلا گیا تو میرا دھیان یہیں لگا رہے گا۔"

"لاہور جا کر بھی تم کراچی سے رابطے میں رہو گے۔ فون اسی مقصد کے لیے ایجاد ہوا ہے۔" اول خان نے کہا۔

"فون کی اپنی مجبوری ہوتی ہے۔ کھل کر بات نہیں کی جاسکتی۔ ہوٹل کے فون پر سی ایس ڈی کا استعمال مشکل

Downloaded from https://paksociety.com

ہوگا۔"

"کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم چاہو گے تو خالد کے دفتر میں موجود سہولتوں سے استفادہ کر سکو گے۔"

"اگر تم میری یہاں موجودگی سے اسی قدر بیزار ہو اور مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر مجبوری ہے۔" میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

"پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی بات درمیان میں رہ گئی۔ کل وہ سب آگئے تھے۔ جوگیندر پال کا چکر شروع ہو جانے کی وجہ سے اسٹیشن فور پر پڑے رہ گئے۔ میں وہ سب منگوائے لیتا ہوں۔ تم غزالہ کو لے کر شام کی پرواز سے نکل جاؤ۔"

"میرے بارے میں تم کیا سوچ رہے ہو؟" ویرا نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوال کیا۔

"تم روانگی کے موقع پر لاہور پہنچ سکتی ہو۔ فی الحال کراچی میں ہی رکی رہو۔" اول خان نے تجویز پیش کی۔

"اس وقت تم کو بڑا مان لیا گیا ہے۔ جو چاہو' طے کر سکتے ہو۔" ویرا نے میری توقع کے برعکس بات مان لی۔

جب تک بحث جاری رہی' اول خان کے چہرے سے کشیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ سب کچھ طے ہو جانے پر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

اس وقت صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ گھر سے اپنے دفتر جاتے ہوئے' راستے میں ہمارے پاس رک گیا تھا کیونکہ پچھلے دن کے واقعات کے بارے میں اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات تشویش آمیز تھیں۔ بھارتی حکام نے میجر بخشی کے واقعے پر ذرا دبے دبے ردِ عمل کا اظہار کیا تھا لیکن جوگیندر کی موت پر وہ بھڑک اٹھے تھے۔ ان کے تیز و تند بیانات سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچنے والی ہو۔

ہمارے ساتھ پروگرام طے کر لینے کے بعد اول خان اپنے دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔

"ہمیں سفر کے لیے کچھ ساتھ لینا چاہیے؟" موقع ملنے پر غزالہ نے مجھ سے پوچھا۔ وہ پیکنگ کے بارے میں فکر مند تھی۔

میں ہنس پڑا "تن کے دو کپڑے بھی کافی ہوں گے۔ لاہور میں بازار سے ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔"

"ہمیں لاہور سے آگے' سرحد پار بھی جانا ہے۔" اس نے فکر مندانہ آواز میں کہا۔

"وہاں کے لیے ہیم گن اور اول خان کے ذخیرے کی چند نگوٹھیاں کافی ہوں گی۔ سامان لاد کر لے جانا بے سود ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ یہاں سے بھارت آنے جانے والے سامان کے بغیر سفر کرنے والوں کو ہر جگہ شک و شبے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ مناسب وزن کا کم از کم ایک سوٹ کیس ضرور ہونا چاہیے۔"

"ہم سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بھارت جانے والوں کے سامان کے بارے میں تم نے کہاں سے سن لیا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"سننے اور پڑھنے کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان سفر کرنے والوں کے ساتھ کسٹم اور امیگریشن کے عملے کی زیادتیوں کے بارے میں آئے دن اخباروں میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ آج کل میں ایسی خبریں اور مراسلے توجہ سے پڑھتی ہوں۔"

"ایک سوٹ کیس کی تیاری ناگزیر ہے تو پھر جو دل چاہے' بھر لینا۔ میرے لیے کپڑوں کے تین چار جوڑے کافی ہوں گے۔"

"سی ایس ڈی بھی ضروری ہے۔" ویرا نے یاد دہانی کرائی "ہو سکتا ہے کہ ہم کرائے پر کوئی گھر لینے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"لاہور میں ہم بے فکر ہو کر ہوٹل میں رہیں گے تاکہ کھانے پکانے کے چکروں میں نہ الجھنا پڑے..."

غزالہ نے میری بات کاٹ دی "میں لاہور کی نہیں' بھارت کی بات کر رہی تھی۔"

"اگر کوئی راز و نیاز نہ ہو رہے ہوں تو میں اندر آسکتی ہوں۔" باہر سے ویرا کی آواز آئی۔

"چلی آؤ۔" میں نے کہا اور ویرا ہماری خواب گاہ میں آگئی۔ غزالہ کپڑوں کا ڈھیر سر کا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم دونوں شام تک کے مہمان ہو۔ میں نے سوچا کہ یہ وقت ساتھ ہی گزار لیا جائے۔" ویرا مجھے آنکھ مار کے بولی۔

"ہم چاند کے سفر پر نہیں جا رہے۔ دو تین روز میں تم بھی ہم سے آملو گی۔" میں نے کہا۔

"چاند پر نہیں جا رہے لیکن یہ تمہارے ہنی مون کی تجدید ہو سکتی ہے کیونکہ تمہارے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوگا۔"

میں ویرا کو کمرے میں غزالہ کے ساتھ چھوڑ کر باہر آگیا۔ مجھے اپنا ذہن بہت ہلکا بلکہ خالی خالی محسوس ہو رہا تھا۔ ایک طرف شب و روز کی بھرپور مصروفیات چلتی رہی تھیں۔ اس وقت سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جوگیندر کے خاتمے کے ساتھ ساتھ سارے مسائل حل ہو چکے تھے اور اب ہمارے کرنے کے لیے کوئی بھی کام باقی نہیں

Downloaded from https://paksociety.com

رہا تھا۔ جو کچھ تھا' وہ بھارت کی سرزمین پر ہی تھا۔

دوپہر میں اول خان کا فون آگیا' اس نے ساڑھے پانچ بجے والی پرواز پر ہماری نشستیں بک کروائی تھیں۔

لاہور کے راستے' ہمارا بھارت کا سفر اہم اور پر خطر تھا۔ اپنی ذات پر اعتماد کے باوجود مجھے احساس تھا کہ کسی ذرا سی لغزش کی بنا پر وہ میرا آخری سفر بھی ہو سکتا تھا۔ وہاں انل بسواس اور اس کے گرد پھیلے ہوئے را کے ایجنٹوں سے ٹکرانا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ روانگی سے پہلے جہانگیر کو ایک الوداعی فون کال کرلوں لیکن پھر میں نے خود ہی ارادہ ملتوی کردیا۔

جہانگیر کی فطرت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسے میرے سفر کی نوعیت کا ذرا بھی اندازہ ہوجاتا تو اس کی طرف سے سوالات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا جسے خندہ پیشانی سے جھیلنا میرے بس سے باہر تھا۔

سوا دو بجے اول خان ہم تینوں کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لے کر آگیا۔ ان سفری کاغذات کی رو سے میرا نام مظہر خان طے پایا تھا۔ غزالہ کا نام جوں کا توں رہا تھا۔ ویرا کا نام بدل کر مس این کاویل ہوگیا تھا۔ تینوں پاسپورٹ پرانی اور ایک دوسری سے مختلف تاریخوں میں بنائے گئے تھے۔

ہم نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اول خان کی وجہ سے ہمیں پرواز سے دو گھنٹے پہلے ائرپورٹ پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم پانچوں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ ویرا کی غیر حاضری کے وقفوں میں' میں نے سلطان شاہ کو سمجھایا کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں ویرا کے ساتھ مفاہمانہ رویہ رکھے تاکہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ ہمارے جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے روٹھ جاتے تو اول خان کے سوا اور کوئی ان دونوں کے درمیان صلح نہیں کرا سکتا تھا جب کہ اول خان ان سے الگ رہنے سہنے کی وجہ سے ان کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات سے بروقت واقف نہیں ہو سکتا تھا۔

چار بجے ہم روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے سب کو ائرپورٹ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اول خان ہمیں آرام سے وہاں پہنچا سکتا تھا۔

"لاہور جاکر یہ نہ بھول جانا کہ تمہیں میرے ساتھ بھارت بھی جانا ہے۔" ویرا نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھولنے والی بات نہیں ہے۔ پروگرام طے ہوچکا ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"تم یہ نہیں بھولو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے لیکن لاہور میں ایسا کوئی بکھیڑا نہ پھیلا لینا کہ اسی میں الجھ کر رہ جاؤ۔ یہاں کے کام چلتے رہتے ہیں۔ تم کو آگے کے حالات پر نظر رکھنی چاہیے۔ ہمارا اصل ٹارگٹ انل بسواس ہے۔" وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرا بگڑا ہوا چہرہ ذرا سدھر جائے تو روانگی میں تاخیر نہیں ہوگی۔"

اول خان مجھے اور غزالہ کو لے کر گھر سے روانہ ہوگیا۔ جب تک ہماری گاڑی موڑ پر نہیں گھومی' سلطان شاہ' ویرا کے ساتھ باہر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔

"تم دونوں میاں بیوی ہو۔" اول خان عقب نما آئینے میں شاید وہ منظر دیکھتا رہا تھا۔ گاڑی گھمانے کے بعد وہ ایک گہرا سانس لے کر کہہ رہا تھا "سلطان شاہ کی دوستی کی بات بھی سمجھ میں آنے والی ہے لیکن یہ لڑکی' ویرا! یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسے تم لوگوں سے ایسی انسیت ہے اور وہ اس طرح گھل مل کر رہتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ نیچے جھاڑ کر سلطان شاہ کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس سے ویرا کی ذرا بھی نہیں بنتی' تم شادی شدہ ہو۔ وہ کس امید پر تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"یہ ملین ڈالر کا سوال ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ مغربی معاشرے کے کھوکھلے پن کو بہت قریب سے دیکھ چکی ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہے کہ اپنی خواہشات اور عیاشیوں کے لیے زندہ رہنے کی شدید خواہش نے انسان اور حیوان کا فرق بہت کم کردیا ہے۔ جانور بھی بے ڈھنگے پن سے یہی کرتے ہیں۔ مغرب کے بیشتر باسیوں میں نفاست اور قرینہ ہے مگر وہ اپنی ذات سے آگے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے دن بہ دن عاری ہوتے چلے جارہے ہیں۔ یہ زندگی کا مقصد نہیں ہوتا۔"

"ذاتی ضروریات اور خواہشات حد سے بڑھ جائیں تو ہر تمیز ختم کردیتی ہیں مگر ان کی کچھ فطری حدیں بھی ہیں....."

انتباہ

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

Downloaded from https://paksociety.com

"ویرا درویش ہوگئی ہے!" غزالہ نے اس کی بات کاٹ کر ٹکڑا لگایا۔

"کبھی کبھی میں بہت سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔" اول خان کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"ہم نے اس پر کوئی جبر نہیں کیا۔ وہ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ آئی اور رہ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے بارے میں کچھ سوچا ہوا ہو مگر یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن اور آسودہ ہے۔ آدمی اپنی زندگی کا کوئی مقصد اور مشن متعین کرلے اور لگن کے ساتھ اس سمت میں کام بھی کرتا رہے تو دوسری چیزیں اسے نہیں ستاتیں۔ ویرا بھی اسی مرحلے اور تجربے سے گزر رہی ہے۔"

"میں وہی جاننا چاہ رہا ہوں۔ اس کے سامنے کیا مقصد ہے۔" اول خان نے زور دے کر کہا۔

"حیرت ہے کہ یہ سوال تم کررہے ہو!" میں نے کہا "ہمارا مشن کیا ہے؟ بس وہی ویرا کا بھی مقصد حیات بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ہمارے لیے کام کرکے خوشی اور طمانیت حاصل کرتی ہے۔ اسی دوران میں اسے ذاتی خوشیوں کے دو لمحے میسر آجائیں تو انہیں غنیمت سمجھتی ہے۔"

"میرے مقابلے میں تم اس سے بہت زیادہ قریب ہو۔ تم کہہ رہے ہو تو میں یہ سب مانے لیتا ہوں لیکن وہ اب بھی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ قدرت نے اپنی ہر مخلوق میں بلاوجہ ہی جنس کا امتیاز نہیں رکھا۔ مرد کی ضرورت عورت ہے اور عورت کے لیے مرد کی رفاقت ناگزیر ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر وہ ادھورے ادھورے سے رہتے ہیں۔ میں ویرا کے مشن اور جذبے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر وہ اپنے ادھورے پن کے احساس کا کیا بدلا کرسکتی ہے۔"

اول خان نے نہایت شائستگی سے وہ نازک سوال اٹھایا تھا۔ وہ ابتدا سے ہی ویرا کا مداح تھا۔ اس کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا' ہر وقت اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ خود ویرا بھی اپنی ذات میں اول خان کی اس مخلصانہ دلچسپی سے واقف تھی مگر اول خان کے اس سوال کا جواب ویرا کے پاس تھا نہ میں غزالہ کی موجودگی میں لب کشائی کرسکتا تھا۔ وہ جو کچھ تھا' محض اس وجہ سے تھا کہ ویرا شروع ہی سے مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں اس کے لیے کبھی بھی حقیقی چاہت کے دیپ نہیں جل سکے تھے لیکن میں نے اسے ایک اچھی اور بے تکلف دوست کی طرح ہمیشہ عزیز رکھا تھا۔

ویرا کو سب کچھ معلوم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں غزالہ کی اداؤں کا اسیر ہوں۔ پھر بھی وہ مجھ سے مراسم بڑھاتی رہی۔ شاید اسے ناز تھا کہ اس کے قرب کے سحر میں مبتلا ہوکر میں غزالہ کو بھول جاؤں گا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ویرا کی غیر معمولی عنایتوں کے باوجود میرے دل و دماغ پر غزالہ کی ذات کا نقش ہلکا نہ ہوسکا۔ میری اس سرد مہری پر مشتعل ہوکر ویرا نے کم از کم دو مرتبہ میرے اور غزالہ کے درمیان فاصلوں کی طویل خلیج حائل کرنے کی سفاکانہ کوششیں کیں۔ ایک بار اسے اغوا کرکے انگلینڈ پہنچا دیا جہاں غزالہ نے اپنی ذہانت سے اس کے گرگوں کو ناک چنے چبوا دیے اور بچ نکلی۔

دوسری مرتبہ ویرا نے پھر وہی حربہ آزمایا اور غزالہ کو مشرق بعید کی طرف روانہ کردیا اور شاید وہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کے آدمیوں کے ذریعے غزالہ کو مکاؤ کے ایک ڈان کی تحویل میں پہنچایا گیا اور جب میں ویرا کے آدمیوں کا پیچھا کرتا ہوا ڈان کے محل میں پہنچا تو وہاں ویرا کی بازی الٹ گئی۔

وہ موٹا ڈان خود کو انصاف اور عقل کل سمجھتا تھا۔ اس نے میری کتھا سنی اور فیصلہ صادر کردیا کہ میری اور غزالہ کی شادی ہوئے بغیر وہ غزالہ کو رہا نہیں کرے گا۔ وہاں ایک مسلمان چینی مولوی نے ہم دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر ویرا کی ساری امیدوں پر اوس ڈال دی۔

ہم دونوں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ ڈان کوانگ فو کا جبر تھا جس نے ہمیں ایک رشتے میں پرو دیا تھا۔ ہماری واپسی پر ویرا نے کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا۔ شاید دل ہی دل میں وہ غزالہ سے حسد کرتی ہو مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں ہونے دیا نہ ہی اس نے غزالہ کے خلاف کوئی کارروائی کی۔ اس کی ایک سادہ سی آرزو تھی کہ وہ میرے قریب رہنا چاہتی تھی۔

وہ فیصلہ صرف میرا نہیں تھا۔ غزالہ نے اس کی تائید کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ویرا اگر اپنے مخاصمانہ رویے سے تائب ہوکر ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی تھی تو ہمیں اس کو خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔

وہ دور تک پھیلی ہوئی ایک پر پیچ کہانی تھی جس میں کئی ناگفتنی مقام بھی آتے تھے۔ گاڑی میں غزالہ کے ہوتے ہوئے میں وہ سب اول خان کو نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں در آنے والے خیالات کی آندھیوں کو جھٹکتے ہوئے جواب دیا "یہ ٹیڑھا سوال ہے۔ اس کا جواب وہی دے سکتی ہے۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"شاید اس سوال کا جواب میں بھی جانتی ہوں" غزالہ نے اس نازک موضوع میں دخل انداز ہو کر مجھے حیران کردیا۔ وہ کہہ رہی تھی "اس کی ماں مرگئی۔ باپ کو وائٹ ہاؤس میں قتل کردیا گیا۔ میں خود بھی ان تجربات سے گزر چکی ہوں اسی لیے ہمیشہ ویرا کو اس کی غلطیوں پر درگزر کرتی رہتی ہوں۔ اس سے ہر سایہ چھن چکا ہے۔ وہ ان کے قریب رہ کر خود کو بہت زیادہ محفوظ و مامون تصور کرتی ہے اور اسی لیے ہمارے ساتھ رہتی ہے۔"

غزالہ کا وہ جواب مسکت تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں اس کی طرف سے سنگین خوش فہمی کا شکار تھا۔ وہ انجان ضرور بنی رہتی تھی مگر کسی بات سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے اپنی بات بہت مہذب اور محتاط پیرائے میں بیان کی تھی۔ کہیں میرے اور ویرا کے ناروا روابط کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ ویرا ہر قیمت پر میرے قریب رہنا چاہتی ہے۔ اول خان کا سوال جذبوں کی تسکین کے بارے میں تھا۔ غزالہ نے اس کا جواب تحفظ کے حوالے سے دیا تھا۔

"تم یہ جانتی ہو اور پھر بھی اسے برداشت کر رہی ہو؟" اول خان نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں؟ اس میں کیا خرابی ہے؟" غزالہ نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"تت ..... تم ڈینی کی بیوی ہو؟" اول خان اس کے اچانک سوال پر گڑبڑا گیا "کیا تمہیں برا نہیں لگتا کہ ایک آزاد خیال عورت تمہارے شوہر کو پسند کرتی ہے اور ہر قیمت پر اس کے قریب رہنا پسند کرتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔"

"کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ مجھے ان پر پورا اعتماد ہے" غزالہ کے مضبوط لہجے نے میرے اوپر گھڑوں پانی ڈال دیا۔

"منہ بولے بہن بھائی کی حد تک بھی بات ٹھیک ہے۔ اس سے آگے میری عقل کام نہیں کرتی۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ تم بھی ویرا سے کم ناقابلِ فہم نہیں ہو۔"

"یہ فطرت کی بات ہوتی ہے اور ویرا تو ویسے ہی رشتوں کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔ وہ اپنے کسی بھی پسندیدہ مرد کو اپنا بھائی نہیں بنا سکتی۔ یہ اس کی سرشت کے خلاف ہوگا۔ وہ صرف دوست بن کر گزارہ کرسکتی ہے اور انہیں اپنا دوست کہتی ہے" غزالہ دھیرے دھیرے کھل رہی تھی۔ کسی تیسرے شخص کی موجودگی میں اس نے پہلی بار ویرا کے تذکرے میں حصہ لیا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ویرا کو کس حد تک سمجھتی تھی۔

"خیر..... اگر وہ خوش ہے اور تم بھی اس کی موجودگی سے ناخوش نہیں ہو تو گاڑی ٹھیک چل رہی ہے" اول خان نے غزالہ کے پے در پے جوابات سے بوکھلا کر بات سمیٹ دی "مجھے کسی کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ویرا کے بارے میں ہم تینوں کے اپنے اپنے تحفظات تھے۔ میں اس کے بارے میں ایسے ایسے تجربات سے گزرا تھا کہ غیر ضروری طور پر زبان کھولنے سے گریز کرتا تھا۔ غزالہ نے چند باتیں دہرا کر یہ واضح کردیا تھا کہ اس کے پاس عقابی مشاہدوں کا ایک خزانہ جمع تھا۔ وہ ویرا کی رگ رگ سے واقف معلوم ہوتی تھی۔ رہا اول خان تو اس کے ذہن میں نرا تجسس ہی تجسس بھرا ہوا تھا۔ ذرا سی دیر کی گفتگو میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا کوئی سیدھا سا سوال کوئی بحران بھی پیدا کرسکتا تھا۔

بقیہ راستہ بھی باتیں کرتے ہوئے طے ہوا لیکن اس بار ویرا کا نام تک نہیں آیا تھا۔

لاؤنج کے سامنے گاڑیوں کی پارکنگ ممنوع تھی۔ صرف جانے والے مسافروں اور ان کے اسباب کو اتارنے کی اجازت تھی۔ ہمارے اترتے ہی ٹریفک کے سپاہی نے اول خان کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا کیونکہ پیچھے بھانت بھانت کی گاڑیاں چلی آرہی تھیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ٹریفک کا وہ معمولی سپاہی' اول خان کی لینڈ روور کی بیج دیکھ سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس پر عام شہری نمبر پلیٹ تھی۔ سپاہی نے اسے کوئی رعایت نہیں دی۔

اول خان نے سپاہی سے ذرا سی مہلت طلب کی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر مجھے گلے سے لگایا' غزالہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ہمارے فارغ ہوتے ہی پورٹر نے ٹرالی کو لاؤنج کے داخلی دروازے کی طرف دھکیلنا شروع کردیا۔

ہم چند قدم دور گئے ہوں گے کہ اچانک کہیں سے جہانگیر نمودار ہوگیا۔ وہ کچھ بولایا ہوا سا تھا۔ غزالہ کو سلام کرتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"مویشی چرنے جارہا ہے۔ اسے چراگاہ بھیجنے آیا ہوں" اس نے بائیں آنکھ دبا کے کہا "تم کہاں جارہے ہو؟ اور یہ تمہارا جہم کول لگ رہا ہے؟"

Downloaded from https://paksociety.com

"کس مویشی کی بات کررہے ہو؟" میں نے اس کا آخری سوال ان سنا کردیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسافروں کی بھیڑ سے الگ ہوگیا۔

"وہی اپنی سلمٰی خانم!" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اپنی قسمت میں کوئی اور کہاں ہے۔ بیٹے کی محبت زور مار رہی تھی۔ اب وہ دو تین ہفتوں کے لیے اپنے میکے جارہی ہے۔"

میں نے غزالہ کو پورٹر کے ساتھ لاؤنج میں پہنچنے کا اشارہ کیا اور جہانگیر سے کہا "اب تمہارے مزے آجائیں گے۔"

"خاک مزے آئیں گے" اس نے منہ بنا کر مایوسی سے کہا "زندگی روکھی پھیکی اور بے کیف ہوجائے گی' گھر کاٹنے کو دوڑے گا۔"

"ہائیں؟ یہ تم کہہ رہے ہو۔ تم تو ہمیشہ اس سے بے زار رہتے ہو۔ اسے کوستے ہو' بددعائیں دیتے ہو!"

"یار سمجھا کرو۔ وہ ہوتی ہے تو قدر نہیں ہوتی۔ چلی جاتی ہے تو سالی یاد آتی ہے۔ گھر میں ڈانٹنے ڈپٹنے کے لیے کوئی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر زندگی کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ جب چاہو اور جتنی چاہو' پی لو۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوتا۔"

"بس اب دو تین ہفتوں تک عیش کرو۔ اسے بھی میکے میں رہ کر کچھ آرام ملے گا۔"

"خاک آرام ملے گا۔ ان پر سلمٰی کی دو روٹیاں بھی بھاری پڑتی ہیں۔ ہمیشہ دو چار ہفتوں کی دھمکی دے کر جاتی ہے مگر تین چار دن میں لوٹ آتی ہے۔"

"تم سے ڈرتی ہے کہ کہیں تم اس کی لمبی غیر حاضری میں اس کی جگہ دوسری بیوی لا کر نہ بٹھادو۔"

وہ ہنسنے لگا "اپنی ایسی قسمت کہاں۔ اللہ نے ایک ہی ایسی دی ہے جو چار پر بھاری ہے" پھر چونک کر پوچھا "تم کہاں ....لاہور جارہے ہو؟"

"لاہور کے بجائے اب اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ سلمٰی کے ساتھ سفر سے ڈر لگتا ہے۔"

"تمہیں اس سے نہیں' غزالہ سے ڈرنا چاہیے۔ عورت کتنی ہی نازک اور خوبصورت ہو' بیوی بنتے ہی خونخوار ہوجاتی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ ساڑھے پانچ والی پرواز سے جارہے ہو تو سلمٰی کا خیال رکھنا۔ وہ اکیلی سفر کررہی ہے۔"

"یہاں سے تم نے اسے اندر بھیجا ہے۔ جہاز پر سیکڑوں مسافر ہوں گے۔ لاہور میں تمہارے سالے اسے وصول کرلیں گے۔ تمہیں اتنے چھوٹے سے سفر کے لیے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سلمٰی ایک عاقل اور بالغ عورت ہے۔ اسے کوئی چرا کر نہیں لے جائے گا۔"

"تم نہ ملتے تب بھی وہ چلی جاتی۔ یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ جب چاہتے ہو' منہ اٹھا کر شہر سے کہیں بھی نکل جاتے ہو' تمہارا خون سفید ہوگیا ہے۔"

"اس بار غلطی معاف کردو۔ آئندہ تم سے پوچھ کر جاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کیوں اور کہاں جارہے ہو؟" اس نے دوبارہ میرا ہاتھ تھام کر شکوہ کیا۔

"میں دوسرا ہنی مون منانے لاہور جارہا ہوں۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

اس نے زور سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور کہا "ہرگز نہیں۔ ویسے آئیڈیا اچھا ہے۔ پرانی بیوی کے ساتھ نیا ہنی مون! واہ!"

"آج کل اپنی آنکھیں کھلی رکھنا" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے قدرے دھیمی آواز میں کہا "آج کل میرے پرانے دشمن پھر میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تم میرے گہرے دوست ہو۔ میری طرف سے مایوس ہوکر وہ تم پر کوئی وار کرسکتے ہیں۔ تمہیں ان کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اپنی غفلت یا حماقت کی وجہ سے کسی مشکل میں پھنس گئے تو کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔"

"تم ان چکروں پر لعنت بھیج کر کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرلیتے۔ سکھ چین سے روزی ملتی رہے گی۔ میری بھی جان بچی رہے گی۔"

"جو ہوگیا سو ہوگیا۔ واپسی پر تمہارے اس مشورے کے بارے میں کچھ سوچوں گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا مگر وہ پھر ٹک گیا "ویرا تو یہیں کراچی میں رہے گی نا؟"

"وہ اکیلی نہیں ہے۔ سلطان شاہ بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ اس پر منہ مارنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میں دوستوں کے مال پر نظر نہیں رکھتا۔ بس اس سے ذرا سی دل لگی کرلیتا ہوں۔ اس وقت میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئیں تو اسے فون کروں یا نہ کروں۔ وہ آخر اپنی پرانی بلیک کوئن ہے۔"

"جو چاہو' کرلینا۔ اب مجھے اجازت دو ورنہ پرواز نکل جائے گی۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

اس نے پُرجوش معانقہ کرکے مجھے لاؤنج میں جانے کی

Downloaded from https://paksociety.com

اجازت دے دی۔ غزالہ چیک ان کاؤنٹر سے الگ کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

"یہ بدروح کی طرح یہاں کیوں منڈلاتا پھر رہا ہے؟" غزالہ نے اپنا ٹکٹ بھی مجھے تھماتے ہوئے پوچھا۔

"سلمٰی بھی اسی پرواز سے لاہور جا رہی ہے۔ نظر آجائے تو اس سے دور ہی رہنا۔"

وہ بڑے طیارے کی پرواز تھی اس لیے قطار میں کھڑے ہوئے مسافروں کی تعداد بھی زیادہ تھی لیکن بزنس کلاس کا ترجیحی کاؤنٹر خالی تھا۔ اکلوتا سوٹ کیس عملے کے حوالے کرکے میں نے بورڈنگ کارڈ حاصل کیے اور اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔

تلاشی اور سیکیورٹی چیک کے مرحلے سے گزر کر ہم اس حصے میں داخل ہوئے جہاں مسافر طیارے کی طرف روانگی کے منتظر تھے۔ غزالہ نے دور ہی سے سلمٰی کو دیکھ لیا۔ وہ ایک اگلی نشست پر سکون سے بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے فرسٹ کلاس لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ سلمٰی اکنامی کلاس کی مسافر تھی۔ اس سے پرواز پر مڈبھیڑ ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا۔ لاہور ائرپورٹ پر سامنا ہو جاتا تو اسے آسانی سے ٹالا جا سکتا تھا۔

ہم خاصی تاخیر سے ائرپورٹ پہنچے تھے اس لیے ہمیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہم بھی جہاز پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد دروازے بند ہوئے، جہاز کے انجن چلائے گئے اور مزید کچھ دیر بعد کراچی سے ہمارا زمینی رابطہ ٹوٹ گیا۔ جہاز ڈھائی سو سے زائد مسافروں کو اپنے پیٹ میں سمیٹے، بلندی کی طرف اٹھتا جا رہا تھا۔

"جہانگیر کب تک خوف و ہراس کی زندگی گزارتا رہے گا؟" پرواز معمول پر آنے کے بعد غزالہ نے فکرمندی سے پوچھا "وہ آپ سے دوستی کی بہت بھاری قیمت ادا کر رہا ہے۔ بیٹے کے اغوا کے بعد سے وہ خوف زدہ ہے اور اسے ننھیال میں چھوڑا ہوا ہے۔ شاید سلمٰی اسی سے ملنے جا رہی ہوگی!"

"میری دانست میں اس بچے کی وہاں بہتر پرورش ہوگی۔ جہانگیر کی بری عادتوں کی وجہ سے بچے کا دور رہنا ہی بہتر ہے۔ یہاں آیا تو ہوش سنبھالنے تک بگڑ جائے گا۔"

"آپ نے شراب نوشی ہی ترک نہیں کی، اچھی بات یہ ہے کہ اب اس عادت کو بھی برا سمجھتے ہیں" غزالہ تعریفی لہجے میں بولی "شاید جہانگیر نے بھی یہ سوچ کر اپنے بیٹے کو اپنی سسرال میں چھوڑا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی جہانگیر کی آزادیوں میں رکاوٹ بنے گی۔"

"یہ اس کے اپنے مسائل ہیں، جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔ مگر میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے کہ میری وجہ سے اس کا شیر خوار بچہ اغوا ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر اسے ماں باپ سے دور رہنا پڑ رہا ہے۔" میں نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"اگر یہ خطرہ ٹل جائے اور میرا خیال ہے کہ اب ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تو جہانگیر کو اپنے بیٹے کو واپس بلانے کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔"

"میں اسے یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔ فلیٹ میں رہتے ہوئے وہ اپنی بری عادات کو بچے سے پوشیدہ نہیں رکھ سکے گا۔ بچہ یہی سب دیکھ کر ہوش سنبھالے گا۔ کسی دن جہانگیر نے نشے کی حالت میں سلمٰی کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو بیٹا اپنے باپ کے مقابلے پر بھی آسکتا ہے۔"

"یہ ممکن ہے" غزالہ نے مجھ سے اتفاق کیا "اور اس کا الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید جہانگیر کو ہوش آجائے۔ بچے کی محبت شراب کی طلب پر غالب آجائے اور وہ ہمیشہ کے لیے شراب پینے سے توبہ کر لے۔ اس کی زندگی سنور جائے گی۔"

"یہ ایک خوش فہمی ہو سکتی ہے۔ اس کا حقیقت میں ڈھلنے کا کوئی امکان نہیں ہے" میں نے پورے وثوق سے کہا "ایک نشے کی طلب ہوتی ہے۔ وقت ہو جائے اور شراب یا دوسرا مخصوص نشہ نہ ملے تو آدمی پر بیزاری طاری ہونے لگتی ہے، اعصاب چٹخنے لگتے ہیں، وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے، بات بے بات پر اسے غصہ آنے لگتا ہے، ذہن ماؤف اور منتشر ہونے لگتا ہے اور آدمی ان تمام کیفیات سے چھٹکارا پانے کے لیے نشے کی اگلی خوراک لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ڈرگ ایڈکشن کہلاتا ہے۔ دوسری طلب انسان کی اپنی خواہشات کے تابع ہوتی ہے۔ وہ پینا اور پی کر بہت کچھ بھول جانا یا فرضی تصورات میں کھو جانا چاہتا ہے۔ کسی ذہنی، جسمانی یا اعصابی طلب کے بغیر اسے مدہوش ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ نشے میں حقائق سے فرار حاصل کرتا ہے۔ جہانگیر کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ وہ شراب نہیں چھوڑے گا۔"

غزالہ بے ساختہ ہنس پڑی "اس وقت آپ کوئی ڈرگ اسکالر معلوم ہو رہے ہیں۔"

"نشہ بیچنے والا ہر شخص، موت کا ہر سوداگر ڈرگ اسکالر ہوتا ہے" غزالہ کے تبصرے سے میرے ذہن میں یکایک پرانی یادیں جاگ اٹھیں "یہ لوگ انسانی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں۔ طلب اور رسد، دام اور منڈی۔ ہر چیز پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ میرے

Downloaded from https://paksociety.com

ماضی کی جڑیں بھی اسی ماحول میں تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے بہت کچھ کیا' دیکھا اور پھر سب چھوڑ دیا۔"

"ہم جہانگیر کی بات کر رہے تھے۔ آپ بھٹک کر نہ جانے کہاں پہنچ گئے" غزالہ نے منہ بنایا۔

"نشہ جہانگیر کو اپنی طرف نہیں بلاتا' جہانگیر نشے میں رہنا چاہتا ہے۔ بیٹے کے آجانے سے بھی اس کی یہ عادت نہیں بدلے گی۔"

"کیسی زندگی ہوگی اس بے چارے کی؟" ویرا نے ترحم آمیز لہجے میں کہا "ماں باپ زندہ ہیں' صحت مند اور باحیثیت ہیں مگر وہ ان کی شفقت اور نگہداشت سے محروم ہے۔ ایسے بچوں کی شخصیت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔"

"مثال تمہارے سامنے ہے۔ راستے میں اول خان سے ویرا کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ویرا سب کچھ ہے مگر ادھوری ہے کیونکہ اسے کبھی بھی باپ کا سایہ نہیں مل سکا... اور پھر وہ بچے جنہیں ماں کی ممتا ملی اور نہ باپ کی محبت!" میں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا آپ جہانگیر کو نہیں سمجھا سکتے؟" غزالہ نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"نہیں۔ جو شخص خود فریبی میں مبتلا ہو' کچھ نہ سمجھنا چاہے' اسے کون سمجھا سکتا ہے؟"

"آپ اس کے دوست ہیں۔ وہ آپ کی بات سنتا اور مانتا ہے..." غزالہ اس کے بارے میں فکرمند ہو گئی تھی۔

"تم درست کہہ رہی ہو۔ وہ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتا ہے۔ میں کوئی بہتر مشورہ دوں تو بلا حیل وحجت اسے مان لیتا ہے مگر شراب کے بارے میں وہ مجھ سمیت کسی کی نہیں سنتا اور نہ سنے گا۔ اسے بھول جاؤ۔ پرواز کا لطف برباد نہ کرو۔ دیکھو' یہ کیبن کس قدر خوبصورت ہے۔ موسیقی کیسی نرم اور سہانی ہے۔ کچن سے کیسی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ اب شاید مہمان داری کا آغاز ہونے والا ہے۔"

"آپ بہت چالاک ہیں۔ باتوں سے آدمی کو خوب بہلاتے ہیں۔" وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کھڑکی سے جھانکنے کے بہانے اپنا کچھ بوجھ اس کے وجود پر منتقل کر دیا۔ کھڑکی سے باہر اور جہاز سے بہت نیچے شفق رنگ بادلوں کے پرے کے پرے تیرتے پھر رہے تھے اور غزالہ کے وجود کے حیات آفریں لمس کی مسحور کن مہک سے میرا ذہن ان بادلوں سے بہت اوپر اڑنے لگا تھا۔

کھانے پینے اور باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ ڈیڑھ گھنٹا کیسے گزر گیا۔ جہاز کے کپتان نے نیویگیشن سسٹم پر مسافروں کو لاہور کے موسم کا کچھ احوال بتایا' الوداع کہا اور پھر پرواز کی لینڈنگ کا اعلان کر دیا۔

جہاز سے باہر قدم رکھتے ہی طبیعت خوش ہو گئی کیونکہ لاہور کا موسم کراچی سے بہت بہتر تھا۔ رات اپنا ڈیرا ڈال چکی تھی۔ رن وے اور ایئرپورٹ کی عمارت دور تک روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ سیڑھیوں کے قریب کئی لمبی لمبی بسیں مسافروں کو ٹرمینل کی عمارت تک لے جانے کیلئے منتظر تھیں۔ فرسٹ اور بزنس کلاس کے مسافروں کے لیے اگلی سیڑھی کے ساتھ کو چز موجود تھیں۔

شاید جہاز کے کارگو ہولڈ میں سامان بار کرتے ہوئے خاص طور پر یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ منگنے درجوں کے مسافروں کا سامان دوسروں سے پہلے اتارا جا سکے۔ گردش کرتی ہوئی بیلٹ پر ذرا ہی دیر بعد ہمارا سوٹ کیس نظر آنے لگا۔ اس وقت تک سلمٰی کا کہیں پتا نہیں تھا۔

سوٹ کیس ٹرالی پر لدوانے کے بعد جوں ہی ہم باہر نکلے تو استقبالیہ ہجوم میں متعدد افراد پلے کارڈز لیے موجود تھے جن پر اردو یا انگریزی میں ان کے متوقع نام لکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ہوٹل کا پلاسٹک کا لمبا سا پلے کارڈ بلکہ پلاسٹک بورڈ بہت خوش نما تھا جس پر پلاسٹک سے تراشے ہوئے انگریزی حروف کو یکجا کر کے نام ترتیب دیے گئے تھے۔ اس تختی پر سات نام نظر آ رہے تھے۔

میں نے وہ منظر سرسری انداز میں دیکھا اور ان لوگوں کے درمیان اپنا راستہ بنانا چاہا۔ اسی وقت غزالہ نے مجھے چونکا دیا۔ "پلاسٹک بورڈ پر چوتھا نام شاید آپ کا ہے۔" وہ میرا بازو دبا کر کہہ رہی تھی۔

میں نے اس تختی پر دوبارہ نظر ڈالی۔ مظہر خان جمع ایک کے الفاظ پڑھے اور مان لیا کہ غزالہ درست کہہ رہی تھی۔

ہم دونوں سے پہلے ایک اور شخص باوردی شوفر کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ وہ غیر ملکی تھا۔ اس شخص نے غور سے ہم دونوں کی طرف دیکھا' اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور زبردستی ہونٹ پھیلا دیے۔ میں نے اس کی تکلف آمیز ولایتی مسکراہٹ کا جواب دیسی مسکراہٹ سے دیا جو زندگی سے بھرپور اور ہلکی سی استہزائیہ تھی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اپنے خدوخال سے امریکی نظر آ رہا تھا۔

پلے کارڈ پر ناموں کی تعداد زیادہ تھی۔ باوردی شوفر نے ہم تینوں کو اپنے ساتھی کے حوالے کر دیا۔

ہوٹل کے عملے کی پناہ میں پہنچنے کا یہ فائدہ ہوا کہ ہم پیشہ ور ٹیکسی ڈرائیوروں اور ان کے ایجنٹوں کی یلغار سے بچ

Downloaded from https://paksociety.com

گئے۔ ماضی میں' میں ان کے ساتھ کئی تلخ تجربات سے گزر چکا تھا مگر اندرون ملک سفر کرتے ہوئے ان تجربات سے مفر بھی ممکن نہیں تھا۔

ٹرمینل کی عمارت کے سامنے پارکنگ لاٹ میں پی سی کی ایک کوسٹر موجود تھی جو ایک وقت میں دس سے زیادہ مسافروں اور ان کے سامان کو ہوٹل پہنچا سکتی تھی۔ جب ہمیں لانے والے نے ہمارے لیے ایک سیاہ سیڈان کار کے دروازے کھولے تو مجھے اندازہ ہوا کہ باوردی شوفر نے ہمیں کچھ زیادہ ہی وقعت دی تھی۔

"سر! آپ ادھر تشریف لے آئیں!" مجھے اور غزالہ کو پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد اس شخص نے سفید فام سے کہا۔

سفید فام کی پیشانی پر ناگواری کی علامات ابھر آئیں کیونکہ میزبان اسے کوسٹر کی طرف بلا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان کچھ مکالمہ ہوا جو سیڈان کا دروازہ بند کیے جانے کے سبب میں نہ سن سکا۔ اس گورے کو کوسٹر میں بٹھا کر ڈرائیور واپس آیا اور اپنی نشست سنبھال کر اس نے گاڑی چلا دی۔

لاہور میں استقبال یا قیام کے بارے میں میری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پرل کانٹی نینٹل کے پلے کارڈ پر اپنا نام موجود دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ اپنے ساتھ ڈرائیور کے امتیازی سلوک کی وجہ سے وہ حیرت دوچند ہو گئی۔

"کیا یہ پرائیویٹ ٹیکسی ہے؟" گاڑی ائرپورٹ کے احاطے سے باہر نکل آنے پر میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! یہ ہوٹل کی اسٹاف کار ہے" ڈرائیور نے ادب سے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر اس گورے کو تم نے کوسٹر میں کیوں بٹھا دیا؟ اس گاڑی میں بھی جگہ تھی؟"

"اسٹاف کار وی آئی پی مہمانوں کے لیے ہوتی ہے سر!" ڈرائیور نے بے تکلف ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی "اس گاڑی کے مسافروں کے لیے ہمیں ہوٹل سے خاص ہدایت ملتی ہے۔ دوسروں کو بٹھالیں تو جواب دینا پڑے گا۔ وہ گاڑی بھی ائرکنڈیشنڈ اور بہت آرام دہ ہے۔"

یہ عجیب اتفاق تھا کہ لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمارا پہلا واسطہ ایک امریکی سے پڑا تھا۔ وہ یقینی طور پر دوران پرواز ہمارا ہم سفر رہا تھا لیکن ہم نے لاہور پہنچنے سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں اس شبے نے سر ابھارا کہ کہیں وہ کراچی سے ہی ہمارے پیچھے نہ لگا ہوا ہو لیکن میں نے خود اس خیال کو مسترد کر دیا۔ لاہور ائرپورٹ سے باہر آنے تک خود ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے قیام کا پی سی میں بندوبست کیا جا چکا ہے تو کسی اور کو اس بارے میں کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ محض اتفاق تھا اور اس امریکی پر شبہ کرنا بے سود تھا۔

ہوٹل والوں کا ایک اپنا انتظام تھا۔ پورچ سے ہم اندر داخل ہوئے تو مہمان داری کے نگراں نے اپنی جگہ چھوڑ کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر ایک وجیہہ اور نوجوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ نگراں نے جوں ہی مجھے مظہر خان کہہ کر مخاطب کیا' وہ شخص گرم جوشی سے میری طرف لپکا۔

"مجھے خالد احمد کہتے ہیں" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے داہنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ مجھے کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ سارا بندوبست اسی کا تھا اور وہی اسپیشل ٹاسک فورس کے لاہور یونٹ کا کمانڈر تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو نظرانداز کر کے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

وہ میری طرف سے پیش قدمی کا منتظر تھا۔ لاہوری انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کا داہنا ہاتھ میرے شانے پر سے اور بایاں ہاتھ پسلیوں پر سے ہوتا ہوا میرے جسم کے گرد حمائل ہو چکا تھا۔ وہ اس کی طرف سے اپنائیت کا والہانہ اظہار تھا۔

"سر! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی۔ مجھے تھوڑی دیر پہلے کراچی سے پیغام ملا تھا کہ آپ آ رہے ہیں" اس نے مجھ سے الگ ہو کر ادب سے غزالہ کو سلام کیا پھر مسرت سے سرشار لہجے میں بولنے لگا "ہوٹل میں آپ ہمارے مہمان ہوں گے۔"

مجھے ہوٹل میں صرف ایک فارم پر دستخط کرنے پڑے۔ اس سے پہلے چابی آ چکی تھی اور پورٹر نے ہمارا اکلوتا سوٹ کیس ٹرالی پر رکھ لیا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں خالد سے زیادہ دیر تک بات نہیں کی جا سکتی تھی' میں نے اسے روکنے کے لیے اصرار کیا مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم کراچی سے وہاں پہنچے تھے' تھک گئے ہوں گے۔ اس لیے ہمیں آرام کی ضرورت تھی۔

وہ اگلی صبح دس بجے فون کر کے آنے کا وعدہ کر کے وہیں سے رخصت ہو گئے۔ ہم دونوں پورٹر کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

ہوٹل کا کمرا حسب روایت کشادہ' روشن اور بہت آراستہ تھا۔ میں جاتے ہی مسہری پر گر گیا۔

"اوہ!" غزالہ کی مترنم ہنسی سے کمرے کے در و دیوار گنگنا اٹھے "آپ تو ایڑھ گھٹنے کی پرواز سے واقعی تھک

Downloaded from https://paksociety.com

گئے۔"

"خالد کا بھی کچھ نہ کچھ بھرم تو رکھنا ہے۔ مجھ سے زیادہ تم کو تھکا ہوا ہونا چاہیے" میں نے اسے بھی اپنے قریب بٹھالیا۔

"لاہور کا موسم آپ پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہو رہا ہے" غزالہ شوخی سے بولی۔

"کیوں نہ ہو.... یہ نور جہاں اور جہانگیر کی سرزمین ہے۔ رات گہری ہوگی تو موسم کا یہ خمار بھی بڑھ جائے گا۔ کراچی سے نکل آنے کے بعد میں خود کو بہت تر و تازہ اور توانا محسوس کر رہا ہوں۔"

"تبدیلی ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ اسی لیے مسافروں کا ہجوم دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔ موسم اور ماحول کی تبدیلی کے لیے کراچی والے لاہور آتے ہیں۔ لاہور کے رہنے والے کراچی جاکر خود کو تر و تازہ محسوس کرتے ہیں۔ جن کے پاس وقت اور وسائل ہیں، وہ باہر جاتے ہیں۔"

"ذرا کراچی فون کردو۔ ویرا اداس بیٹھی ہوئی ہوگی۔ تمہاری آواز سن کر بہل جائے گی۔"

"اس کے لیے میرے بجائے آپ کی آواز زیادہ اہم ہوگی۔ اس کی اداسی کو زیادہ افاقہ ہوگا۔"

موقع پاتے ہی وہ چوٹ کر گزری تھی۔ میں نے بے رحمی سے اس کے پہلو کو گدگدا دیا اور وہ ہنستی ہوئی مسہری پر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

اس کی ہنسی تھمی تو میری ہدایت برقرار تھی۔ اسی کو کراچی کا نمبر ملانا پڑا۔

کارڈ پر مندرج نمبر ملا کر اس نے براہِ راست لائن لی اور پھر گھر کا نمبر ملالیا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ اول خان سے مخاطب تھی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت بھی ہمارے گھر پر موجود تھا۔ شاید وہ ویرا اور سلطان شاہ کی دل جوئی کے لیے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

اس سے سفر کے بارے میں چند فقروں کے تبادلے کے بعد غزالہ نے ریسیور میری طرف بڑھادیا۔

"تم عظیم آدمی ہو" میں نے مسہری پر لیٹے لیٹے ریسیور اپنے کان سے لگا کر کہا "ان دونوں کا اتنا دھیان رکھو گے تو انہیں مہینوں بھی ہماری کمی محسوس نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ این کا ویل سفر پر جانے کا ارادہ ملتوی کردے!"

"ابھی تم پاکستان میں ہو" اول خان نے مجھے یاد دلایا "یہاں اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، ویسے بھی یہ بندوبست خالد کا ہے اور ہوٹل پی سی ہے۔ ہم فون پر کھل کر بات کرسکتے ہیں۔ میں ان کی دل جوئی سے زیادہ، اپنی پریشانی کے سبب یہاں رکا ہوں۔"

"کیوں؟ تمہیں کیا پریشانی ہے؟" میں چونک کر بستر سے اٹھ گیا "وہ دونوں تو خیریت سے ہیں نا!"

"وہ دونوں بلکہ ہم تینوں خیریت سے ہیں" اول خان کی آواز مضمحل ہوگئی "بولٹن مارکیٹ پر ایک ٹائم بم ٹھیک چھ بجے پھٹا ہے۔ اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی دو گاڑیوں کے پرخچے اڑگئے۔ تین آدمی بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ بم ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پھٹا جہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔"

وہ خبر سن رک میں لرز کر رہ گیا۔ شام کے چھ بجے بولٹن مارکیٹ کا سارا کاروباری اور دفتری علاقہ ہر طبقے کے لوگوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ٹھیلوں اور پتھاروں سے لے کر دکانوں تک میں ہجوم نظر آتا ہے۔ ایسے نازک وقت پر پھٹنے والے بم نے اگر تین افراد کو صرف زخمی کیا تھا تو وہ معجزہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے ملول لہجے میں پوچھا "مجھے حیرت ہے کہ یہ واقعہ کراچی میں ہوا اور تم وہاں گھر پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

"کراچی پاکستان کا دل ہے۔ یہاں بہت سی ایجنسیاں سرگرم رہتی ہیں۔ ہم وفاقی اور مقامی اداروں کے دائرہ کار میں داخل نہیں ہوتے۔ وہاں جانے سے مداخلت کا تاثر پیدا ہوگا۔ اس وجہ سے اپنے دل پر جبر کیے بیٹھا ہوا ہوں۔"

"تمہیں خبریں تو مل رہی ہوں گی۔ یہ واقعہ کیسے ہوا؟" میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"ایسے واقعات بس اچانک رونما ہوتے ہیں۔ یہ جوگی والے واقعے کا جواب بھی ہوسکتا ہے۔"

"اسے کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے" میں نے اپنے حلق میں تلخی گھلتی ہوئی محسوس کی۔

"میمن گوٹھ والے واقعے کے بعد اسلام آباد میں دھماکا کیا گیا تھا۔ اب کراچی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ واقعات یوں ہی چلتے ہیں۔ غنیمت یہ ہے کہ اس بار ایک مشتبہ شخص سامنے آیا ہے اور بہت بڑے علاقے کی ناکہ بندی کرکے اس کی تلاش کی جارہی ہے" اول خان نے بتایا۔

"وہ ہاتھ آجائے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ ہم لوگ ایک ڈیڑھ بجے تک جاگتے رہیں گے۔"

"شرط یہی ہے کہ مجھے کچھ پتا چلے۔ بعض اوقات سرکاری ادارے بہت زیادہ رازداری سے کام لینے لگتے ہیں۔"

"یہ بھی مجبوری ہے.... لاہور میں تمہارا بندوبست بہت

Downloaded from https://paksociety.com

شاندار تھا۔ خالد نے مجھے متاثر کیا ہے۔"

"کاش، تم دونوں مل کر کوئی کام کرسکو۔ تمہارے روانہ ہوجانے کے بعد مجھے خیال آیا تھا کہ تم لاہور میں کہاں رہو گے؟"

میں ہنس پڑا "ہم سب ایک دوسرے کا یوں خیال رکھتے ہیں جیسے ہمارے سوا سب ناسمجھ بچے ہوں۔ لاہور ایک ترقی پذیر شہر ہے۔ ہم آسانی سے کسی بھی ہوٹل میں قیام کرسکتے تھے۔ کہیں اب تم ہمارے کھانے پینے کا بندوبست بھی شروع نہ کردینا۔"

"میں نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ تمہارا ذہن غلط سمت میں کام کررہا تھا۔ اس وقت تمہارے لیے فائیو اسٹار ہوٹل ہی سب سے بہتر اور محفوظ ہے۔ فیملی اسٹیٹس رکھنے والے بہت سے ہوٹل جرائم کا گڑھ بنے ہوئے ہیں۔ لاہور سرحدی شہر ہے۔ وہاں بھارتی ایجنٹوں کی خفیہ آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔"

"تم یہ جانتے ہو پھر بھی اس کا کوئی سدباب نہیں ہوسکتا!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر یہ معلوم ہو کہ کون بیرونی ایجنٹ یا دہشت گرد ہے تو مسئلہ اسی وقت نمٹ جائے۔ ہوتا یہ ہے کہ واقعہ ہوجاتا ہے۔ حقائق بعد میں سامنے آتے ہیں۔ تم خود بتاؤ کہ جعلی شناختی کارڈ پر مقاموں والی مراعات سے فائدہ اٹھانے والوں کو کون روک سکتا ہے۔"

"شاید یہ سب سے سنگین اور بنیادی سوال ہے" میں نے فکرمندی سے کہا "اسے نظرانداز کرکے غلطی کی جارہی ہے۔ افغان، ایرانی، بنگلہ دیشی... سب یہاں شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ بنوا کر عیش کررہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ جب تک یہ نظام درست نہیں ہوگا، امن وامان کے سنگین مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ راہ والوں کو پاکستانی بننے سے کون روک سکے گا۔ پاکستانی شناخت کو ہم نے خود بے توقیر کردیا ہے۔"

"اب اپنا خون نہ سلگاؤ۔ لاہور میں آرام کرو۔ کوئی اہم بات سامنے آئی تو میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

"آپ کراچی میں موجود ہوتے تو اسی وقت مشتبہ آدمی کا کھوج لگانے پر تل جاتے" اول خان سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سن کر غزالہ نے کہا "اسی وجہ سے اول خان کی خواہش تھی کہ آپ جلد از جلد کراچی چھوڑ دیں۔ یہاں سے آپ کچھ نہیں کرسکتے۔"

"میں کچھ بھی نہیں کرتا۔ میری معلومات کے ذرائع محدود ہیں۔ بس کچھ لوگوں سے بروقت رابطے ہوجائیں تو کوئی نہ کوئی کام کی بات سامنے آجاتی ہے۔ اب اول خان خود اندھیرے میں ہے۔ میں کیا کرسکتا تھا۔ کراچی یا لاہور میں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

جوگیندر پال کی موت کے چوبیس گھنٹوں میں ہونے والا دھماکا ایک خاص سمت کی نشان دہی کررہا تھا۔ وہ بالکل وہی حکمتِ عملی تھی جو امریکیوں نے میمن گوٹھ کے نواح میں جمی اور ڈیوڈ کی موت پر اختیار کی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد کو دھماکے کا نشانہ بنایا تھا، بھارتیوں نے کراچی کا جواب کراچی میں دیا تھا۔ شاید وہ امریکیوں کا مشورہ تھا۔ اپنے ملک میں پاکستان کے سفارتی عملے کو جوابی کارروائی کا نشانہ بناکر پیچیدگیوں میں اضافہ کرنے اور اپنے عالمی وقار کو مجروح کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ پاکستان ہی میں ابتری اور خوف وہراس کی فضا پیدا کی جائے۔

اگر بھارتی اور امریکی اس مشترکہ پالیسی پر عمل کررہے تھے تو وہ کامیاب ہوتی نظر آرہی تھی۔

کراچی سے ملنے والی اس خبر کے بعد میری طبیعت سے ساری بشاشت رخصت ہوچکی تھی۔ ہوٹل کے کمرے سے نکلنے پر طبیعت مائل نہیں تھی۔ دس بجے ہم نے کمرے میں ہی کھانا طلب کرلیا۔ کھانے کے دوران میں مجھے جلال کا خیال آیا۔

وہ انٹیلی جنس بیورو کا ایک اعلیٰ وفاقی افسر تھا اور اسلام آباد میں مامور تھا مگر اس کے ماتحت کراچی میں ہمیشہ فعال اور متحرک رہتے تھے۔ کراچی میں ہونے والے بم دھماکے کے سلسلے میں اسے تازہ ترین اطلاعات سے باخبر ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کھانے سے فارغ ہوتے ہی اس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تم نے اس دھماکے کے محرکات کو سمجھ لیا ہوگا" میرے سوال کے جواب میں اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "یہ ان کی دیدہ دلیری اور کھلی دھمکی ہے کہ وہ ہمارے لیے مشکل مسائل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"سنا ہے کہ اس سلسلے میں کسی مشتبہ آدمی کی تلاش زور وشور سے جاری ہے۔"

"تم کراچی میں بیٹھے ہوئے ہو۔ مجھ سے...." اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کراچی میں نہیں، میں لاہور میں ہوں۔ سات بجے والی پرواز سے یہاں پہنچا ہوں۔"

Downloaded from https://paksociety.com

"اوہو!" اس کی بجھی ہوئی آواز میں تازگی عود کر آئی "مجھے اپنا فون نمبر دو' پتا لکھواؤ۔ میں پہلی فرصت میں لاہور آرہا ہوں۔ جو کھیل وہ کھیل رہے ہیں' وہی میرے دماغ میں بھی تھا۔ انہیں یہاں زک پہنچانے کے بجائے ان کے ملک میں مارا جائے گا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔ وہاں ہماری معقول نفری موجود ہے مگر ان کو مناسب رہنمائی نہیں مل رہی۔ یہ خلا تم پورا کرسکتے ہو۔"

"مجھے وہاں کا چیف سیکرٹ ایجنٹ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہیں میرے مزاج کا اندازہ ہے۔ چند ہفتوں بعد میرا وہاں رکنا خطرناک ہوجائے گا۔"

"ان چند ہفتوں میں تم کسی نہ کسی کو تیار کرلوگے۔ میں تمہیں جن تین آدمیوں کے نام دوں گا وہ سب دلیر اور تجربے کار ہیں۔ ملک کے لیے مرمٹنے کے جذبے سے سرشار ہیں لیکن بھارتی سرزمین ان کے لیے اجنبی ہے۔ وہ وہاں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ کوئی بڑا فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں کوئی بھونچال آگیا تو وہ اسلام آباد کے عتاب کا شکار ہوجائیں گے۔"

میں نے زندگی میں کبھی افسری نہیں کی تھی لیکن زندگی کی پرخطر راہوں پر سفر کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جلال کے آخری فقروں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ ان تینوں میں ہمت وحوصلے کی کمی تھی نہ قوت فیصلہ کا فقدان تھا۔ ان کے سامنے کوئی واضح پالیسی نہیں تھی۔

"تم چاہو تو میں انہیں ہٹ اینڈ رن کی تربیت دے سکتا ہوں" میں نے جلال کو اپنے اخذ کیے ہوئے نتیجے سے آگاہ کیے بغیر کہا "وہ اپنے دشمن کی گردن اتاریں گے اور جائے واردات سے غائب ہوجائیں گے۔۔ اپنا کوئی سراغ چھوڑے بغیر!"

"ایسی بے مقصد خوں ریزی ہماری پالیسی کا حصہ نہیں ہے۔" اس کی طرف سے جواب آیا "اس سے کشیدگی بڑھے گی۔"

"کیا اسلام آباد کے بازار اور کراچی کی بولٹن مارکیٹ کے علاقے میں ہونے والی دہشت گردی کو تم بے مقصد کہوگے؟"

"عام آدمی کے نزدیک یہ بے مقصد دہشت گردی ہے مگر متعلقہ فریق پیغام سمجھ گئے ہیں۔"

"بس' ان تینوں کو یہی بات سمجھانی ہوگی۔ عام حالات میں وہ صرف معلومات یکجا کرتے رہیں گے۔" میں نے اس گفتگو کو وہیں ختم کرتے ہوئے کہا "تم نے مشتبہ آدمی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ کراچی میں اس بارے میں رازداری برتی جارہی ہے۔"

"وہ کسی قسم کی نیم فوجی وردی میں تھا اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی' فروٹ کی خالی پیٹیوں میں گھسا ہوا تھا۔ اسے کئی آدمیوں نے دیکھا مگر یہ سمجھ کر نظرانداز کردیا کہ وہ کوئی مناسب جائے پیشاب تلاش کررہا ہوگا۔ دھماکا اسی مقام پر ہوا ہے۔"

"وہ کسی سکیورٹی ایجنسی کا ملازم رہا ہوگا" میں نے بے ساختہ کہا "سب ہی اس قسم کی وردیاں استعمال کرتے ہیں۔"

"بڑے اداروں کے نچلے درجے کے ملازمین بھی وردیاں پہنتے ہیں۔ اب تک چار آدمی حراست میں لیے جاچکے ہیں۔ جلد ہی اس مشق کا کوئی نتیجہ سامنے آجائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ اب تمہارے چہرے کا کیا حال ہے؟ سفر پر کب روانہ ہورہے ہو؟"

"بتدریج بہتری آرہی ہے۔ شاید تین چار دن لگ جائیں۔ یہ وقت میں ہوٹلوں میں گزارنا پسند کروں گا۔ تم نے جعلی شناختی کارڈز کے بارے میں سنا ہوگا۔ سرحد پار سے آنے والے آسانی سے ہم لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں اور کسی کو شبہ تک نہیں ہوتا۔"

"یہ چھوٹے موٹے مسائل مقامی پولیس کے لیے رہنے دو۔ ان پر اپنی توانائیاں ضائع نہ کرو۔"

میرے لیے اس کا جواب قابل قبول نہیں تھا مگر میں نے بحث سے گریز کیا۔ بات وہیں ختم کردی۔ ضروری نہیں تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا' اس کے بڑے بھی وہی سوچتے ہوں۔ ایک ذمے دار سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا عام انسان بھی تھا۔ اپنی رائے قائم کرنے میں وہ چوک سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اس نے جلد ہی لاہور آنے کا وعدہ کرکے فون بند کردیا۔

وہ دن کسی نئی خبر کے بغیر ختم ہوگیا۔ ٹیلی وژن کے مختصر خبرنامے میں کراچی کے نئے سانحے کی فلم دیکھنے کے بعد ہی مسہری پر دراز ہوگیا۔

اگلے دن ہم ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تیاری کے مراحل سے گزر رہے تھے کہ خالد کا فون آگیا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اسے غزالہ کے بارے میں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس خوبو کی مالک ہے۔ شاید اول خان نے بھی اسے اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔ وہ غزالہ کی دیکھ بھال اور تفریح کے لیے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ

Downloaded from https://paksociety.com

ہوٹل لا رہا تھا۔

اس کا پروگرام یہ تھا کہ اس کی بیوی غزالہ کو لے کر لاہور کے بازاروں کی طرف نکل جائے گی اور وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے جائے گا۔ اس نے وہ پروگرام اتنے پرخلوص لہجے میں سنایا کہ میں اس سے اختلاف نہ کر سکا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق آدھے گھنٹے بعد اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل آگیا۔ اس نے نیچے سے انٹرکام پر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دی اور میں غزالہ کے ساتھ کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔

"عورتوں کو بازاروں کی سیر کا بہت شوق ہوتا ہے۔ میرے بہانے وہ اپنا شوق پورا کرے گی اور مجھے تھکا ڈالے گی" غزالہ نے راہ داری میں کہا۔

"مجبوری ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "تم بھی ایک عورت ہو۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ تمہیں بازاروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"مجھے بس انارکلی کا بازار دیکھنے کا شوق ہے۔ اس کی بہت تعریف سنی ہے۔"

"انارکلی پرانے لاہور کا مرکزی بازار ہے۔ شہر کے نئے علاقوں میں کھلنے والے جدید بازاروں کی بھی کافی شہرت ہے" میں نے اسے سمجھایا "آج کی سزا بھگت لو۔ میں خالد کو سمجھا دوں گا۔ شاید کل تم اپنی مرضی سے دن گزار سکو۔"

"بازار جانے سے بہتر تھا کہ میں سلمٰی کے پاس چلی جاتی" غزالہ نے حسرت سے کہا "وہ مجھے اچانک اپنے میکے میں پا کر حیران ہو جاتی۔ پتا نہیں آپ نے اسے کیوں نظرانداز کر دیا۔ جہاز پر اس سے فون نمبر اور پتا ہی لے لیا ہوتا تو آڑے وقت میں اس کا سہارا لیا جا سکتا تھا۔"

غزالہ کو وہ خیال اس وقت آیا تھا۔ لاہور میں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلنے تک سلمٰی کی وہ افادیت ہم دونوں پر ظاہر نہیں ہو سکی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہم لاہور میں اپنی مرضی سے وقت گزار سکیں گے جس کے لیے ہمیں کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی مگر اول خان نے خالد احمد کو ہماری مہمان داری پر مامور کر کے ہمیشہ بیشتر آزادیاں سلب کر لی تھیں۔

نیچے خالد اپنی بیوی کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ اس کی دودھ گوری چٹی، سیک اندام اور خوش رو تھی۔ خوبصورتی کے معیار پر وہ پوری نہیں اترتی تھی۔ اس جوڑے نے بہت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ خالد نے ہمیں اپنی بیوی سے متعارف کروانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ وہ فوراً ہی ہوٹل سے روانگی کے موڈ میں تھا لیکن میں نے لابی میں پڑے ہوئے صوفوں کی طرف پیشوائی کی تو وہ دونوں انکار نہیں کر سکے۔

باہمی مفاہمت کے لیے باتیں ضروری تھیں۔ اسی طرح خالد کی بیوی کا مزاج سمجھ میں آسکتا تھا۔ باتوں کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ میں نے وقت حاصل کرنے کے لیے چائے طلب کر لی۔ اس دوران میں خالد کی بیوی غزالہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو چکی تھی۔

"دفتر کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے آئی ہے۔ ہم اس میں اسٹیشن تھری جائیں گے۔ فرزانہ بیگم صاحبہ کو بازار وغیرہ لے جائے گی۔ تین بجے تک ہم چاروں واپس یہیں لوٹ آئیں گے۔" خالد پورا پروگرام طے کر کے آیا تھا۔

"میری بیوی ذرا بدذوق ہے" میں نے خالد کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا "اس کے زیادہ تر شوق مردانہ ہیں۔ مارشل آرٹس کی شدبد رکھتی ہے اور خاصی مار دھاڑ کر لیتی ہے۔ اسے بازار لے جانا گھوڑے کو گوشت کھلانے کی کوشش کے مترادف ثابت ہوگا۔"

"آج یوں ہی چلنے دیں" خالد ہنستے ہوئے بولا "کل کے لیے کچھ اور سوچیں گے۔ آپ کی دی ہوئی مثال نئی اور انوکھی ہے۔ پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی۔ آپ کے ساتھ چند دن گزار کر شاید میری اردو بہتر ہو جائے گی۔"

"اس مثال کا اردو سے دور دور کا واسطہ نہیں ہے۔ یہ میری اپنی اختراع ہے۔ مدعا ظاہر کرنے کے لیے، جو کچھ ذہن میں آتا ہے بول دینا چاہیے۔ کسی نقاد نے تمہاری زبان سے یہ فقرہ سن لیا تو تمہیں بدزبان قرار دے دے گا۔" میں نے عمر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔

میں نے دو باتیں فوری طور پر محسوس کیں۔ اول خان کی طرح خالد تفکرات میں نہیں گھرا ہوا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کے پہناوے سے قدرے خوش حالی جھلک رہی تھی۔ فرزانہ عورت تھی اس لیے میں نے اس کے مہنگے لباس کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اسے اہمیت دی جاتی تو ان دونوں کو خاصا آسودہ حال قرار دیا جا سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایس ٹی ایف کے افسران کی یافت اتنی نہیں تھی کہ وہ متوسط طبقے سے اوپر جا سکیں۔

لابی میں بیٹھنے والوں کے لیے چائے وغیرہ کی سروس بہت مستعد تھی۔ ذرا سی دیر میں چائے آگئی۔ وہاں آس پاس دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ خالد نے ایک بار بھی میرا اصل نام نہیں لیا۔ مجھے مظہر صاحب اور غزالہ کو بیگم صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتا رہا۔

چائے کا دور ختم ہونے کے بعد ہم چاروں نے اپنی

Downloaded from https://paksociety.com

جگہیں چھوڑ دیں۔ خالد اپنی رفتار تیز کر کے اپنی بیوی کے ساتھ ہولیا۔ غزالہ کے قدم سست ہو گئے۔ اس نے بھانپ لیا کہ خالد اپنی بیوی کو کچھ ہدایات دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"آج جہانگیر کو فون کر کے سلمٰی کا فون نمبر لے لیں گے" غزالہ نے میرے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہا۔

"اس کا انحصار آج کے تجربے پر ہو گا۔ سلمٰی کو چھیڑا گیا تو وہ ہوٹل بھی پہنچ جائے گی۔ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

ہم ہوٹل سے باہر آئے تو دونوں گاڑیاں پورچ میں موجود تھیں۔ فرزانہ نے اپنی سفید گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ خالد نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر پورے احترام سے غزالہ کو بٹھایا اور ہم نے ان دونوں کو رخصت کر دیا۔ ایس ٹی ایف کی لینڈ کروزر میں ڈرائیور موجود تھا۔ ہم دونوں اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور گاڑی غراتی ہوئی' ہوٹل کے احاطے سے نکل کر مال روڈ پر آ گئی۔

مال روڈ سے پل عبور کرتے ہی بائیں جانب فورٹریس اسٹیڈیم نظر آ رہا تھا اور ہم چھاؤنی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ آگے جا کر گاڑی درختوں کے گھنے سائے میں پھیلی ہوئی چکنی سڑک پر داہنی طرف مڑ گئی۔ ہم دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے۔

اسٹیشن تھری چھاؤنی کی حدود میں ایک دور افتادہ' عقبی ویرانے میں واقع تھا۔ وہاں کا ڈسپلن میرے لیے نیا نہیں تھا۔ نام اور مقام بدلا ہوا تھا ورنہ سب کچھ وہی تھا جو میں ایک مدت سے اسٹیشن فورز پر دیکھتا آ رہا تھا۔

میدان کے آخری سرے پر بنی ہوئی لمبی سی بیرک کے سامنے گاڑی روک دی گئی۔ اپنے ماتحتوں کے فوجی سلام کا جواب دیتا ہوا' خالد اپنے دفتر کی طرف ہولیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ میرے لیے یہ احساس تقویت کا باعث تھا کہ لاہور میں بھی مجھے اسپیشل ٹاسک فورس کا تعاون حاصل تھا۔

"سر!" دفتر میں پہنچنے کے بعد خالد تیزی سے میری طرف گھوما "یہ میرا دفتر ہے۔ یہاں آ کر آپ نے میری عزت افزائی کی ہے۔ ہوٹل اور گاڑی میں' میں نے اپنی زبان بند رکھی کیونکہ آپ کی شخصیت کو فورس کے اسٹاف سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟"

"اپنی کرسی پر بیٹھو!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا "جو بات پوشیدہ رکھنا چاہ رہے ہو' وہ اسی وقت تک چھپی رہے گی۔ جب تک میرے ساتھ تمہارا رویہ نارمل رہے گا۔ اس میں تبدیلی سرگوشیوں کو جنم دے گی۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میز کے پیچھے پڑی ہوئی بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے مقابل دوسری کرسی سنبھال لی۔

وہ میری تواضع کا خواہاں تھا مگر میں ناشتے کے بعد ہوٹل سے چائے پی کر چلا تھا۔ میں نے سختی سے اسے روک دیا۔

"سر! آج کل...." اس نے اپنی بات شروع کی تھی کہ میں نے اسے ٹوک دیا۔

"سر نہیں' مظہر... تم نے آپ جناب کا سلسلہ جاری رکھا تو بات پھیلے گی۔"

"بہت مشکل کام ہے" وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا "مگر تم درست کہہ رہے ہو۔ نظریہ ضرورت آدمی کو مجبور کر دیتا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ آج کل لاہور کے حالات بہت بہتر ہیں مگر ہم ایک مدت سے ایک مسئلے سے دوچار ہیں۔ افیم سے ہیروئن بنانے کے لیے ایک کیمیکل استعمال ہوتا ہے جو بھاری مقدار میں بھارت سے اسمگل ہو کر یہاں آتا ہے اور خیبر کے پار تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔"

"اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے کئی ادارے کام کرتے ہیں۔ اس بارے میں انہیں فکر مند ہونا چاہیے۔"

"سب فکر مند ہیں۔ کئی چھوٹے موٹے اسمگلر پکڑے گئے ہیں۔ اس سے اجارہ داری قائم ہو گئی ہے۔ کیمیکل کی مارکیٹ وہی ہے' ڈیمانڈ بھی برقرار ہے۔ پہلے کئی ذرائع اسے پورا کرتے تھے۔ اب صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے اور وہ ہر نگاہ سے اوجھل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کیسے ہو رہا ہے۔"

مجھے یہ سن کر صدمہ ہوا کہ اسٹیشن تھری والے اسمگلنگ جیسے ایک عام مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں جب کہ ان کے لیے ملکی سلامتی کے دوسرے معاملات بھی یقیناً موجود رہے ہوں گے لیکن پھر میں نے اپنی رائے بدل دی۔ اگر خالد اس بارے میں تشویش میں مبتلا تھا تو وہ یقیناً کوئی سنگین مسئلہ تھا۔ ہیروئن پورے پاکستان کے لیے ایک بھیانک لعنت تھی۔ وہ باہر ضرور بھیجی جا رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ گزر گاہوں پر بھی فروغ پا رہی تھی۔ اگر اس پر براہِ راست قابو پانا دشوار تھا تو اس کی تیاری میں استعمال ہونے والے بنیادی کیمیکل کی آمد روک کر اس فتنے پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

"پکڑے جانے والے اس بارے میں کیا بتاتے ہیں؟" میں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"تین چار برس پہلے تک بھاری نفع دینے والا یہ کاروبار ان ہی چند لوگوں کے قبضے میں تھا۔ پھر بہت تیزی سے ان کا

Downloaded from https://paksociety.com

کام سکڑتا چلا گیا۔ ہیروئن پر کوئی زوال نہیں آیا تھا۔ وہ اسی پیمانے پر تیار کی جارہی تھی۔ انہوں نے کھوج لگایا تو پتا چلا کہ ان کا کوئی پراسرار حریف پیدا ہوچکا تھا جو براہِ راست سرحدوں پر کیمیکل پہنچا رہا تھا۔"

"تم اس طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ یہ سوال مجھے مسلسل پریشان کررہا ہے" میں نے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"ہیروئن لاہور میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ کئی نام ور تعلیمی اداروں میں لڑکوں کے علاوہ لڑکیاں ہیروئن پیتے ہوئے پکڑی گئی ہیں۔ تعلیمی اداروں اور طلبا وطالبات کے معزز گھرانوں کی بدنامی کے خوف سے یہ خبریں دبادی جاتی ہیں۔ جب کوئی نشہ غریب اور مزدور پیشہ طبقے سے نکل کر پڑھے لکھے لوگوں میں اس طرح مقبول ہونے لگے تو وہ قوم کی رگوں میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ اس ہولناک وبا نے سب کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ ہم کب تک اپنی آنکھیں بند رکھ سکتے تھے۔"

"تم پہلے سے ان معاملات کی طرف متوجہ نہیں تھے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میری سوچ بھی وہی تھی جو پہلے تم نے بیان کی ہے۔ اسمگلنگ اور چوری چکاری ہمارے شعبے نہیں ہیں۔ بعض ادارے دن رات ان ہی کے انسداد کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہیے مگر وہ ناکام رہے۔ وبائی لہر بڑھتی چلی گئی۔ آج لاہور کے باغات میں پارکوں میں ہزاروں میلے کچیلے اور گندے نوجوان اس نشے میں بے خبر پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں جاہلوں سے زیادہ پڑھے لکھے بچے ہیں۔ بے یارومددگار لوگوں سے زیادہ تعداد متوسط طبقے کی ہے۔ بعض کا تعلق آسودہ گھرانوں سے ہے۔ ہم ایک سرحدی شہر میں رہ رہے ہیں۔ میرے آدمی دشمن کے ایجنٹوں کی گھات میں دن رات ایسے ٹھکانوں کا طواف کرتے رہتے ہیں جہاں کوئی بھی روپ دھار کر آسانی سے خود کو چھپا سکے۔ ان کی ہوش ربا رپورٹوں سے پریشان ہوکر میں نے تین مہینے پہلے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن ابھی تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی۔"

مجھے معترف ہونا پڑا کہ وہ صحیح سمت میں کام کررہا تھا۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ اس راہ پر نہ لگتا تو اپنے فرض سے روگردانی کا مرتکب ہوتا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا "کیمیکل بھارت سے آتا ہے تو لاہور میں اس کے مضافات سے ضرور گزرتا ہوگا۔ پھر وہ اچانک سرحدی علاقے میں کیسے پہنچ جاتا ہے۔ راستہ بہت طویل ہے۔ صحیح دیکھ بھال کی جائے تو وہ کہیں نہ کہیں ضرور پکڑا جائے گا۔ اس کام میں کہیں نہ کہیں کوتاہی ہورہی ہے۔"

"مجھے خود اعتراف ہے کہ کہیں کوتاہی ہورہی ہے۔ مگر کہاں؟ ہم یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہیں" اس نے بے بسی سے کہا "اچانک چیک پوسٹیں قائم کرکے شمال کی طرف جانے والا سوفیصد کارگو چیک کیا گیا ہے۔ جی ٹی روڈ پر ٹرکوں اور ٹینکروں کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئیں مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"

"جی ٹی روڈ کے بجائے وہ کوئی متبادل راستہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"اس امکان پر بھی کام ہوچکا ہے۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا" خالد کی آواز سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

"تم نے مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے" میں نے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا "اب مجھے بھی اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

"میرے لیے تمہاری یہ یقین دہانی کافی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم سوچتے ہو تو تمہارا ذہن بالکل نئی راہوں پر کام کرنے لگتا ہے۔"

"یہ مبالغہ ہے۔ کامیابیاں جس کو بھی ملتی ہیں، قدرت کی مہربانی سے ملتی ہیں۔ اس میں کوشش کا دخل کم ہوتا ہے۔"

اس نے مجھے اسٹیشن تھری کی کارکردگی اور کامیابیوں کے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ اس کی گفتگو میں کہیں بھی ذاتی نمود ونمائش کا دخل نہیں تھا۔ وہ جو کچھ بتا رہا تھا، جمع متکلم کے صیغے میں بتا رہا تھا۔ ایس ٹی ایف ہر قسم کے ریکارڈ سے ماورا، ایک غیر روایتی فورس تھی اس لیے خالد کے پاس کوئی ریکارڈ تھا نہ چارٹ یا گراف جو کچھ تھا، اس کے سینے میں محفوظ تھا اور زبان پر چلا آرہا تھا۔

اس نے مجھے پورے کیمپ کی سیر کرانے کی پیشکش کی جسے میں نے نرمی سے رد کردیا۔ میں پورے کیمپ میں گھومنا شروع کرتا تو فورس کے سارے کارندوں میں تجسس کی لہر دوڑ جاتی کہ ان کا کیمپ کمانڈر کسے ہر شعبے کا معائنہ کرا رہا تھا۔ ان لوگوں کا وہ تجسس میرے لیے سودمند نہیں تھا۔ میں نے بس اس کے اسلحے خانے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اول خان کی جمع کی ہوئی اشیا سے ملنے والی انگوٹھیوں کی طرح مجھے خالد کے اسلحہ خانے سے بھی کچھ ایسے شعبدے مل جائیں گے جو بھارت کے سفر میں میرے کام آسکیں گے مگر وہاں روایتی ہتھیاروں کے سوا کوئی غیر معمولی چیز موجود نہیں

Downloaded from https://paksociety.com

تھی۔

مجھ سے تفصیلی گفتگو اور میرے رویے کے مشاہدے کے بعد خالد نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلی تھی کہ اس کی طرف سے دیا جانے والا کوئی بھی غیر معمولی پروٹوکول میرے لیے دشواریوں کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے مجھے اور غزالہ کو ایس ٹی ایف کے مہمان کا درجہ دے کر ہوٹل میں ہماری رہائش کا بندوبست کردیا تھا۔

میں نے اس کے دفتر سے اول خان کو فون کیا تو وہ اسٹیشن فورپر ہی موجود تھا۔ اس وقت سی ایس ڈی میرے ساتھ موجود تھی۔ میں نے فون کے ساتھ اسے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب میں ہوٹل کے فون سے جلال سے کھلی کھلی باتیں کرسکتا تھا تو اسٹیشن تھری سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"کچھ پتا نہیں چل رہا" میرے استفسار پر اول خان نے جواب دیا "میں جو کچھ تمہیں بتا چکا ہوں' میری معلومات وہیں تک محدود ہیں۔ شاید اوپر سے کچھ احکام آئے ہیں۔ اس معاملے کو ٹاپ سیکرٹ رکھا جارہا ہے" بات شروع ہوتے ہی خالد دفتر سے باہر جاچکا تھا۔

"اس بارے میں تم نے جلال سے کوئی بات کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تم سے بے تکلف ہے۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی چکر میں الجھا رہتا ہے۔"

"میری اس سے رات کو بات ہوئی تھی' چار آدمی حراست میں لیے جاچکے تھے۔ ان لوگوں کو ایک مشتبہ باوردی شخص کی تلاش ہے۔"

اول خان کی بے جان سی ہنسی کی آواز آئی "اب دیکھ لو۔ تم لاہور جاکر بھی باخبر ہو۔ میں کراچی میں بیٹھا ہوا ہوں اور یہاں ہونے والی پیش رفت سے بے خبر ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ جلال اسے کوئی کام کی بات معلوم ہوسکے گی۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے۔ اندازے کی غلطی کسی سے بھی ہوسکتی ہے" میں نے اسے دلاسا دیا۔

میرا جواب سن کر وہ جھلا گیا۔ میں نے اس سے گفتگو کو زیادہ طول نہیں دیا اور بات ختم کرکے خود بھی خالد کے دفتر سے باہر آگیا۔ وہ برابر والے کمرے میں شاید میرے فارغ ہونے کا منتظر تھا۔ فوراً مجھ سے آملا۔

دو بجے میں اسٹیشن تھری سے روانہ ہوگیا۔ اس مرتبہ خالد کا ڈرائیور' اس کی دفتری گاڑی میں مجھے ہوٹل لے جارہا تھا۔

چابی کی بورڈ پر موجود تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ غزالہ اور فرزانہ کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ہوٹل واپسی کے لیے تین بجے کا تعین کیا گیا تھا۔ فرزانہ وقت پورا ہونے سے پہلے غزالہ کی جان چھوڑنے والی نظر نہیں آتی تھی۔

چابی کے ساتھ پیغام کی ایک سلپ بھی منسلک تھی۔ اس پر جلال کے نام کے نیچے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ فون نمبر کے ساتھ کوئی کوڈ نہیں تھا جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ لاہور پہنچ چکا تھا اور یقینی طور پر خود ہوٹل آیا تھا۔ میں کاؤنٹر سے چابی لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے بیلٹ ڈھیلی کی' پتلون میں اڑسی ہوئی قمیص باہر نکالی' جوتوں اور موزوں سے نجات حاصل کی اور مسہری پر بیٹھ کر جلال کا چھوڑا ہوا نمبر ملالیا۔

وہ کسی دفتر کا فون نمبر تھا۔ اس وقت جلال وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے مظہر خان کے نام سے پیغام چھوڑ دیا۔ اسے یاد ہونا چاہیے تھا کہ میں اپنی سفری ضروریات کے تحت اپنا نام تبدیل کرچکا تھا۔ نام یاد نہ ہوتا تو وہ ہوٹل میں میرے لیے پیغام نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

غزالہ ساڑھے تین بجے تھکی ہاری اور خالی ہاتھ واپس آئی۔ اس نے فرزانہ کو بمشکل نیچے سے رخصت کیا تھا۔ کاؤنٹر پر کمرے کی چابی نہ پاکر ان دونوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں کمرے میں واپس پہنچ چکا تھا۔ میری موجودگی کی بنا پر فرزانہ کمرے تک آنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کرسکی تھی۔

"حیرت ہے کہ بازار میں سارا دن گزارنے کے بعد تم بالکل خالی ہاتھ واپس آئی ہو۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"میرا دماغ خراب ہوگیا۔ پورے شہر میں بازار ہی بازار پھیلے ہوئے ہیں۔ دبئی سے کراچی پہنچنے والی شاپنگ مالز اور پلازوں کی وبا لاہور میں بھی عروج پر ہے۔ ہر جگہ تماشائی بے شمار ہیں اور خریدار نایاب۔ جو پھنس جاتا ہے' دکان کا سارا خرچ اسی سے وصول کرلیا جاتا ہے۔ بلا کی مہنگائی ہے یہاں!" غزالہ بیٹھ گئی۔

"تمہیں کچھ خریدنا ہی نہیں تھا تو سستے اور مہنگے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل شوق فرزانہ کا تھا۔ تمہارے بہانے اس نے دل کھول کر خریداری کی ہوگی۔"

"اس نے انارکلی سے صرف ایک دوپٹا لیا۔ وہ پورے خلوص سے مجھے لاہور کے بازار دکھاتی پھر رہی تھی۔"

"بن سنور کر آئی تھی۔ خاصی فیشن ایبل عورت ہے

Downloaded from https://paksociety.com

اور اس نے صرف دو پٹا لیا؟"

"وہ بہت سیدھی اور پرخلوص عورت ہے۔ دونوں میاں بیوی ہم سے ملنے کے لیے بن سنور کر آئے تھے۔ آمدنی محدود اور حسرتیں لامحدود ہیں۔ وہ ذرا بھی تیزی اور طراری دکھاتی تو میں اسے کسی اسٹور میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر خاموشی سے ہوٹل لوٹ آتی۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے اسے پرکھ لیا۔ خالد' اول خان کا ہم منصب ہے لیکن عمر میں اس سے بہت چھوٹا ہے۔ مجھے الجھن ہو رہی تھی کہ اس کا معیار زندگی اتنا بلند کیسے ہے۔ ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ تم نے میرے ذہن سے یہ بوجھ اتار دیا۔"

"میں ہمیشہ آپ کے لیے آسانیاں تلاش کرتی رہتی ہوں۔" وہ مسکرا دی "خالد سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟"

"میں این جی اوز کے خلاف کچھ کام کرنے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ وہ ہیروئن کے چکر میں پریشان ہے۔"

"ہیروئن؟ ایس ٹی ایف والے کب سے اینٹی نارکوٹکس فورس میں شامل ہو گئے؟"

میں نے اسے اختصار کے ساتھ خالد کا مسئلہ سمجھا دیا۔ وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ان حالات میں اس کی پریشانی بجا ہے۔ میں سوچ کر آئی تھی کہ آپ کو ہیومن سوسائٹی کے بارے میں بتاؤں گی۔ آج فرزانہ نے مجھے آدھا لاہور گھمایا ہے۔ ہر طرف ان کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔"

"یہ ہیومن سوسائٹی کیا بلا ہے۔" میں نے بے پروائی سے پوچھا۔

"چلتی ہوئی گاڑی سے میں جلی سرخیاں پڑھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ عطیات کی اپیلوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی فلاحی تنظیم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی این جی او ہی ہو۔ اس پر کچھ کام کیا جا سکتا تھا لیکن اب یہ قصہ ہی ختم ہو گیا۔ ایس ٹی ایف کو کیمیکل کے اسمگلروں کی تلاش ہے۔"

"یہ بہت اہم کام ہے۔" میں نے کہا "ناخواندہ اور نیم خواندہ قبائلی ہیروئن کو کاروبار اور افیم کی پیداوار کو زراعت کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر افیم کی کاشت کو ختم کرنا ممکن نہیں تو پھر اسے افیم تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ کیمیکل کی سپلائی لائن ختم کر دی جائے تو افیم کو ہیروئن میں تبدیل کرنے کا عمل تھم جائے گا۔"

"بھارت سے راستہ بند ہو گا تو مغربی کمپنیاں اپنا کیمیکل بھیجیں گی۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ اس سے ہیروئن بن رہی ہے یا کوئی اور کام لیا جا رہا ہے۔ ایٹمی پرزوں کی فروخت کے قضیے میں یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ ایک پرزے کے دس استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایٹمی استعمال بھی ہے۔ بیچنے والے کو سب معلوم ہوتا ہے لیکن بات عدالت تک جا پہنچے تو بیچنے والا انجان بن جاتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ خریدا روہ پرزے کہاں استعمال کرے گا۔ آزاد معیشت میں زہر سے تریاق تک' سب کچھ بیچنے اور خریدنے کی کھلی چھوٹ ہوتی ہے۔"

"ماشاء اللہ!" میں نے تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چار کا ٹولہ ٹوٹتے ہی تم بھی بولنے لگی ہو۔"

"دوسرے بولتے رہتے ہیں تو میں سن کر لطف اندوز ہوتی ہوں۔ اب کوئی اور نہیں ہے تو میں ہی آپ کی مشیر ہوں۔"

"مشیر صاحبہ! تم نے ہیومن سوسائٹی کا ذکر کر کے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اتنے پوسٹر دیکھے تھے تو رک کر کسی ایک کو پڑھ بھی لیا ہوتا۔"

"راستے میں رک کر میں اشتہار پڑھنے کھڑی ہوتی تو تماشا بن جاتی۔"

"ہیومن سوسائٹی کے بارے میں فرزانہ کی کیا رائے ہے۔ اس سے تم نے بات تو کی ہو گی۔"

"مجھے کچھ پتا ہی نہیں تو کیا بات کرتی۔ شام کو باہر نکلیں تو خود کوئی پوسٹر پڑھ لیں۔"

"اب باہر جانے کا موڈ نہیں ہے۔ شام ہی کو دیکھا جائے گا۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور بات ٹل گئی۔

غزالہ کی زبان سے ہیومن سوسائٹی کا ذکر سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ وہ ہوٹل سے گھومنے کے لیے نکلی تھی لیکن اپنے گردوپیش سے غافل نہیں رہی تھی۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے اپنے گردوپیش پر گہری نگاہ رکھی تھی۔ اسے جو کچھ غیر معمولی نظر آیا' وہ اس نے من و عن میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ کراچی سے روانہ ہوتے ہوئے این جی اوز کے بارے میں میرا ذہن صاف نہیں تھا۔

اگر این جی اوز صرف خدمت خلق اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ ہوتیں تو وہ خسارے کا سودا تھا۔ ہمارے ملک میں لوگوں کے لیے ان میں ذرا بھی کشش نہ ہوتی۔ جہاں لوگ ہر قیمت پر اور ہر ذریعے سے پیسا بنانے پر تلے ہوئے ہوں وہاں کون اس خالص فلاحی کام کی طرف متوجہ ہوتا لیکن ملک بھر میں این جی اوز خودرو برساتی پودوں کی طرح پھیلی تھیں۔

Downloaded from https://paksociety.com

ای بہبود کا وہ فلاحی نظریہ پاکستان میں در آمد ہوتے ہی بہت
ول ہوا تھا۔ اس ضمن میں ہمارا واسطہ صرف دو اداروں
ے پڑا تھا اور وہ دونوں ہی پکے فراڈ اور غیر ملکی وظیفہ خور
ت ہوئے تھے۔

غزالہ نے ہیومن سوسائٹی کے بارے میں سرسری طور
جو کچھ دیکھا یا پڑھا تھا وہ میرے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔
رے ذہن پر ایک طرف خالد کا بتایا ہوا مسئلہ سوار تھا اور
سری طرف ہیومن سوسائٹی کا تجسس سوار ہوگیا تھا۔ اس
ت میں خالی الذہنی کے عالم میں بستر پر دراز تھا۔ رہ رہ کر
نوں مسائل میرے ذہن کو کچوکے لگا رہے تھے۔ میرے
امنے کوئی سرا نہیں تھا جس سے پیش رفت میں کوئی مدد ملتی۔
بری طبیعت مضطرب ہونے لگی۔

جب وہ ذہنی دباؤ بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہوگیا تو
ں نے مجبور ہو کر اسٹیشن تھری کا نمبر ملالیا۔ خالد اپنے دیے
وئے اس نمبر پر موجود تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ یہ تمہارا فون ہوگا۔" اس کی
آواز مسرت سے لبریز تھی "ادب اور احترام کو خیرباد کہہ کر
نہیں عاصیانہ انداز میں مخاطب کرنا مجھے بہت عجیب محسوس
ورہا ہے مگر مجبوری ہے کیونکہ یہ تمہارا حکم ہے اور قرین
صلحت نظر آتا ہے۔"

"تم نے کبھی این جی اوز پر کوئی کام کیا ہے؟" میں نے
وقت ضائع کرنے کے بجائے براہِ راست سوال کر ڈالا۔

"ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن پچھلے ڈیڑھ دو سالوں
میں اچانک ان کی بڑی تعداد سامنے آئی ہے۔"

"انہیں چلانے والے کچھ لوگ مخلص بھی ہوں گے مگر
میرا تجربہ ہے کہ بیشتر مال بنانے کے چکر میں ہیں۔ بیرونی ملکوں
سے ملنے والی غیر سرکاری امداد فرضی منصوبوں کی آڑ میں
ہضم کرجاتے ہیں۔ اصل سرمایہ کاری کا دو چار فیصد ہی کسی
جائز مد میں خرچ ہوتا ہوگا۔"

"انہیں چلانے والے بہت سے لوگوں کا ماضی صاف
نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"ان میں ہیومن سوسائٹی نامی کوئی ادارہ بھی شامل
ہے؟" میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"اس کا نام بہت اونچا جارہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے
کام کے ذریعے نیک نامی کمائی ہے۔ بظاہر ان کے ہاتھ صاف
نظر آتے ہیں۔"

"وہ کس شعبے میں کام کررہے ہیں؟ اسے چلانے والے
کون ہیں؟ مجھے یہ معلومات درکار ہیں۔"

"ان کی سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات میں بہت
کچھ چھپتا رہتا ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ یہ لوگ اسی طرح دل
جمعی سے کام کرتے رہے تو لوگ ان کے نام پر آنکھیں بند
کرکے عطیات دینا شروع کردیں گے۔ پہلے انہوں نے بے
لباس لوگوں کو لباس فراہم کرنے کے تعزے سے ابتدا کی
تھی۔ پرانے کپڑے جمع کرکے موسمی ضروریات کے مطابق
ضرورت مندوں تک پہنچاتے تھے اب خوراک اور گھر کی
مرمت کے لیے امداد بھی فراہم کرتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے
سرحدی علاقوں میں ہیومن سوسائٹی کا نام بہت قدرو منزلت
رکھتا ہے۔ انہوں نے برفانی طوفان کے دنوں میں بے خانماں
افغان مہاجرین اور قبائلیوں کے لیے بہت کام کیا تھا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے کہا "رکنے کی ضرورت
نہیں۔ جو کچھ یاد آتا ہے' دہراتے چلے جاؤ۔ میرے لیے یہ
سب باتیں نئی ہیں۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے ذہن میں یہ نام کیوں آیا
ہے۔ لاہور میں کئی ایسی بدنام این جی اوز ہیں جن پر براہِ
راست ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔"

"جو بدنام ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ
نیک نامی کی آڑ میں کوئی گھناؤنا کھیل نہ کھیلا جارہا ہو۔"

"چوہدری عظمت اور ملک اقبال اس سوسائٹی کے روح
رواں ہیں۔ دونوں تجارت پیشہ ہیں۔ چوہدری عظمت پہلے
سے آسودہ حال تھا۔ اس نے اپنے پیسے سے یہ نیک کام
شروع کیا تھا۔ ملک اقبال اس کا دوست ہے۔ اس کی مالی
حیثیت کمزور تھی۔ ان دنوں وہ بالا کہلاتا تھا۔ اب وہ بھی پھل
پھول رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہیومن سوسائٹی کے کاموں کی
خیروبرکت سے اس کا کاروبار بھی چمک اٹھا ہے۔ یہ لوگ کوئی
سرکاری گرانٹ نہیں لیتے۔ نجی عطیات سے کام چلاتے
ہیں۔ باہر سے انہیں کوئی مالی امداد ملتی ہو تو میں اس سے لاعلم
ہوں۔ یہ دونوں عبدالستار ایدھی کے بہت مداح ہیں۔"

"تم بتا رہے تھے کہ ہیومن سوسائٹی سرحدی علاقوں میں
زیادہ مقبول ہے۔ یہاں شاید ان کا کام کم ہے۔"

"ہیومن سوسائٹی کی داغ بیل لاہور میں ڈالی گئی تھی۔
اس کا ہیڈ آفس بھی یہاں ہے مگر ان کا کام سرحدی علاقے
میں زیادہ ہوتا ہے۔"

"تمہیں یہ بات عجیب محسوس نہیں ہوتی کہ یہ اپنے شہر
کے غریبوں اور ضرورت مندوں کو چھوڑ کر اتنی دور کام
کررہے ہیں۔"

"کبھی غور نہیں کیا۔ شاید اس علاقے کو ترجیح دینے کا

Downloaded from https://paksociety.com

سبب وہاں کا موسم اور بے روزگاری کی شرح ہو۔"

"مجھے یہ لوگ دلچسپ نظر آرہے ہیں۔ میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنا چاہتا ہوں۔"

"شاید اس کام میں کوئی دشواری نہ ہو۔ جو کچھ مل جاتا ہے' وہ میں شام کو ہوٹل پہنچادوں گا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ اس نے شام کی اصطلاح استعمال کی تھی جو بہت طویل دورانیے کا احاطہ کرتی ہے۔ اسے آٹھ بجے کے بعد کا وقت دے کر میں نے فون بند کردیا۔

ریسیور رکھتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ آپریٹر نے بتایا کہ جلال ہماری لائن فارغ ہونے کے انتظار میں کافی دیر سے ہولڈ پر تھا۔

اس سے دو مرتبہ آنکھ مچولی ہوچکی تھی۔ وہ ہوٹل آیا تو ہم دونوں غائب تھے۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ دفتر میں نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر مجھ سے ملنے کا خواہاں تھا کیونکہ رات کی پرواز سے وہ اسلام آباد واپس جارہا تھا۔ میں نے کسی پس و پیش کے بغیر ملاقات پر آمادگی ظاہر کردی۔

"سلسلہ چل پڑا ہے۔" غزالہ نے معنی خیز لہجے میں کہا "مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

"ہم لاہور آئے ہیں تو بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت ہے۔ کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے فرزانہ کے ساتھ بازار جاکر اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ ایک کام کی بات لے کر واپس آئی ہو۔"

"تھوڑی دیر میں جلال آجائے گا۔ آپ اسے اوپر بلائیں گے یا نیچے جاکر ملیں گے؟" اس نے وال کلاک پر نظر ڈال کر پوچھا۔

"نیچے ملنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہاں آزادی سے بات نہیں ہوسکے گی۔ میں اسے اوپر بلاؤں گا۔ تعارف ہونے کے بعد تم کچھ دیر کے لیے نیچے چلی جانا۔ ہوٹل سے باہر نکلے بغیر تم اپنا وقت گزار لوگی۔ ہم تخلیے میں ذرا کھل کر بات کرسکیں گے۔"

"ہیومن سوسائٹی کے بارے میں اس سے بھی ذکر کریں گے؟" غزالہ نے سوال کیا۔

"نیم دلی سے کوئی کام مکمل نہیں ہوتا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالو' اپنے پورے وسائل کے ساتھ ڈالو۔ میں اس نے ضرور تذکرہ کروں گا۔ کچھ معلوم ہو یا نہ ہو' تذبذب تو ختم ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے دوسری ملاقات کی نوبت نہ آسکے۔"

اس نے اپنے بیگ کی زپ کھول کر شناختی کارڈز اور پاسپورٹوں والا لفافہ میرے حوالے کردیا۔

جلال نے ہوٹل پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ ش اس کی وجہ یہ تھی کہ ہوٹل شہر کے مرکزی علاقے سے بر قریب واقع تھا۔ انٹر کام پر اپنی آمد کے اطلاع دے کروہ لف کے ذریعے اوپر آیا تو میں اس کے استقبال کے لیے کمرے دروازے پر موجود تھا۔

"تمہارا چہرہ تو واقعی بگڑا ہوا ہے۔" اس نے آتے تحیر زدہ آواز میں تبصرہ کیا اور گلے لگ گیا "یہ دو چار دن میں کیسے ٹھیک ہوجائے گا؟"

"دیکھتے رہو۔ قوت ارادی بھی کوئی چیز ہے۔ یہ مضبو ہو تو ایک مرتبہ مردہ بھی بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔"

وہ میرے ساتھ کمرے میں آگیا۔ اس نے مہذب اند میں غزالہ کو سلام کیا تو اس کی نگاہوں میں تجسس تھا۔ وہ دونوں سے مل لیا تھا اور ویرا کا متلاشی تھا۔

"این کاویل دو تین بعد لاہور آئے گی۔" میں نے اس کے کسی سوال سے پہلے' دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ اسے آگاہ کیا "فی الحال وہ کراچی میں ہے۔"

"آپ دونوں باتیں کریں۔ میں نیچے سے ہو کر آتی ہوں۔" غزالہ نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔

"جارہی ہو تو روم سروس والوں سے چائے اور کچھ لوازم کے لیے کہہ دینا۔" میں نے اسے ہدایت کی اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

"فون پر میں اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ تمہارا چہرہ اتنا زیادہ متاثر ہوا ہوگا۔" وہ غور سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تمہارے ساتھ خاصی زیادتی ہوئی ہے۔"

"اس کا کوئی غم نہیں ہے۔ ان دونوں کو میرے زخموں کی قیمت اپنے خون سے چکانی پڑی تھی۔"

"مجھے تمہاری طرف سے ہر آن دھڑکا لگا رہتا ہے۔" اس نے سگریٹ لگاتا ناصحانہ انداز میں کہا "ہر کام میں بے دھڑک کود پڑتے ہو۔ تمہیں اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ مار دھاڑ سے بچنے کے لیے تمہیں ہر وقت ایک دو محافظوں کے ساتھ چلنا چاہیے تاکہ ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔"

"بھائی! میں ماروتی سے مل کر اسپتال سے لوٹ رہا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ حرام زادے میری گھات میں بیٹھے ہوں گے۔"

"اب اسے دہرانا بے سود ہے۔ اس وارننگ کے بعد تمہیں محتاط ہوجانا چاہیے۔ لاؤ' تمہارے پاسپورٹ وغیرہ

Downloaded from https://paksociety.com

کہاں ہیں۔"

میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لفافہ کھول کر تینوں پاسپورٹوں کا جائزہ لیا اور انہیں دوبارہ لفافے میں ڈال لیا۔ "یہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دوسرے کام ہو جائیں گے لیکن پاکستان سے روانگی کی مہر تمہارے پروگرام کے مطابق لگے گی۔ اس میں فرق ہوا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"اس بارے میں' میں تمہیں فون پر بتا دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ کراچی کی کیا خبر ہے!"

"وہ مردود شخص پکڑا گیا۔ ایک کمپنی میں دربان ہے۔ اس کے پاس وہی گھسی پٹی کہانی ہے۔ اسے ایک تھیلا چوبی پیٹیوں میں پہنچانے کے لیے ایک ہزار روپے دیے گئے تھے۔ تھیلا دینے والا اس کے لیے اجنبی تھا پھر بھی لالچ اسے لے ڈوبا۔"

"یہ لالچ اس کی زندگی برباد کر دے گا۔ حیرت ہے کہ بار بار کے اعلانات کے باوجود لوگ ایسے جال میں آجاتے ہیں۔"

"بظاہر اس کا بیان درست نظر آتا ہے۔ مگر اس کا جرم اتنا سنگین ہے کہ وہ بدترین سزا کا حق دار بن چکا ہے۔ اس سے باز پرس اب بھی جاری ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اسے تھیلا دینے والا کوئی مقامی تھا یا کوئی ایجنٹ۔ یہ نکتہ صاف ہو تو بھارتیوں کے عزائم کا اندازہ ہو سکے گا۔"

"ہمارے لیے ان کے عزائم کبھی نیک نہیں ہو سکتے۔ وہ بغل میں چھری رکھ کر منہ سے رام رام کرنے والے لوگ ہیں جب بھی موقع ملے گا' وار کر گزریں گے۔"

"یہ پرچہ احتیاط سے رکھ لو۔" اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اس پر ان تینوں کا فون نمبر اور پاس ورڈ لکھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے نام اور ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ تم دہلی پہنچ کر ان سے رابطہ کرو گے تو بقیہ معلومات وہ خود فراہم کر دیں گے۔"

"نام اور ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں تو پھر یہ فون نمبر بھی بدلتا رہتا ہوگا۔" میں نے اعتراض کیا۔ "پاس ورڈز تین ہیں۔ نمبر ایک ہے۔"

"یہ ان کے رابطے کا آدمی ہے۔" جلال نے پہلو بدل کر وضاحت کی "ان میں سے کوئی موجود نہ ہوا تو وہ شخص تمہیں

حسین سے حسین تر بننے کیلئے

گلیسی یوتھ فل کریم

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے

برسہابرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ۲۰ قیمتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے چہرے کی رنگت نکھارتی ہے۔

اسٹاکسٹ:

- خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
- صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
- مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
- ابراہیم میں لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
- قمری داخانہ ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
- قمری بازار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریحانہ بازار فیصل آباد
- نوری داخانہ، کچہری روڈ سرگودھا
- بی زاد میڈیکل اسٹور بیرانج روڈ سکھر
- طاہر شاپنگ سینٹر ریل بازار لاڑکانہ
- علی ہومیو اسٹور اچھرہ لاہور
- انیس اے ہومیو اسٹور ریلوے روڈ لاہور
- راجہ اینڈ اورز فیصل بازار سیالکوٹ
- شہزاد جنرل اسٹور کچہری بازار گوجرانوالہ
- فضیلہ ٹی سینٹر مدینہ مارکیٹ سٹیلائٹ روڈ فیصل آباد
- شاہی طبی داخانہ پیپلز بازار فیصل آباد
- پنجاب جنرل اسٹور کچہری روڈ سرگودھا
- شہباز جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ سٹیلائٹ روڈ فیصل آباد
- رمضان پنساری کو شالہ روڈ غلہ منڈی ملتان
- علی ہومیو اسٹور سرگلہ گجرات
- نئی ہومیو اسٹور اقبال چوک روالپنڈی
- لطیف گیسٹ چاندنی چوک راولپنڈی
- مشتاق دواخانہ پاک گیٹ ملتان
- میاں ہومیو اسٹور گرجاکھ چوک ساہیوال
- المدینہ جنرل اسٹور اسلام آباد روڈ لاہور
- لن ہیلا اسٹور گھنٹہ گھر بازار حیدرآباد
- تنویری داخانہ شاہی بازار بہاولپور
- محمد صالحین اینڈ سنز مٹی والے چوک بازار ملتان
- حق اللہ۔ ل اسٹور پہنچاں روڈ چاکوال
- بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کیہ راولپنڈی
- خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
- احسن محمود مدینہ میکل میاں محمد روڈ میرپور بھاور
- عوامی دواخانہ مین بازار مظفر آباد آزاد کشمیر
- پی پی پشاور اسٹور ہیری کشن روڈ، کوئٹہ
- دکن پشاور اسٹور ہیری کشن روڈ، کوئٹہ
- انعام گیسٹ ختمی روڈ سرگودھا
- سعید ٹیسٹی اسٹور اندرون لنگ گیٹ کوہاٹ
- دارالشفاء جنرل بازار منگورہ سوات
- ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور

ڈسٹری بیوٹر:۔ ریاض محمود ۶۹ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ شاہی طبی دواخانہ بوہڑ بازار راولپنڈی

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لئے

محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار، ملتان۔

حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

Downloaded from https://paksociety.com

وقت دے دے گا۔ تم مقررہ وقت پر دوبارہ فون کرو گے تو تمہارے مطلوبہ آدمی سے بات ہوجائے گی۔"

"تین کے بجائے ایک ہی نام ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔" میں نے وہ رقعہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ کام یا کسی خطرے کی وجہ سے ان میں سے کوئی دستیاب نہ ہو۔ ایسی صورت میں تمہارے پاس متبادل رابطہ موجود رہے گا۔ ایک نام ہوا تو اس کے زیرِ زمین ہونے کی صورت میں تم کچھ بھی نہیں کرسکو گے۔ یہ تینوں ہمارے بہترین آدمی ہیں۔"

"میں کسی ایک ہی سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے اس کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد کہا "وہ کسی وجہ سے رابطے میں نہ آسکا تو متبادل کے بارے میں سوچوں گا۔"

"یہ تمہاری مرضی اور سہولت پر منحصر ہوگا۔ وہ تینوں ایک گندھی ہوئی ٹیم کی طرح کام کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ رہ کر نکھر جائیں گے۔"

"جانے سے پہلے ہم ان کے بارے میں پھر بات کرلیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ ہیومن سوسائٹی کے بارے میں کیا مدد کرسکتے ہو۔"

"تمہیں اچانک ہیومن سوسائٹی کیوں یاد آگئی؟" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور روم سروس کا ویٹر چائے کی ٹرے سنبھالے اندر آگیا۔ چائے سرو ہونے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ ویٹر اپنا کام ختم کرکے چلا گیا تو میں نے کہا "ہیومن سوسائٹی انٹیلی جنس بیورو کے لیے بھی اجنبی نہیں تھی اور وہ لوگ کسی مضبوط جواز کے بغیر کسی فرد یا ادارے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔"

جلال کی واپسی کے چند منٹ بعد غزالہ کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کا مزاج ویرا کی طرح جارحانہ نہیں تھا۔ وہ ہوتی تو آتے ہی میری اور جلال کی ملاقات کے بارے میں اپنی جرح کا آغاز کردیتی لیکن غزالہ کو اس بازے میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جو بات ضروری ہوگی' وہ میں خود ہی اسے بتادوں گا اور میں نے اس کے صبر کا امتحان لیے بغیر اسے اپنی اور جلال کی پوری گفتگو سے آگاہ کردیا۔

"اگر وہ لوگ کچھ کام کررہے ہیں اور آپ کو ہیومن سوسائٹی سے دور رکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو الگ ہی رہنا چاہیے۔" غزالہ نے سادگی سے مشورہ دیا۔ "دو سمتوں سے کام کیا گیا تو کوئی گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔"

"اس نے مجھے کسی بات سے نہیں روکا۔ یہ نتیجہ میں نے خود اخذ کیا ہے۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ اسلام آباد سے مجھے ان کا لٹریچر بھجوائے گا۔ میں نے دانستہ اس موضوع کو ادھورا چھوڑ دیا تھا کہ اسے مزید نصیحتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ اوقات میں پڑھ ڈالنا' میں محسوس کررہا ہوں کہ لاہور پہنچنے کے بعد تمہاری ترجیحات یکایک بدل گئی ہیں۔ امریکی اور بھارتی سازشوں کو بھول کر تم چھوٹے چھوٹے مقامی معاملات کی طرف توجہ دے رہے ہو۔ کل جعلی شناختی کارڈوں کا ذکر لے بیٹھے تھے۔ آج ہیومن سوسائٹی میں دلچسپی لے رہے ہو۔"

جلال کے لب و لہجے سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اول خان کی طرح وہ بھی مجھے نئے معاملات میں ملوث ہونے سے روکنا چاہ رہا تھا۔ ہیومن سوسائٹی کے بارے میں اس کے کچھ شبہات تھے تو وہ خود ان پر کام کررہا تھا۔ اپنی مقامی سرگرمیوں میں مجھے حصے دار بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ جس دن اس نے میری زبان سے بھارت جانے کا ذکر سنا تھا' اس کی اولین خواہش تھی کہ میں جلد از جلد پاکستان کو خیرباد کہہ کر بھارت چلا جاؤں۔ کراچی میں ہونے والے دھماکے نے اس کی خواہش میں شدت پیدا کردی تھی۔

ہمارے مفادات اتنے مشترک اور یکساں تھے کہ ہم ساری رات بھی باتیں کرتے رہے تو موضوعات ختم نہ ہوتے لیکن اسے اسلام آباد واپسی کی فکر تھی۔ روانگی سے پہلے اسے کچھ لوگوں سے ملنا تھا۔ فون پر باقاعدہ رابطہ رکھنے کا وعدہ کرکے وہ تھوڑی دیر بعد رخصت ہوگیا۔ اس سے بات کرکے مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ہیومن سوسائٹی انٹیلی جنس بیورو کے لیے بھی اجنبی نہیں تھی اور وہ لوگ کسی مضبوط جواز کے بغیر کسی فرد یا ادارے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

جلال کی واپسی کے چند منٹ بعد غزالہ کمرے میں لوٹ آئی۔ اس کا مزاج ویرا کی طرح جارحانہ نہیں تھا۔ وہ ہوتی تو آتے ہی میری اور جلال کی ملاقات کے بارے میں اپنی جرح کا آغاز کردیتی لیکن غزالہ کو اس بازے میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جو بات ضروری ہوگی' وہ میں خود ہی اسے بتادوں گا اور میں نے اس کے صبر کا امتحان لیے بغیر اسے اپنی اور جلال کی پوری گفتگو سے آگاہ کردیا۔

"اگر وہ لوگ کچھ کام کررہے ہیں اور آپ کو ہیومن سوسائٹی سے دور رکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو الگ ہی رہنا چاہیے۔" غزالہ نے سادگی سے مشورہ دیا۔ "دو سمتوں سے کام کیا گیا تو کوئی گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔"

"اس نے مجھے کسی بات سے نہیں روکا۔ یہ نتیجہ میں نے خود اخذ کیا ہے۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ اسلام آباد سے مجھے ان کا لٹریچر بھجوائے گا۔ میں نے دانستہ اس موضوع کو ادھورا چھوڑ دیا تھا کہ اسے مزید نصیحتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ

Downloaded from https://paksociety.com

کچھ کام کر رہا تھا تو اس کا فرض تھا کہ مجھے کھل کر بتا دیتا۔ میں نے ہمیشہ اسے اعتماد میں لے کر کام کیا ہے۔"

"آپ میں اور اس میں فرق ہے۔" غزالہ مسکراتے ہوئے بولی "آپ فری لانسر ہیں اور وہ اپنی سرکاری ذمے داریوں کے سامنے بے بس ہے۔"

اپنے وعدے کے مطابق خالد ٹھیک آٹھ بجے پہنچا۔ میں نے اسے بھی اوپر بلا لیا۔ اس کی موجودگی میں غزالہ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے آتے ہی ہیومن سوسائٹی کے مختلف کتابچوں سے بھرا ہوا لفافہ میرے سامنے رکھ دیا "یہ ان کے دعوے ہیں۔"

"انہیں بعد میں دیکھوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیا معلومات جمع کی ہیں۔" میں نے لفافے کا سرسری جائزہ لے کر اسے واپس کر دیا۔

"ان کے کاموں میں ٹرانسپورٹ کی بنیادی اہمیت ہے۔ مختلف قسم کی گاڑیوں کا بیڑا عطیات جمع کرنے کے لیے ہر وقت فعال رہتا ہے۔ چھوٹی بڑی دیہی اور شہری آبادیوں سے عطیات جمع کر کے ہیومن سوسائٹی کے مرکزی دفتر اور گودام میں پہنچائے جاتے ہیں۔ وہاں سے انہیں منزل کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔"

"دیہی علاقوں سے ملنے والے عطیات کی مالیت زیادہ نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی بیشتر دیہی آبادی غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ ایسے لوگ خود مدد کے مستحق ہیں۔ وہ دوسروں کے لیے کیا دے سکیں گے۔ اہل ثروت زمین داروں کے لیے ہیومن سوسائٹی سے زیادہ اہم ان کے ہاری اور کسان ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال پر خرچ کرتے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ خاص طور پر دیہات نہ جاتے ہوں۔ شہروں کے درمیان پڑنے والی آبادیوں کو کھنگال لیتے ہوں۔" غزالہ نے رائے دی۔

"اور یہ تمام تر امداد پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کے لیے روانہ کر دی جاتی ہے۔" میں نے خالد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا دعویٰ وہ خود کرتے ہیں اور حقائق بھی یہی ظاہر کرتے ہیں۔" خالد نے پورے خلوص سے کہا۔

"اس تنظیم میں اصل کردار کس کا ہے؟ تم نے اس بارے میں دو نام بتائے تھے۔"

"چوہدری عظمت اصل کرتا دھرتا ہے۔ ملک اقبال اس کا دست راست ہے۔ اپنے کاروبار کے بعد وہ سارا وقت سوسائٹی کو دیتے ہیں۔"

"چوہدری عظمت کا اصل کاروبار کیا ہے؟" میرے ذہن میں سوالات اُمڈنے لگے تھے۔

"آٹو پارٹس کی دو بڑی دکانیں ہیں۔ بیشتر مال باہر سے خود درآمد کرتا ہے۔ اقبال کا بھی یہی کام ہے مگر وہ عظمت سے مال لے کر بیچتا ہے۔"

"ہیومن سوسائٹی کی آمدنی کے دیگر ذرائع کیا ہیں؟"

عطیات کے سوا کوئی دوسری مد نہیں ہے۔ لوگ باہر سے بھی رقمیں بھیجتے ہیں مگر وہ چھوٹی ہوتی ہیں۔ باہر سے کبھی کوئی بڑی رقم نہیں آئی۔"

"یہ ماننے والی بات نہیں ہے۔ غیر ملکی ادارے ترقی پذیر ملکوں میں ہیومن سوسائٹی جیسے اداروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اپنے مفادات کے لیے ان میں بھاری سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ فورڈ فاؤنڈیشن اور فریڈم انٹرنیشنل کی مثال

کٹ کنارے

"نیا باورچی رکھتے وقت یہ مت پوچھیے کہ اس نے کہاں کہاں پکایا ہے۔ یہ پوچھیے کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو اس کا پکایا ہوا کھاتے رہے ہیں۔"

"مخدا بیگم! میں اس وقت اتنا بھوکا ہوں کہ تمہارا بنایا ہوا کیک بھی کھا سکتا ہوں۔"

"ممی! میں ماجد سے شادی ضرور کر لیتی لیکن اس میں ایک ہی بڑا عیب ہے۔ وہ دیوالیہ ہو چکا ہے۔"

"وہ واقعی رائٹرز کی فیملی ہے۔ ماں نظمیں لکھتی ہے۔ بیٹا نغمے لکھتا ہے۔ بیٹی ناول لکھتی ہے' باپ چیک لکھتا ہے۔"

مردوں کے لیے اگر ہیر اسٹائلز کی کوئی باتصویر کتاب چھپی تو اس میں کافی صفحے خالی بھی چھوڑنا پڑیں گے۔

Downloaded from https://paksociety.com

ہمارے سامنے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی رقمیں عظمت کو ملک سے باہر ادا کی جاتی ہوں۔"

"اس بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب عظمت کے ذاتی وسائل بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہیومن سوسائٹی کا بجٹ بہت بڑا ہے۔"

"میں ان معاملات کو کسی اور زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔ میرے لیے اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ عظمت کو سرحدی قبائل اور افغان مہاجروں سے کیا دلچسپی ہے۔"

"وہ عام دنیا دار انسان ہے۔ نجی محفلوں میں پینے پلانے سے بھی گریز نہیں کرتا لیکن لوگ اس کے کاموں کی وجہ سے اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔"

"اس معمے کا حل آزاد نجی قبائل میں مل سکتا ہے یا پھر چوہدری عظمت کچھ بتائے گا۔ اس کا گھر کہاں ہے؟"

میرے سوال پر خالد چونک پڑا "دفتر سمن آباد میں ہے' رہائش ماڈل ٹاؤن میں۔ کیا تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو؟"

"نتیجے پر پہنچنے کے لیے چوہدری عظمت سے ایک ملاقات ناگزیر ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ملاقات میں تمہارے سوال کا جواب بھی سامنے آجائے۔"

"میرے سوال کا جواب!" خالد کی آواز تحیر زدہ تھی "میرا سوال تو ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والے کیمیکل کے بارے میں تھا۔ اس کا ہیومن سوسائٹی سے کیا تعلق نکل آیا۔"

"ابھی میں خود اس بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔ میرے ذہن میں صرف ایک امکان سر ابھار رہا ہے!"

میری زبان سے وہ انکشاف سن کر غزالہ بھی حیرت سے اچھل پڑی تھی۔

"اگر تم ڈرائیور کے طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو ہم اسی وقت چوہدری عظمت سے ملیں گے۔" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔

"وہ ان چکروں میں ملوث ہے تو کسی تیاری کے بغیر وہاں جانا خطرناک نہیں ہوگا۔" خالد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میں ایسے عاجلانہ اقدام کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گی۔" غزالہ نے بے صبری سے اس کی ہم نوائی کی۔

"ہم وہاں لڑنے مرنے نہیں جا رہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا "ہم اس سے ایک اخبار کے لیے انٹرویو لینے جا رہے ہیں۔ وہ شہرت کا بھوکا ہے تو فوراً آمادہ ہو جائے گا ورنہ ہم گھر آکر کچھ اور سوچیں گے۔"

"اخباری نامہ نگاروں کے باقاعدہ شناختی کارڈ اور وزیٹنگ کارڈ ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ کہاں سے پیدا ہوں گے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"یہ خالد کا دردِ سر ہے۔ ان کا بندوبست نہ ہو سکا تب بھی ہم کوشش ضرور کریں گے۔ کہہ سکتے ہیں کہ عجلت میں سب کچھ بریف کیس میں رہ گیا۔"

"اگر تم اس ملاقات کا فیصلہ کر چکے ہو تو مجھے اس میں کوئی عذر نہیں لیکن فوری طور پر کارڈز وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔" خالد نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

ہم تینوں کچھ دیر تک اس بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ ان دونوں کے ذہنوں میں کئی الجھنیں اور متعدد سوالات تھے۔ ان کے اطمینان کے بعد ہم نے ہوٹل کا کمرا چھوڑ دیا۔

ہمارے پاس اپنی پیشہ ورانہ شناخت کے لیے سادہ کاغذوں کے پیڈ اور قلم پنسل کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ہوٹل سے ماڈل ٹاؤن کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ ٹریفک کی بے ہنگم بھیڑ کے باوجود خالد نے آدھے گھنٹے میں ہمیں چوہدری عظمت کے گھر کے سامنے پہنچا دیا۔

وہ ایک خوب صورت تین منزلہ مکان تھا لیکن اس کا زمینی رقبہ چوہدری عظمت کے رتبے کے شایانِ شان نہیں تھا۔ تقریباً چار سو گز پر بنے ہوئے اس مکان میں ایک سے زیادہ گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تک نہیں تھی۔

مکان کے پھاٹک پر کوئی دربان تھا نہ چوکیدار۔ میں غزالہ کو ساتھ لے کر وہاں تک پہنچا۔ لمحہ بھر کے لیے جھجکا اور پھر ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔

کسی اندرونی حصے میں گھنٹی کا مترنم شور گونجتے ہی میں نے بٹن سے انگلی ہٹالی۔

ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پھر پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ سنا دی جو پھاٹک تک آکر رک گئی۔ اندر آہنی کنڈکا کھلنے کی تیز آواز کے ساتھ ہی ذیلی کھڑکی کھل گئی۔ کھڑکی کھلنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے روشن خلا میں موجود نسوانی پیکر کو دیکھتے ہی میری کھوپڑی چکرا گئی۔

وہ جہانگیر کی بیوی سلمیٰ تھی اور ہمیں یوں اچانک اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت اور بے یقینی کی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستان عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

Downloaded from https://paksociety.com

کی بنیادوں کا آغاز ہوا اور وہ ڈیوڈ اسٹارز اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے گیب کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظریں منعقب ٹھہرا۔ اپنے محسن کی کامیابی کے ساتھ ہم پاکستان واپس پہنچے' یہاں مدن موہن کے نیوکل انفارمیشن سیل کے دو ممبران سے تفتیش کے نتیجے میں کھنول راجواڑی کا نام سامنے آیا' اپنی سیاسی حیثیت کے باعث وہ ہمارے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوا اور ہمارے ہاتھوں سے پھسلتی مچھلی کی طرح پھسلنے کے بعد اسلام آباد پہنچا مگر اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے اسے واپس کراچی لایا گیا اور وہ سیدھی انگلی کے ذریعے میں امریکی ایجنٹوں سمیت جہنم واصل ہوا۔ اب ہمارے سامنے امریکی ٹوئنٹیلیٹ کا ملازم ایورائن ڈی ہنٹ تھا۔ میں اس سے امریکن گرین کارڈ کے لالچی کرنل جمال دستی کے روپ میں ایس ٹی ایف کے غدار کی حیثیت سے ملا اور اسے یقین دلایا کہ میں ذہبی کو تلاش کرکے اس کے حوالے کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوں۔ وہ دو سرے امریکیوں کے مقابلے میں قدرے معقل ثابت ہو رہا تھا' اس نے میرے اور اول خان کے نگلز پر ٹس بھی حاصل کرلیے۔ اس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اول خان نے حکام سے بات کی اور انہوں نے فیصلہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔ میں نے ایوبی ہنٹ سے رابطہ کیا مگر وہ محتاط ہو چکا تھا' ایوبی نے مجھے ایڈین قونصلیٹ کے میجر بخشی کے سپرد کردیا۔ جس نے مجھے دھن راج سے متعارف کرایا۔ میجر بخشی کرنل جمال دستی کا قریبی ساتھی بننا چاہتا تھا اس چکر میں اس نے مجھے اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی نام بعد میں اسے کرنل جمال دستی کی حیثیت پر یقین آگیا۔ ایوبی ہنٹ نے اپنی کارروائیاں تیز کیں مگر ناکامیوں کے بعد وہ دہلی فرار ہوگیا۔ میجر بخشی کی طرف سے میرے اغوا کی اسکیم کو کشش کے نتیجے میں رستم ایرانی ہمارے سامنے آیا وہ پاکستان میں رہ کر ایران کے خلاف سازشوں میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ کرائے کے قاتل بھی فراہم کیا کرتا تھا میں نے اس تک رسائی حاصل کی اور بھاری معاوضے پر ایوبی ہنٹ کے قتل کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ حسب توقع اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی دوران میں رستم ایرانی نے انکشاف کیا کہ ذہبی کی تلاش کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ میں یہ علم ہوا کہ پنڈت منوہر لال سے اس کے گہرے مراسم ہیں جس کے بعد میں نے پنڈت منوہر لال کے گھر کی تلاشی لی جہاں سے ایسے کاغذات ملے جن سے پنڈت منوہر لال کا اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کا ایجنٹ ثابت ہوتا تھا۔ رستم نے ان کاغذات کے لیے خطیر رقم کی پیش کش کی۔ میں نے جواب میں پنڈت منوہر لال کو مانگ لیا۔ اس کے انکار پر اس کے گھر کا محاصرہ کیا گیا اور رستم نے خود کشی کرلی۔ پنڈت منوہر لال کو وہاں سے بازیاب کرالیا گیا۔ پنڈت نے بتایا کہ رستم نے اسے موساد میں شامل کرایا تھا۔ رستم کی خود کشی پر ایک نام نہاد بین الاقوامی این جی او فریڈم انٹرنیشنل پاکستان میں انسانی حقوق کے حوالے سے واویلا پر ہم اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کا کرتا دھرتا اکرم الٰہی تھا جو کچھ عرصے سے ملک سے باہر تھا تاہم اس کی غیر موجودگی میں اس کا بھانجا مقبول چوہدری رستم کی خود کشی پر شور مچا رہا تھا۔ ہم نے فریڈم انٹرنیشنل کی عمارت پر کامیاب چھاپہ مار کارروائی کی۔ مقبول چوہدری وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا اور اپنی منظور نظر طوائف کے گھر جا پہنچا۔ فریڈم انٹرنیشنل کے دفتر میں متعدد اکرم الٰہی ہمیں مل گیا۔ اس نے بتایا کہ اسے مقبول چوہدری نے اپنی جائز ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے قید کیا ہوا تھا۔ اس کی ذات بھی شک و شبے سے بالاتر نہیں تھی اس لیے اس کے ٹیلی فون پر آبزرویشن لگا کر اسے فی الحال آزاد چھوڑ دیا گیا۔ میں نیا نام ایک لڑکی کی مدد سے مقبول الٰہی کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے اسٹیشن فور پہنچا دیا گیا۔ اکرم الٰہی کے فون پر لگائی گئی آبزرویشن کے نتیجے میں ہمیں علم ہوا کہ یوپ راحیل نامی ایک امریکی سفارت کار اس ملاقات کے لیے کراچی آرہا ہے۔ اکرم الٰہی کی سخت نگرانی کی جارہی تھی ہم اسے یوپ راحیل سمیت گرفتار کرنا چاہتے تھے وہ اپنی نگرانی کرنے والوں کو جل دے کر یوپ راحیل سے ملنے ہوٹل پہنچا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ اکرم الٰہی نے ہمیں دیکھتے ہی ہوٹل سے راہ فرار اختیار کی مگر وہ اپنے ہی حاضر مالی اور اسے ملنے والے محب وطن ٹیکسی ڈرائیور مجید کی معاونت سے اکرم الٰہی قابو میں کرلیا۔ ہوٹل میں یوپ راحیل نے اپنی گھوڑا ملی کی کوشش کی مگر ناکام ہوا اور بالآخر امریکی صدر کے فرمان کے تحت اپنے عہدے سے برخاست ہو کر امریکا جانے پر مجبور ہوا۔ اکرم الٰہی نے تفتیش کے دوران میں بتایا کہ وہ فورڈ فاؤنڈیشن کو ان کے پیغامات کے حوالے سے بلیک میل کرتا رہا ہے اور اس نے فاؤنڈیشن کی پاسپندیدہ سرگرمیوں کی فائل بنا رکھی ہے۔ ہم نے وہ فائل حاصل کرلی۔ مقبول چوہدری اور اکرم الٰہی سے متصرف ہو چکے تھے لہٰذا انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اکرم الٰہی کی مرتب کردہ فائل سے ہمیں بہت ساری معلومات حاصل ہوگئیں۔ ان میں ایک نام مراد ظریف کا تھا جو اندرون سندھ ایک این جی او چلا رہا تھا۔ فائل سے ظاہر ہوا کہ مراد ظریف نے اپنے تئیں نظریں بنے اسے مقبول چوہدری کے حوالے سے بلانا چاہا مگر وہ قابو میں نہیں آیا۔ سلطان شاہ اس کی تلاش میں حیدر آباد گیا اور بدقسمتی سے مراد ظریف کے قبضے میں پھنس گیا۔ سلطان شاہ کو چھڑانے کے لیے ہم نے پہلے مراد ظریف کو حیدر آباد سے گرفتار کیا اور پھر ایک مختصر سے معرکے کے بعد سلطان شاہ کو میرپور خاص سے بازیاب کرالیا گیا۔ مراد ظریف نے ہماری تحویل میں خود کشی کرنے سے پہلے تفتیش کے دوران میں انکشاف کیا کہ بھارتی ایجنٹ کرشن کمار نیا چھور کے علاقے میں مسیح تربیت کا کیمپ چلا رہا تھا اور اب فرار ہو کر بھارتی علاقے موناباؤ کی طرف چلا گیا ہے۔ آئی ٹی کے جلال کا خیال تھا کہ ان کی سرکیولر کے لیے ہمیں سرحد پار جانا چاہیے۔ میں نے اس پر کوئی رائے نہیں دی۔ اکرام الٰہی کی فائل میں مندرج دیگر افراد بھی اپنے انجام کو پہنچتے رہے۔ اس دوران میں کرشن کمار کے آدمیوں نے حیدر آباد میں موجود ہماری کار کا تعاقب کیا اور ہمارے گھر تک رسائی حاصل کرلی۔ ایک رات انہوں نے ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا مگر اپنی بدقسمتی سے حیدر آباد کے رجسٹریشن والی کار سمیت ایک مردہ اور دو زندہ شکاروں کی صورت میں ہمارے ہاتھ آگئے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ کرشن کمار ابھی نہیں گیا بلکہ پاکستان میں ہی موجود ہے اور ہماری رہائش گاہ دیکھ چکا ہے۔ ہم نے انہیں پولیس کے حوالے کردیا۔ میں جانتا تھا کہ کرشن ہمارے ٹھکانے سے واقف ہونے کے بعد ہم سے ضرور ٹکرائے گا۔ اسی امید کے تحت میں اور سلطان شاہ گھر سے باہر سڑکوں پر مٹر گشت کرتے رہے جب غیر متوقع طور پر وہ ہمارے گھر میں داخل ہوا اور دیوار کو خوفناک بموں سے کامیاب ہوگیا۔ وہ اسے اغوا کرنے کے بجائے ہلاک کرنے کا خواہش مند تھا مگر ہمارے ہی حاضر مالی کے باعث اسے اپنے کو شش میں ناکامی ہوئی اور اسے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ ہمارے گھر پر شب خون کی کارروائی کے دوران میں استعمال ہونے والی کار کا چیسز نمبر شراب فروخت کرنے والی ایک کمپنی مدن موہن اینڈ سنز کے نام پر تھا۔ ہم نے کراچی میں رہائش پذیر مجید بیگ سے ملاقات کی۔ وہ خود معصوم تھا مگر اس کا بھائی روی دشمنوں سے باتوں میں کھیل رہا تھا۔ روی کی بدقسمتی کہ اس کی حسین اور خوبصورت بیوی ماروتی اپنے جیٹھ کی زبان سے لگائے ہوئے زخموں کے مداوے کے لیے مجھ سے ملی اور روی کی سلامتی اور اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے عوض ہمیں کرشن کمار تک پہنچانے کا سبب بن گئی۔ جس کے بعد بھی چند بھی ہمارے ہاتھ لگ گیا اس سے پوچھ گچھ کے دوران میں انڈین سیکرٹ ایجنسی را کے اعلیٰ حکام کا نام سامنے آیا۔ وہ دہلی میں را کے پاکستان ونگ کا سربراہ تھا۔ میجر بخشی تک ہماری سن گن پہنچ چکی تھی لہٰذا اسے ہنی ٹریپ کرلیا گیا۔ ہمارے ہاتھ لگنے سے قبل میجر بخشی نے انڈین سفارت کار جوگیندر پال کو روی اور ہمارے گھر جوڑ سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے بڑی تیزی دکھائی اور روی کو مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کا بھی سامنا ہوا مگر وہ ہمیں مقابلے میں بودے ثابت ہوئے اور واصل جہنم ہوگئے۔ جوگیندر پال عرف ماسٹر کا موبائل فون نمبر میرے پاس تھا جس کے ذریعے ہمیں اس تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور اسے سیدھے سادے طریقے سے ایک ریموٹ کنٹرولڈ بم دھماکے میں ہلاک کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں انڈیا کے سفر کے سلسلے میں لاہور پہنچ گیا۔ وہاں ایس ایس ایف کے مقامی یونٹ کو ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والے کیمیکل کے حوالے سے بہت پریشان پایا۔ لاہور میں بھی این جی اوز کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ان میں یو سو سو سائٹی مجھے غیر معمولی طور پر مشکوک محسوس ہوئی۔ میں ایس ٹی ایف نے مقامی کمانڈ خالد اور غزالہ کے ہمراہ یو سو سائٹی کے کرتا دھرتا چوہدری عظمت کے گھر جا پہنچا جہاں کراچی سے لاہور آنے والی جہانگیر کی بیوی سلمٰی کو اپنے روبرو دیکھ کر میری عقل چکرا کر رہ گئی۔

آپ کے مزید وقعات ملاحظہ کیجیے

"وہ تم دونوں ..... یہاں ..... لاہور میں .....؟" سلمٰی کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی تحیر زدہ آواز برآمد ہوئی جس سے بے اعتباری مترشح تھی۔ اندر سے آنے والی روشنی براہ راست میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی' اس لیے میں اس کے چہرے کے تاثرات واضح طور پر نہیں دیکھ سکا۔

ہماری وہ ملاقات سلمٰی کے لیے جس قدر حیران کن تھی' ہمارے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ میں ذہنی طور پر چوہدری عظمت سے ملاقات کے لیے تیار تھا' اس کے اس دروازے پر

Downloaded from https://pakistanipoint.com

پہنچا تھا مگر کسی اجنبی چہرے کے بجائے سلمٰی کو وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ فوری طور پر ہم دونوں میں سے کوئی بھی سلمٰی کے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ حیرت اور بے یقینی نے ہمیں عارضی طور پر مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔

شاید کراچی ائرپورٹ پر قدرت نے جہانگیر کو ہماری طرف دھکیلا تھا۔ ہمیں اس کی زبانی پتا چل چکا تھا کہ سلمٰی ہمارے ساتھ ایک ہی طیارے سے لاہور جارہی تھی۔ ہم نے اسے روانگی کے لاؤنج میں بورڈنگ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے بھی دیکھا اور اس سے بچ کر فرسٹ کلاس لاؤنج میں چلے گئے۔ دورانِ پرواز ہم نے دانستہ اکنامی کلاس کا رخ نہیں کیا۔ یوں ہم سلمٰی سے سامنا کیے بغیر اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد جب خالد نے غزالہ کو اپنی بیوی کے ساتھ لاہور کے بازاروں کی سیر کے لیے بھیجنے کا ارادہ کیا تو غزالہ نے بہت شدت سے سلمٰی کو یاد کیا۔ وہ اس سے ملاقات کا عذر پیش کرکے، لاہور کے بازاروں کی خاک چھاننے سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ ہم سلمٰی کے پتے سے لاعلم تھے۔ لاہور جیسے بڑے شہر میں باہر سے آئے ہوئے کسی مہمان کا سراغ نکالنا ممکن نہیں تھا۔

شاید وہ ہمارے لیے قدرت کے اشارے تھے جنہیں ہم نے نظرانداز کردیا۔ جہانگیر سے ملاقات ہوتے ہی ہمیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ہمارے سفر میں سلمٰی کا کوئی نہ کوئی کردار ضرور تھا مگر ہم وہ لمحات گنوا چکے تھے۔

ہم چوہدری عظمت سے ملنے آئے تھے۔ مکان کی دوربیل بجانے سے پہلے میں نے پورا یقین کرلیا تھا کہ وہ اسی کا گھر تھا۔ اس کے بارے میں میرے ذہن میں بہت سے جہات رینگ رہے تھے جن کا ازالہ اس سے ملاقات کے بعد ہی ہوسکتا تھا مگر سلمٰی نے اس مرحلے پر اچانک ہمارے سامنے آکر سب کچھ درہم برہم کردیا تھا۔ میرا ذہن ماؤف تھا مگر اس عجیب وغریب اتفاق پر میری چھٹی حس نے خطرے کا نعرہ لگادیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ سلمٰی کی اس گھر میں موجودگی کا عقدہ حل ہونے سے پہلے چوہدری عظمت کا نام لینا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

"تم ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ہو!" میرے کچھ کہنے سے پہلے غزالہ نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا "ہمیں عزت سے گھر میں بٹھاؤ گی یا یہیں کھڑے کھڑے ہر بات کا جواب لینا چاہو گی۔"

سلمٰی سٹپٹا کر ایک طرف ہٹ گئی "آؤ... اندر آجاؤ۔ تم لوگ کراچی میں رہتے ہوئے بہت کم میرے گھر آتے ہو تو کچھ یہاں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آئی ہوں؟"

"چوہدری عظمت کے گھر کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے میں ابتدائی ذہنی جھٹکے سے بڑی حد تک سنبھل چکا تھا۔ میں نے کہا "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو سب کچھ ہوجاتا ہے۔ کراچی ائرپورٹ پر جہانگیر سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے..."

سلمٰی نے سر جھٹک کر ایک ادا سے میری طرف دیکھا اور میری بات کاٹتے ہوئے بولی "تمہیں پہلے سے معلوم تھا، پھر بھی تم جہاز پر مجھ سے نہیں ملے، میں کراچی سے یہاں تک اکیلی بور ہوتی ہوئی آئی ہوں۔"

"مل جل کر باجماعت بور ہونے سے بہتر ہے کہ آدمی اکیلا بور ہولے" میرے ذہن پر اچانک جم جانے والی برف دھیرے دھیرے پگھلنے لگی تھی۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے خوش دلی سے کہا "ہم بزنس کلاس میں تھے اور سچ پوچھو تو دورانِ پرواز جان بوجھ کر تم سے چھپے رہے۔ ہم لاہور میں اچانک سامنے آکر تمہیں حیران کردینے کا پروگرام بنا چکے تھے اور شاید اپنے اس منصوبے میں کامیاب رہے ہیں۔"

سلمٰی کا چہرہ کھل اٹھا "بعض اوقات تم ایسی حرکتیں کرگزرتے ہو کہ اپنی اصل عمر سے بہت پیچھے نظر آنے لگتے ہو۔ جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ یہ بتاؤ کہ تم دونوں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ ابھی چل کر اپنا سامان یہیں اٹھالاؤ۔"

"پہلے اندر لے چلو۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی" میں نے مکان کی بیرونی آرائش کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بات ٹال دی۔

وہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے درودیوار سے مکینوں کی امارت اور خوش حالی جھلک رہی تھی۔

مختصر سا راستہ طے کرکے ہم برآمدے سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ چوہدری عظمت کے گھر کی طرح اس کا ڈرائنگ روم بھی زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس کی آرائش میں دل کھول کر پیسا صرف کیا گیا تھا۔ قالین، صوفے، پردے، چھوٹی میزیں، سب منہ سے بول رہی تھیں۔ نفیس وناز سجاوٹی اشیا چاندی، بلور اور کرسٹل سے بنی ہوئی تھیں۔ سلمٰی نے کمرے میں پھیلی ہوئی دھیمی روشنی کا ازالہ کرنے کے لیے فانوس روشن کیا تو چھت سے لٹکے ہوئے سیکڑوں کرسٹل جگمگا اٹھے۔ ان کے نیلگوں انعکاس کی وجہ سے روشنی غیر معمولی حد تک تیز تھی۔

ہم دونوں میں سے کوئی دیوانہ نہیں تھا جو منہ پھاڑ کر

Downloaded from https://paksociety.com

ثروت و امارت کے اس مظاہرے کو دیکھنے میں محو ہو کر سب کچھ بھول جاتا۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ قدرت نے چوہدری عظمت کو دولت سے نوازا تھا تو اسے دولت برتنے کا سلیقہ اور قرینہ بھی دیا تھا۔ وہ جو بھی رہا ہو' عمدہ ذوق ضرور رکھتا تھا۔

"مجھے اب تک۔ یقین نہیں آرہا کہ تم دونوں لاہور میں میرے ساتھ موجود ہو۔ سچ بتانا کہ تمہیں یہاں کا صحیح پتا کس نے دیا۔ جہانگیر یہاں آتو سکتے ہیں مگر کسی کو پتا دینا یا لکھوانا ان کے لیے ناممکن ہے" وہ غزالہ کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے ہنس پڑی۔

"جہانگیر ڈفر آدمی ہے..... میں نے کہنا چاہا لیکن غزالہ نے اسی لمحے میری بات کاٹ دی۔

"آپ متضاد باتیں کہہ رہے ہیں" وہ بولی "کوئی شخص ڈفر ہو سکتا ہے یا آدمی۔ یہ دونوں متضاد صفات کسی کی ذات میں بہ یک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ آپ سوچ سمجھ کر بتائیں کہ جہانگیر کے بارے میں کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

"ارے! تم دونوں کیوں میرے میاں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو' انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" سلمٰی نے احتجاج کیا۔

وہ ہمارے پہنچنے کی وجہ سے جوش اور ہیجان میں مبتلا ہو چکی تھی اور خود ہی موضوع سے بھٹک رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اسے اپنی آمد کے بارے میں کوئی مربوط کہانی سنائے بغیر ہم آگے گفتگو نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت مجھے سلمٰی سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہم چوہدری عظمت کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے اور میرے دل میں بہت شدت سے یہ تجسس پیدا ہو چکا تھا کہ سلمٰی اور چوہدری عظمت کے درمیان حقیقی رشتہ دریافت کر سکوں۔

مجھے ابتدا سے ہی معلوم تھا کہ جہانگیر کی سسرال لاہور میں ہے۔ اس نے کراچی ائیرپورٹ پر مجھے بتایا کہ سلمٰی اپنے میکے جا رہی تھی۔ میں کئی مواقع پر جہانگیر کی زبان سے اس کے سالے کے بارے میں غصیلے اور تضحیک آمیز کلمات سن چکا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ میں نے جہانگیر کی شادی میں شرکت کی تھی نہ کبھی اس کے کسی سسرالی رشتے دار سے ملا تھا۔ اپنی اس بے خبری اور چند مبہم شواہد کی وجہ سے مجھے شبہ سا ہو رہا تھا کہ چوہدری عظمت' سلمٰی کا بھائی تھا مگر اس کی تصدیق ضروری تھی۔

"جہانگیر ڈفر نہ ہوتا تو آج تم سے لڑنے بھڑنے کے بجائے تمہاری پرستش کر رہا ہوتا۔ اس جیسے عیب دار آدمی

کے ساتھ گزارہ کرنا بہت حوصلے اور دل گردے کا کام ہے
میں نے موقع پاتے ہی اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی اور وہ
سے متفق ہونے پر مجبور ہو گئی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ میری قربانیوں کے باوج
انہوں نے آج تک میری قدر نہیں کی۔"

مجھے ڈر ہوا کہ سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کی ذہنی رواں
گھریلو قضیوں کی طرف نہ بھٹک جائے۔ میں نے اس کا فق
مکمل ہوتے ہی بات اچک لی "میں دراصل یہ بتا رہا تھا کہ ا
ڈفر نے ادھوری بات کی تھی۔ یہ بتا دیا تھا کہ تم لاہور جا رہ
ہو' تمہارا پتا نہیں بتایا۔"

"اس میں ڈفر ہونے کی کیا بات ہے؟" وہ اٹھلا ک
مسکرائی "انہوں نے سوچا ہوگا کہ تم لاؤنج میں یا جہاز پر
سے ملو گے تو میں خود تمہیں اپنا پتا دے دوں گی۔ انہوں نے
کو پتا دیا نہ تم کراچی سے یہاں تک مجھ سے ملے سوال یہ
کہ پھر تم سیدھے یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ہمارے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں" غزالہ نے پور
اعتماد سے جواب دیا "انہوں نے کوشش کی اور تمہارا
چلا لیا۔"

سلمٰی نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا اور چ
ثانیوں تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا "تم نے کیا معلوم
تھا؟"

"عجیب احمقانہ سوال کر رہی ہو" میں نے اضطرار
طور پر اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے
"تمہارا لاہور کا پتا معلوم کرنا تھا اور وہ مل گیا۔ اس وقت
تمہارے سامنے موجود ہیں۔ تم نے ہماری تواضع کرنے کے
بجائے جرح کرنی شروع کر دی ہے۔"

"تواضع کے لیے مجھے تم سے اجازت لے کر خود اندر
ہوگا" اس نے جلدی سے وضاحت کی "یہاں کوئی ملازم نہیں
ہے۔ ویسے تو یہ بھی میرا اپنا گھر ہے مگر میں تمہیں یہ بتا
ضروری سمجھتی ہوں کہ اصولی طور پر میں خود یہاں مہما
ہوں۔ یہ میرے ماموں کا گھر ہے۔ میں ان سے ملنے کے
آج صبح یہاں آئی تھی۔ رات گزار کر کل دوبارہ اپنے بھا
کے گھر لوٹ جاؤں گی۔ تمہیں میرے بھائی کے گھر پہنچ
چاہیے تھا۔ تم دونوں یہاں کیسے آ گئے؟"

اس کا جواب تیکھا اور بوکھلا دینے والا تھا مگر میں
ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا "
تمہارے ماموں کا گھر ہے۔ اگر تم شہر میں کسی اور کے گھ
موجود ہوتیں تو ہمیں وہیں کا پتا دیا جاتا۔ ہمیں تمہارے بھا

Downloaded from https://paksociety.com

کے گھر کا سروے نہیں کرنا تھا۔ تم سے ملنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے انفارمر نے ہمیں اس گھر کا پتا دے دیا اور ہم براہِ راست یہاں آگئے۔ اگر تمہیں یا تمہارے ماموں کو کوئی اعتراض ہے تو ہم ابھی لوٹ جاتے ہیں۔"

"ہم میں سے کوئی بھی اتنا مردم بیزار نہیں ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جگہ چھوڑی "میں تم کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی کے ساتھ بہت زیادہ حیرت بھی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم برا مانو' میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔"

"تم بیٹھی رہو!" غزالہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا "ہم کھانے پینے کے لیے نہیں تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں' یہ یوں ہی مذاق کررہے ہیں۔"

غزالہ اسے روکتی رہ گئی مگر سلمٰی نے اس کی ایک نہیں سنی۔ میرے تمسخرانہ طنز سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ باتوں میں الجھ کر وہ میزبانی کے روایتی آداب کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ وہ اندر کھلنے والے دروازے پر لٹکی ہوئی گھنٹی دار جھالروں کا ترنم بکھیرتی' غائب ہوگئی۔

"برے پھنسے!" میدان صاف ہونے پر غزالہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "چوہدری عظمت تو سلمٰی کا ماموں نکلا۔ کیا آپ کو یہ جان کر اچنبھا نہیں ہوا کہ اس گھر میں سرے سے کوئی ملازم موجود نہیں ہے؟ آج کل تو سفید پوش لوگ بھی فیشن نبھارنے کے لیے اپنا پیٹ کاٹ کر کوئی جزوقتی ماسی یا ملازم رکھنے لگے ہیں۔ یہاں سرے سے میدان ہی صاف ہے۔ پتا نہیں چوہدری عظمت کیا گل کھلا رہا ہے؟"

"سلمٰی کے دروازے پر آنے سے میں بری طرح بھڑکا تھا مگر اب مجھے پتا چل چکا ہے کہ اس گھر میں کسی ملازم کا وجود نہیں ہے۔ بات سنبھل گئی ہے۔ سلمٰی سے دھیرے دھیرے سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ شاید اس کی یہاں موجودگی ہمارے لیے سودمند ثابت ہوگی۔"

"چوہدری عظمت کوئی درویش صفت انسان ہے ورنہ پکا فراڈ ہے" غزالہ بولی۔

"درویش ایسے پرتعیش ڈرائنگ روم نہیں بناتے' نفس پرور انسان تزکیہ نفس کے معنے تک نہیں جانتے۔"

میرے لاہور پہنچنے کے بعد صرف ایک ہی مسئلہ سامنے آیا تھا۔ ایس ٹی ایف کا مقامی کمانڈر ہیروئن سازی میں استعمال ہونے والے کیمیکل کی اسمگلنگ کے بارے میں شدید تشویش کا شکار تھا۔ خالد نے شہر کے جو حالات بیان کیے تھے' ان کی روشنی میں اس کی تشویش اور پریشانی بالکل بجا تھی۔ مجھے اس بارے میں زیادہ دماغ سوزی کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ غزالہ کی زبانی ہیومن سوسائٹی کا نام میرے سامنے آگیا۔ وہ لاہور کی ایک مقبول اور معتبر این جی او تھی۔ اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر میں این جی اوز کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا تھا۔ پاکستان کی جڑوں میں پھیلا ہوا معاشرتی ناسور میرے سامنے تھا۔ ہمارے ملک میں جائز اور ناجائز بلکہ حلال اور حرام کی تمیز کیے بغیر' ایک کثیر تعداد ہر قیمت پر دولت سمیٹنے کے جنون میں مبتلا تھی۔ اس جنون کی تکمیل کے لیے آئے دن نت نئے شارٹ کٹ استعمال کیے جارہے تھے۔ ایسے میں یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی کہ کوئی اپنی گرہ کا سرمایہ لگا کر مفت میں دوسروں کی فلاح وبہبود کے کام میں جتا ہوا ہو۔

خالد نے ہیومن سوسائٹی کے روح رواں کے دعووں پر مبنی لٹریچر فراہم کیا جس میں کوئی بات قابلِ گرفت نہیں تھی۔ محض اس بنا پر چوہدری عظمت کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے شہر اور صوبے کو چھوڑ کر مخصوص سرحدی علاقوں کے رہنے والوں کے لیے فلاحی اور رفاہی منصوبے چلا رہا تھا۔

وہ تصویر کا ایک رخ تھا مگر اس بارے میں آئی بی کے جلال نے جو مبہم رویّہ اختیار کیا' وہ میرے لیے معنی خیز تھا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ہیومن سوسائٹی کا ریکارڈ بے داغ نہیں تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ تنظیم آئی بی والوں کی نظروں میں آئی ہوئی تھی۔ ان پر کام بھی ہورہا تھا مگر جلال مجھے اپنی معلومات میں شریک کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ میں لاہور میں ان چکروں میں الجھ گیا تو میرا بھارت کا مشن التوا میں پڑجائے گا۔

وہ نکات میرے تجسّس کو ہوا دینے کے لیے کافی تھے۔ میں خود بھی لاہور میں زیادہ طویل قیام کا خواہاں نہیں تھا۔

طلسمی نقش والی انگوٹھی
مالی پریشانی' دشمنی' جادو ٹونہ' طلسمی انگوٹھی پہنتے ہی ختم۔ امتحان' کاروبار' مقدمہ' محبت' من پسند شادی' میاں بیوی میں اتفاق اور ہر خواہش میں کامیابی
خواتین وحضرات خط لکھ کر منگوائیں
جواب کیلئے والے حضرات انگوٹھی کیلئے اصرار نہ کریں کیونکہ جواب حرام ہے۔ اور نہ ہی انگوٹھی کو ناجائز استعمال کریں
خدا بخش 6 گلشن عباس کالونی سکیم نمبر 2 سٹریٹ نمبر 1 بالمقابل منصورہ ملتان روڈ۔ لاہور
Mobile : 0320-4842593

Downloaded from https://paksociety.com

ہیومن سوسائٹی کے بارے میں دو، دو سے دیکھ بھال کرنے کے بجائے میں نے براہِ راست چوہدری عظمت سے ملاقات کرنے اور اس کے بارے میں جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔

یہ بات طے تھی کہ چوہدری عظمت بہت مال دار آدمی تھا۔ اس کے گھر میں کسی ملازم کا نہ ہونا حیرت ناک تھا۔ اپنے گھر کے کاموں کے لیے باہر کے کسی آدمی پر اعتماد نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس گھر میں کوئی نہ کوئی ایسی پراسرار سرگرمی جاری تھی جسے دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔ میں نے بہت دماغ دوڑایا مگر فوری طور پر ایسی کوئی بات نہیں سوجھ سکی جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے چوہدری عظمت کو اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ یہ سمجھنا حماقت کے مترادف ہوتا کہ چوہدری عظمت جیسی اسامی نے چند ہزار روپوں کا ماہانہ خرچ بچانے کے لیے اس حد تک ملازموں سے گریز کیا ہوا ہو کہ اس کے گھر پر گھنٹی بجانے والوں کے لیے اہلِ خانہ کو دروازے پر جانا پڑے۔

"آپ جس کسی کے بارے میں بہت زیادہ سوچنا شروع کردیتے ہیں، وہ کہیں نہ کہیں گرفت میں آہی جاتا ہے" غزالہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے الزام نہ دو" میں نے پرتشویش سنجیدگی سے کہا "میں بلاوجہ کسی کا پیچھا نہیں کرتا۔ ہیومن سوسائٹی ایک این جی او ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر این جی او غلط کاموں میں ملوث ہے مگر میں آنکھیں بند کرکے ہر این جی او پر اعتبار بھی نہیں کرسکتا۔ اسی اصول کی روشنی میں مجھے ہیومن سوسائٹی کے بارے میں سوچنا پڑا۔"

"بس اب چکر چل پڑا ہے چوہدری عظمت کے ستارے جلد ہی گردش میں آجائیں گے۔"

وہ گفتگو آگے جاری نہ رہ سکی۔ اندر سے قالین پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر سلمٰی چوبی جھالروں کے سروں پر لٹکی ہوئی، چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کو جگاتی ہوئی ہمارے سامنے آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی مختصر سی ٹرے تھی۔

"میں نے کوئی تکلف نہیں کیا کیونکہ تھوڑی دیر بعد کھانے کا وقت ہوجائے گا" اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت یہ بسکٹ اور ابلے ہوئے چنے ہی کافی رہیں گے۔ کھانا بعد میں کسی دن کھالیا جائے گا" میں نے ٹرے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا "فی الحال تم یہاں بیٹھ جاؤ اور ہمیں اپنے ماموں وغیرہ کے بارے میں بتاؤ تاکہ ان سے ملاقات ہونے پر ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں۔"

میں نے تکلفات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی پیالی میں کچھ چھولے لے لیے۔ میرا اشارہ پاکر غزالہ نے بھی میری تقلید کی۔ سلمٰی نے اپنی بات دہراتے ہوئے تاکید کی کہ ہم کھانا کھائے بغیر وہاں سے نہیں جائیں گے۔ میں نے اس بحث کو طول نہیں دیا۔ یہ کہہ کر اس موضوع کو ٹال دیا کہ تھوڑی دیر بعد اشتہا بیدار ہوئی تو بلا تکلف اس سے کھانا لگانے کی فرمائش کردی جائے گی۔ باہمی مراسم کی گہرائی کی بنا پر اس نے میرے اس مصلحت آمیز وعدے پر بھروسا کرلیا اور چائے پینے میں مصروف ہوگئی۔

"تمہارے بھائی کا گھر بھی یہیں کہیں، آس پاس ہے؟" غزالہ نے کچھ دیر کے توقف کے بعد بات چھیڑی۔

"یہاں سے کچھ دور ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ سوچنا پڑے۔ ڈیڑھ دو کلو میٹر سمجھ لو" سلمٰی نے بتایا۔

"پھر تو تمہاری اپنے ماموں سے روز ملاقات ہوتی رہتی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"خواہش کے باوجود ایسا نہیں ہو پاتا" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی "میرے ماموں بہت مصروف آدمی ہیں۔"

"کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟" میں نے محتاط لہجے میں وہ پہلا نازک سوال کرڈالا۔

"گئے ہوئے ہیں۔ بہت زندہ دل مگر دردمند آدمی ہیں۔ کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں تو فلاحی کاموں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بھی ہیومن سوسائٹی کے دفتر میں بیٹھے ہوں گے۔ ان کو دوسروں کی خدمت کرنے کا ایسا چسکا لگا ہے کہ ہم کو ان سے شکایت ہونے لگتی ہے۔"

"ایسا ہونا چاہیے" غزالہ نے کہا "وہ چوہدری ہیں۔ ہر چوہدری اپنے گاؤں یا برادری کا سردار یا کھیا ہوتا ہے۔ اسے لوگوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔"

"پہلے ایسا ہوتا ہوگا، اب تو یہ ایک برادری کا نام رہ گیا ہے جس میں سب چوہدری کہلاتے ہیں مگر کوئی کسی کا چوہدری نہیں ہوتا۔ پورے خاندان میں ایک ماموں عظمت ہی ایسے ہیں جن کے دل میں سارے جہاں کا درد بھرا ہوا ہے۔ آئے دن یہاں سے پشاور اور پھر خیبر تک دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔"

بات ڈھب پر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا ان کا کاروبار خیبر تک پھیلا ہوا ہے؟"

"کاروبار لاہور میں ہے۔ وہاں وہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے کچھ منصوبے چلا رہے ہیں" سلمٰی نے بتایا۔

Downloaded from https://paksociety.com

"کیوں؟ کیا لاہور اور پنجاب کے سارے غریب خوش حال ہو چکے ہیں؟" میں نے ازراہِ تمسخر کہہ ڈالا۔

"یہ ان ہی کو معلوم ہوگا۔ لاہور میں بھی ان کی ہیومن سوسائٹی کا بہت نام ہے مگر وہ زیادہ کام صوبہ سرحد میں کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں خانہ جنگی سے برباد ہو کر آنے والے افغان مہاجروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ سخت موسم میں کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ چوہدری عظمت کی سرگرمیوں کے بارے میں سلمٰی کی معلومات سطحی تھیں۔ اس سے صرف یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ چوہدری عظمت کے بارے میں اس کے گھر اور خاندان والے کیا سوچتے تھے اور اس کے معمولات کیا تھے۔

"یہ ہیومن سوسائٹی کیا کرتی ہے؟" میں نے بالکل انجان بن کر سوال کیا۔

"بتا تو رہی ہوں کہ یہ کوئی فلاحی اور رفاہی تنظیم ہے۔ حیرت ہے کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے!"

"حیرت ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم بھول رہی ہو کہ ہم کراچی سے آئے ہوئے پردیسی ہیں۔ لاہور کے بارے میں تم ہی ہمیں کچھ بتا سکتی ہو۔ ویسے یہ ہیومن سوسائٹی مال بنانے والی کوئی این جی او تو نہیں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ این جی او کیا ہوتی ہے' میرے ماموں مال نہیں بناتے' اپنی جیب سے خرچ کرتے ہیں۔"

"این جی او' نان گورنمنٹ آرگنائزیشن یا کسی بھی غیر سرکاری تنظیم کو کہتے ہیں جو تھوڑے سے مقامی چندے اور بھاری غیر ملکی امداد سے چلائی جاتی ہے۔ یہ انسانوں کی فلاح و بہبود تعلیم' صحت' صفائی اور تربیت سے لے کر پرندوں کے بچوں کی دیکھ بھال تک کے لیے بنائی جا سکتی ہے۔"

"تم میرے ماموں کا مذاق اڑا رہے ہو؟" سلمٰی نے چونک کر سوال کیا "وہ بہت خوش حال اور ایمان دار آدمی ہیں۔ انہیں ایسی لوٹ مار کی کیا ضرورت ہے!"

"میں نے ان کے لیے کچھ نہیں کہا۔ تم کو بتا رہا تھا کہ این جی او کیا ہوتی ہے؟"

"اس سے پہلے تم نے یہ بھی کہا تھا کہ عظمت ماموں کی ہیومن سوسائٹی' این جی او ہو سکتی ہے۔"

"یہ میں مانتا ہوں" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا "یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی کہ پہلے میں نے کیا کہا تھا۔ دراصل پاکستان میں این جی اوز کو ایک تحریک کے طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس قدر پُرکشش اور ترغیب آمیز ہے کہ سوجھ بوجھ رکھنے والے' پڑھے لکھے اور چالاک لوگ تیزی سے اس جال میں پھنس رہے ہیں۔ کچھ ادارے واقعی کام کر رہے ہیں مگر بیشتر کا سارا زور پیسا کمانے پر ہے۔"

"میں ماموں سے ضرور پوچھوں گی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔"

"کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ تمہارے عظمت ماموں نے اپنے گھر میں کوئی ملازم نہیں رکھا" میں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"پہلے اس گھر میں بھی نوکر چاکر ہوتے تھے۔ بعد میں ماموں نے ان کی چھٹی کر دی۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان کو اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔ یہ زیادتی ہے کہ پیسے کے بل پر دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ جو کام ملازم کرتے ہیں' وہ خود بھی کیے جا سکتے ہیں۔"

"اچھوتا خیال ہے۔ اس سے غریبوں کو بے یار و مددگار اور بے روزگار کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ قدرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ خدا چاہتا تو ہر شخص کو یکساں امیر یا غریب بنا سکتا تھا۔ انسانوں میں آمدنی اور وسائل کی کوئی تفریق نہ ہوتی۔ کیا تم اس فرق کے بغیر زندگی اور جدوجہد کا تصور کر سکتی ہو؟"

"یہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ماموں ہی تمہیں ان کا جواب دے سکتے ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ ان سے تمہاری ملاقات ہو سکے۔"

وہ سلمٰی کی سادگی اور بے خبری تھی کہ وہ میری اور چوہدری عظمت کی ملاقات کا بندوبست کرانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھ میں اتنے انتظار کا یارا نہیں تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا' چوہدری عظمت کی ذات پُرپیچ اور مشتبہ تر ہوتی جا رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ اس سے جلد از جلد میرا سامنا ہو سکے تاکہ کچھ حقائق سامنے آ سکیں۔

سلمٰی کی اس کے گھر میں موجودگی اور پھر ان دونوں کی قریبی رشتے داری نے میرے لیے ایک بڑی مشکل پیدا کر دی تھی جس کا کوئی آسان حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں لاہور کے ہوٹل میں مظہر خان کے نام سے ٹھہرا ہوا تھا۔ میں چوہدری عظمت سے کسی اور فرضی نام سے ملاقات کرنے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ اپنے گھر پر موجود نہیں تھا ورنہ سلمٰی ہم دونوں کا تعارف کراتی تو وہ اس کی زبان سے میرا اصل نام سن کر چونک سکتا تھا۔

اس وقت تک ایسا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا تھا کہ چوہدری عظمت کو مجرم یا کم از کم ملزم ہی قرار دیا جا سکے

Downloaded from https://paksociety.com

لیکن میں فضا میں خطرے کی بو سونگھ رہا تھا۔ اگر وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث تھا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ میرے نام اور کردار سے واقف رہا ہو۔ جوں ہی اسے یہ معلوم ہوتا کہ میرا نام ڈینی ہے' وہ چوکنا ہوجاتا۔ اس سے ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے یہ خطرہ ٹل چکا تھا کہ وہ میرے نام کے ساتھ میری شکل وصورت سے بھی واقف ہوجائے لیکن دوسرا خطرہ بدستور موجود تھا۔

سلمٰی اس کے گھر مہمان تھی۔ ہم نے اس سے اچانک سامنا ہونے پر یہ عذر پیش کیا تھا کہ ہم اسی کو ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ سلمٰی کا مزاج میرے لیے جانا بوجھا تھا' اس کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ ہم نے محض اپنی کوششوں سے لاہور میں اس کے ماموں کے گھر کا پتا چلالیا تھا اور پھر اس سے ملنے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ اپنے ماموں سے ملاقات ہونے پر وہ مزے لے کر اسے بتاتی کہ کس طرح ہم اس تک پہنچے تھے۔ اپنی بھانجی کی زبان سے میرا نام سن کر چوہدری عظمت کے کان کھڑے ہوجاتے۔ اسے احساس ہوجاتا کہ وہ کہانی بے بنیاد تھی۔ اصل میں' میں اس کی راہ پر لگ چکا تھا۔ اس کا یوں ہوشیار ہونا میرے حق میں نہ ہوتا۔

میرے دل میں آئی کہ اس بارے میں سلمٰی سے بات کروں' گھما پھرا کر اسے آمادہ کرنے کی کوشش کروں کہ وہ اپنے ماموں سے میرے نام کا ذکر نہ کرے۔ وہ ایک مہمان جوڑے کی آمد کا واقعہ نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ بات گول کرتی تو چوہدری عظمت کے دوسرے اہل خانہ اسے آگاہ کردیتے۔ سلمٰی چاہتی تو یہ ضرور کرسکتی تھی کہ اپنے ماموں سے میرا نام چھپالیتی اور مجھے اس کے خلاف خاموشی سے کام کرنے کا موقع مل جاتا۔

چوہدری عظمت' سلمٰی کا سگا اور اکلوتا ماموں تھا جب کہ میرے اور سلمٰی کے درمیان کوئی مضبوط رشتہ نہیں تھا۔ جہانگیر کی زیادتیوں سے دل برداشتہ ہوکر اس نے کئی بار مجھ سے دوستی بڑھانے کے لیے پیش رفت کی مگر میں نے ہر بار سرد مہری اور رکھائی سے کام لیتے ہوئے اپنا دامن صاف بچالیا۔ وہ میرے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ ضرور رکھتی تھی مگر میرے رویے سے ہمیشہ شاکی رہتی تھی۔ میری کسی بھی کمزور خواہش پر وہ میری نیت کے بارے میں بدگمان ہوسکتی تھی۔ ایک بار اسے شبہ ہوجاتا کہ میں کسی وجہ سے اس کے ماموں کے پیچھے لگا ہوا ہوں تو وہ چوہدری عظمت سے مل کر میرے لیے سنگین مسائل کھڑے کرسکتی تھی۔

اسے اعتماد میں لینے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اس کی تھوڑی سی ناز برداری کی جاتی' جھوٹی سچی تعریف وتوصیف کی جاتی اور جب اس کی عقل اس سحر میں گرفتار ہوجاتی تو رسانیت سے اسے چوہدری عظمت سے تھوڑی سی غلط بیانی پر آمادہ کرلیا جاتا مگر غزالہ کی موجودگی میں اس تدبیر پر عمل کرنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

مجھے وہ چند روز کا کھیل نظر آرہا تھا۔ چوہدری عظمت کی پوزیشن صاف ہوجاتی یا وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا۔ پہلی صورت میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ دوسری صورت میں سلمٰی کو مجھ سے شدید شکوہ ہوتا کہ میں نے اسے کچھ بتائے بغیر' اس کے ماموں کی ذلت اور رسوائی کا سامان پیدا کردیا۔ جہانگیر اور سلمٰی سے میرے گہرے مراسم کی بنا پر وہ صورت حال بہت تلخ اور تکلیف دہ ضرور ہوتی مگر ناگزیر ہوتی۔ میں کسی مجرم کو محض اس بنا پر نظرانداز نہیں کرسکتا تھا کہ وہ میرے عزیز ترین جگری دوست کا کوئی رشتے دار تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں جہانگیر کو منا سکتا تھا مگر سلمٰی کے بارے میں یقین سے کوئی قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

باتوں باتوں میں سلمٰی بتا چکی تھی کہ ہیومن سوسائٹی کے کاموں میں اپنی گہری دلچسپی کی بنا پر چوہدری عظمت عام طور پر دیر سے گھر آتا تھا۔ ہم بے فکری سے کچھ دیر وہاں بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔ میری کوشش تھی کہ اس سے اس کے ماموں کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرسکوں لیکن چوہدری عظمت کے بارے میں وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے ہمیں اپنے بھائی کے گھر کا پتا اور فون نمبر نوٹ کرایا' اصرار کیا کہ ہم وہیں منتقل ہوجائیں مگر میں نے اس کی پیش کش سختی سے رد کردی۔ غنیمت ہوا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ شادی کے بعد ہر لڑکی اپنے گھر بار کی مالک بن کر اپنے میکے والوں کے لیے صرف ایک پسندیدہ مہمان بن کر رہ جاتی ہے۔ جب وہ اپنے بھائی کے گھر میں مہمان تھی تو یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کو بھی وہاں رہنے پر مجبور کرے۔ سلمٰی ہم سے جتنی بھی مانوس رہی ہو' اس کے بھائی اور اس کے اہل خانہ کے لیے ہم اجنبی تھے۔ وہ لوگ اپنی نجی زندگی اور گھریلو ماحول میں دو غیر متعلق افراد کی شمولیت کو کبھی پسند نہیں کرسکتے تھے۔

سلمٰی ہماری قیام گاہ کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا سوال نظرانداز کردیا لیکن جب وہ مصر ہونے لگی تو میں نے ہوٹل کا نام لینے کے بجائے کہہ ڈالا کہ ہم لاہور میں کچھ ایسے لوگوں کے مہمان تھے جو اپنے ناموں اور ٹھکانوں کو بہت سختی سے پوشیدہ رکھتے

Downloaded from https://paksociety.com

ہیں۔ وہ ہماری سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑا بہت ادراک رکھتی تھی۔ اس مسکت جواب کے بعد اس نے اس موضوع پر کوئی سوال نہیں کیا۔

سلمٰی کی دل جوئی کے لیے ہم نے چائے سے پہلے چھولے کھالیے تھے پھر چائے نوشی کے دوران میں بسکٹ وغیرہ بھی کھاتے رہے۔ یوں وہ تواضع اتنی بھرپور ہوگئی تھی کہ اس کے فوری بعد کھانا کھانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سلمٰی ہمارے ساتھ مزید وقت گزارنے کی خواہاں تھی مگر ہم دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے وہاں سے اٹھ گئے۔ سلمٰی نے باہر آکر گرم جوشی سے ہمیں رخصت کیا۔ اسے دیکھ کر خالد نے ایک سعادت مند ڈرائیور کا روپ اپنالیا تھا۔

"یہ کوشش بری طرح ناکام ہوئی ہے" گاڑی روانہ ہونے کے بعد میں نے خالد کو بتایا "چوہدری عظمت میرے ایک دوست کا ماموں سسر نکلا۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھا۔ گاڑی کا رخ سمن آباد کی طرف کرلو۔"

خالد کے لیے وہ اطلاع حیران کن تھی۔ اس کے ذہن میں سوالات کا ابھرنا قطعی فطری تھا۔ اس نے سمن آباد کے بارے میں کچھ کہے بغیر' ہماری ناکام مہم کے بارے میں سوال کرنے شروع کردیے۔ میں اسے جواب دیتا رہا اور گاڑی لاہور کی سڑکوں پر سفر کرتی رہی۔

اپنے ہوٹل سے ماڈل ٹاؤن میں چوہدری عظمت کی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے خالد نے شاہراہ قائداعظم یا پرانے مال روڈ سے کنال بینک روڈ کا راستہ اختیار کیا تھا جو اپنے فطری حسن اور کشادہ گردوپیش کی وجہ سے لاہور کی خوب صورت ترین سڑک کہی جاسکتی ہے۔ اس سڑک پر نہر کے کنارے کنارے سفر کرنے کے بعد ہم بائیں طرف مڑے تھے لیکن سمن آباد پہنچنے کے لیے خالد نے کوئی اور راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ اس کی سمت ہوٹل سے بہت مختلف تھی۔

سمن آباد لاہور کی متوسط درجے کی ایک ستھری آبادی ہے۔ اسی کے ایک حصے میں دو منزلہ عمارت پر ہیومن سوسائٹی کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ وہ عمارت خاصی شاندار تھی۔ اس میں داخلے کے راستے پر ایک مسلح اور باوردی گارڈ موجود تھا جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ دفتر کھلا ہوا تھا۔

گاڑی سے اتر کر میں غزالہ کے ساتھ اس طرف چل دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے اِکّادُکّا افراد کی آمدورفت حوصلہ افزا تھی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر مختصر سے برآمدے تک پہنچے تو مسلح گارڈ نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ہم کھلے ہوئے دروازے سے گزر گئے۔ دروازہ عبور کرتے ہی ہم نے خود کو ایک ایسی آراستہ انتظار گاہ میں پایا جہاں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف سفید کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے ایک فیشن ایبل لڑکی براجمان تھی۔

ہمارے داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے مصنوعی استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھا۔ مجھے اس لڑکی کی موجودگی پر حیرت ہوئی۔ جو دفاتر رات کو دیر تک کھلے رہتے ہیں' وہاں کام کرنے والی لڑکیوں کو مقررہ وقت پر چھٹی دے دی جاتی ہے اور متبادل سے کام چلالیا جاتا ہے مگر اس کے بشرے پر تکان کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ یوں تازہ دم نظر آرہی تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے ہی کام پر پہنچی ہو۔

میں نے ایک معروف اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتے ہوئے چوہدری عظمت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پیڈ پر کچھ کوائف نوٹ کرنے کے بعد انٹرکام پر کسی سے بات کی۔ وہ اپنے مخاطب کو بار بار بہت ادب سے سر کہہ رہی تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ براہِ راست چوہدری عظمت سے بات کررہی تھی مگر اس نے گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد معذرت خواہانہ لہجے میں بتایا کہ ہیومن سوسائٹی کا سربراہ اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا۔ اس سے ملاقات کے لیے ہمیں پہلے سے وقت طے کرنا ضروری تھا۔ اس کے بغیر چوہدری عظمت تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

"میرا اندازہ تھا کہ آپ ابھی انٹرکام پر چوہدری صاحب نے بات کررہی تھیں" میں نے تلخی سے کہا۔

"نو سر!" اس نے خوش خلقی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "میں نے ان کے سیکریٹری سے بات کی تھی۔"

"اگر چوہدری صاحب' اتنے مصروف ہیں تو ہم بھی ان کا وقت خراب کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہم اپنے اخبار کے قارئین کے لیے ہیومن سوسائٹی کے فلاحی کاموں کی کچھ تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ شاید یہ معلومات ان کے سیکریٹری سے ہی مل جائیں گی۔"

"وہ دفتر سے نکلنے والے تھے۔ پھر بھی میں پوچھ لیتی ہوں" یہ کہتے ہوئے' اس نے انٹرکام پر بات کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے راہ داری میں ایک تنومند شخص نمودار ہوا۔ لڑکی نے گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا "شاہد صاحب جارہے ہیں۔ آپ کو کل آنا پڑے گا۔"

اندر سے برآمد ہونے والا شخص خاصا فرعون صفت

Downloaded from https://paksociety.com

معلوم ہوتا تھا۔ انتظار گاہ اور راہ داری کے درمیان شفاف شیشے کی ایک لمبی دیوار کھڑی ہوئی تھی جس میں سے آر پار دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر شاہد نے وہاں سے گزرتے ہوئے انتظار گاہ کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ سیدھا گزرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ شاہد پر نگاہ پڑتے ہی میرے دل میں نفرت کی ایک ہلکی سی لہر نے سر ابھارا تھا۔ بعض افراد کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان سے کوئی ربط ضبط یا واسطہ نہ ہونے کے باوجود ان سے بغض اور کینہ محسوس ہوتا ہے۔ شاہد کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا۔

چند ثانیے قبل اسے بتایا گیا تھا کہ کسی اخبار کے نمائندے اس کے باس سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے پھر بھی وہ ہمیں بری طرح نظرانداز کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ بے اختیار میرا دل چاہا تھا کہ باہر نکل کر اسے گریبان سے پکڑ لیا جائے اور مار مار کر بے حال کردیا جائے۔ وہ ایک اضطراری رو تھی جس کے تحت میں استقبالیہ کاؤنٹر سے رخصت ہوا مگر چند قدم طے کرنے کے بعد مجھے احساس ہوگیا کہ ہاتھ میں کوئی سرا نہ ہونے کے باوجود شاہد سے بھڑنا قرین مصلحت نہیں تھا۔

چند منٹ کے وقفے میں ہماری واپسی کسی وضاحت کی محتاج نہیں تھی۔ خالد کو اندازہ ہوگیا کہ چوہدری عظمت سے ملاقات کی ہماری دوسری کوشش بھی ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس نے ہم سے اس بارے میں کوئی سوال کرنے کے بجائے پوچھا "ابھی اندر سے سیاہ سوٹ میں کون نکلا تھا؟"

"چوہدری عظمت کا سیکریٹری تھا۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ اندر سے نکلا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ہوا ہوگیا۔ شاید عجلت میں کہیں گیا ہے۔"

ہماری گاڑی حرکت میں آچکی تھی۔ میں نے کہا "ہوسکے تو ایک کوشش کرلو۔ شاید اس کا تعاقب بار آور ثابت ہوسکے۔"

"مشکل ہے" خالد نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے جواب دیا "وہ آندھی کی طرح گیا ہے' سمت صحیح ہو تب بھی اس تک پہنچنے کی امید نہیں ہے۔"

ہم خاصی دیر تک سمن آباد کی سڑکوں پر بھٹکتے رہے پھر ملتان روڈ پر نکل آئے۔ شاہد کی گاڑی کا دور دور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔

"میں نے آج تک ہیومن سوسائٹی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس تنظیم کے سربراہ تک رسائی اتنی مشکل ثابت ہورہی ہے" راستے میں خالد نے کہا "اب مجھے بھی اس کی ذات میں دلچسپی محسوس ہورہی ہے۔"

وہ شہر میں نیک نام تھا۔ اس کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ اس بنا پر اس کے اثر و رسوخ کی وسعت پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر پوری تحقیق اور چھان بین کیے بغیر اس پر ہاتھ ڈالا جاتا تو لاہور کی انتظامیہ میں بھونچال آسکتا تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے خالد سے پوچھا "شاہد کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"خود سر' بددماغ اور بدمعاش قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے" اس نے بلاتوقف جواب دیا۔

"اس کے بارے میں میرا تاثر بھی یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اصل معاملات تک پہنچنے کے لیے اسے اٹھوالیا جائے۔"

"اسے اٹھوانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ سوچ لو کہ اس کا ردِعمل بہت شدید ہوگا۔ چوہدری عظمت یہاں سے اسلام آباد تک' ہر ایک کو ہلا کر رکھ دے گا۔ میں اتنے بڑے فیصلے کا بوجھ نہیں اٹھاسکتا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ ہیومن سوسائٹی کے بارے میں تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں لاہور میں رہتا ہوں لیکن ابھی تک میں نے ان کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سنی جسے بنیاد بنا کر ان کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاسکے۔"

"میں بھی اور کچھ نہیں سوچ رہا۔ میرے سامنے صرف یہ بات ہے کہ ان کا دامن بالکل بے داغ ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ انہونی سی بات ہے۔ فلاحی سرگرمیوں کے اس قدر شفاف ریکارڈ سے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کچھ کررہے ہیں۔ اس قدر احتیاط اور منصوبہ بندی سے کررہے ہیں کہ ان سے معمول کی غلطیاں بھی سرزد نہیں ہورہیں۔ حیرت ہے کہ اب تک کسی نے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا۔"

"تمہارے کہنے پر مجھے احساس ہورہا ہے کہ یہ نکات قابلِ توجہ ہیں" خالد نے اعتراف کیا۔ "ان پر کام کیا جانا چاہیے لیکن محض ان نکات کی بنا پر کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے وقت درکار ہوگا۔"

خالد سے میری شناسائی پرانی نہیں تھی۔ وہ میرے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ مگر میرے کہنے پر کوئی بڑا فیصلہ کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے وہ بات وہیں ختم کردی۔ ایس ٹی ایف میں ہر اسٹیشن کمانڈر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے آزاد اور خود مختار تھا لیکن

Downloaded from https://paksociety.com

اپنے کیے ہوئے فیصلوں کے نتائج کے بارے میں اپنے سربراہ کو جواب دہ تھا۔ غیر تحریری پالیسی سے انحراف کی صورت میں اسٹیشن کمانڈر کا گوشمالی سے بچنا ناممکن تھا۔

ملتان روڈ سے ہوتے ہوئے لوئر مال روڈ پر جا نکلے۔ اس دوران میں گاڑی میں خاموشی رہی۔ خالد نے بھی بھانپ لیا تھا کہ اس کا محتاط رویہ مجھے قدرے شاق گزرا تھا مگر وہ خود بھی اپنی ملازمت کے ضابطوں کا قیدی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ خالد احمد تھا' اول خان نہیں تھا۔ اول خان کی سب سے بڑی خامی یا خوبی یہ تھی کہ وہ میری کہی ہوئی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے عمل کر گزرتا تھا اور پھر اسے اپنے مشورے کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا میری ذمے داری بن جاتا تھا۔ یہ ہم دونوں کے مقدر کی بات تھی کہ اس طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے اول خان کو ایک موقع کے سوا کبھی ندامت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔'

الحدید نامی لانچ کے ذریعے اسلحے اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ میں ناکامی کے بعد متاثرہ فریق کے زبردست دباؤ پر اول خان کو کراچی سے تبدیل کردیا گیا تھا۔ بظاہر وہ ایک تادیبی قدم تھا لیکن میری دانست میں وہ اول خان کی عمدہ کارگزاری کا کھلا اعتراف تھا کہ اس نے ملک دشمنوں کو کراچی کا ساحل استعمال کرنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا' ویران ساحلی علاقے کو ان کا مدفن بنادیا تھا۔

خالد نے ہوٹل کے پورچ میں ہمیں اتارنے کے لیے گاڑی روکی تو میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور لجاجت سے بولا "میں گاڑی پارک کرکے تمہارے کمرے میں آرہا ہوں۔ بس چند منٹ کے لیے ضروری بات کرنی ہے۔"

مجھے اس کا مافی الضمیر سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کشیدگی کا ازالہ کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ خالد کی اپنی سوچ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وقتی طور پر مجھے اس کے رویے سے رنج ہوا تھا لیکن بعد میں' میں نے ہر ملال کو اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ایس ٹی ایف کا ہر رکن' ہر وقت میرے مشوروں پر بے چون وچرا کیے عمل کرنے کے لیے تیار رہے۔ ان لوگوں کی اپنی بھی کوئی مجبوری ہوسکتی تھی۔

غزالہ نے کاؤنٹر سے چابی لی اور ہم دونوں لفٹ کے ذریعے اپنے فلور پر پہنچ کر کمرے میں داخل ہوگئے۔ جوتوں سے نجات حاصل کرکے غزالہ غسل خانے میں جا گھسی۔ میں نے ٹیلی وژن آن کردیا۔ اسی اثنا میں خالد کمرے کے دروازے پر دستک دینے اور اجازت ملنے پر اندر آگیا۔

وہ صورتِ حال خاصی دلچسپ تھی۔ خالد اپنی مجبوری پر معذرت خواہ تھا اور میں اپنی خوش فہمی پر نادم تھا۔ چند لمحوں میں دونوں کو اندازہ ہوگیا کہ بات کچھ نہیں تھی۔ بس راستے میں اختیار کی جانے والی طویل خاموشی نے ہم دونوں کو تردد میں مبتلا کردیا تھا۔ خالد ان لوگوں سے براہِ راست بھڑنے کے سوا ہر کارروائی پر آمادہ تھا اور میں بھی اس دوران میں چوہدری عظمت کو گھیرنے کے لیے کسی متبادل طریقہ کار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

جب سوچ یکساں ہو تو پھر زیادہ بحث اور تکرار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ذرا سی دیر میں یہ طے ہوگیا کہ خالد ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات یکجا کرکے مجھ سے اگلے دن ملے گا اور ان معلومات کی روشنی میں ہیومن سوسائٹی والوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کا کوئی پروگرام طے کیا جائے گا۔ غزالہ لباس تبدیل کرکے غسل خانے سے برآمد ہوئی تو اس موضوع پر میری اور خالد کی گفتگو تقریباً ختم ہوچکی تھی۔

خالد حساس طبیعت کا مالک تھا اور ساتھ ہی زیرک بھی۔ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی ہوٹل کے ایک کمرے میں رہ رہے تھے۔ وہی ہماری کل کائنات تھی۔ جب تک خالد وہاں بیٹھا رہتا۔ غزالہ بے فکری سے بستر کا رخ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے آجانے کے بعد خالد نے ہم سے رخصت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ میرے اصرار کے باوجود وہ کھانے کے لیے نہیں رکا اور ہمیں الوداع کہہ کر واپس چلا گیا۔

"اس ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا" کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے کسل مندی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "بس سلمٰی سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہوگئی ورنہ دوسرے معاملات جوں کے توں ہیں۔"

"یہ آپ کی رائے ہوسکتی ہے۔" غزالہ نے سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے اس سے اختلاف ہے۔"

میں نے اسے اشارہ کرکے انٹرکام پر ہوٹل کی روم سروس کا نمبر ملایا' اس روز کا مینو معلوم کرکے کمرے میں کھانا پہنچانے کی ہدایت کی اور دوبارہ غزالہ کی طرف متوجہ ہوگیا "مجھ سے اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کسی موہوم سی کامیابی کا احساس ہورہا ہے۔"

"ہوٹل چھوڑنے تک ہم چوہدری عظمت کے بارے میں نری قیاس آرائیاں کررہے تھے۔ اب ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ وہ واقعی ایک پراسرار شخص ہے جس تک رسائی

Downloaded from http://paksociety.com

آسان نہیں ہے۔ وہ سلمٰی کا ماموں ہے مگر خود سلمٰی بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ یہ وہ باتیں ہیں جو اسے مشکوک بناتی ہیں لیکن آپ نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بارے میں آپ کے کیا شبہات ہیں؟"

"ابھی ہر بات غیر یقینی ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا" میں نے کرسی پر دراز ہو کر کہا "خالد پریشان ہے کہ ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والا کیمیکل بھارت سے کس طرح پاکستان آرہا ہے۔ اگر ایس ٹی ایف جیسا ادارہ یہ کھوج لگانے میں ناکام رہا ہے تو طے ہو جاتا ہے کہ یہ کام زبردست منصوبہ بندی اور احتیاط کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ ہیروئن کی کہیں کوئی قلت نہیں ہے۔ یہ نشہ دستیاب ہے اور اس کے دام بھی معمول پر ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ سرحدی پٹی میں قائم کارخانوں کو وافر مقدار میں کیمیکل مل رہا ہے۔ یہ ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ہیومن سوسائٹی کے پاس ٹرانسپورٹ کے وسیع ذرائع ہیں۔ ان کی گاڑیاں نقد اور اجناس کی صورت میں دور دور سے بلکہ صحیح طور پر شاید سرحدی علاقوں سے عطیات جمع کرتی ہیں جو طویل فاصلہ طے کرکے صوبہ سرحد تک پہنچائے جاتے ہیں۔"

"اوہ! میرے خدا!" غزالہ نے میری بات درمیان سے کاٹ دی "آپ کا مطلب ہے کہ ہیومن سوسائٹی کو حاصل آزادیوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہے؟ ان کی گاڑیاں پاکستان اور بھارت کے سرحدی علاقے سے کیمیکل لاتی ہیں اور خیبر کے پہاڑوں میں قائم کارخانوں تک پہنچادیتی ہیں؟"

"ابھی میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں نے حقائق بتائے ہیں۔ تم نتائج اخذ کررہی ہو" میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"نتائج اخذ کیے بغیر ہم آگے کام نہیں کرسکتے۔ آخر آپ میرے سامنے اتنے محتاط کیوں ہیں؟"

"سچ پوچھو تو میرا ذہن اس گتھی میں الجھا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔ بس ذہن میں خلش تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہورہی ہے۔ تم نے زبان کھول کر میری یہ مشکل آسان کردی۔ اب میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔ دیہی علاقوں سے عطیات لے کر لاہور آنے والی گاڑیوں کی سختی سے جانچ پڑتال کی جائے تو کچھ نہ کچھ ضرور سامنے آئے گا۔ قصور سے سیالکوٹ تک سرحد کے دونوں طرف آبادیاں ہیں۔ وہ لوگ کہیں بھی کوئی لین دین کرسکتے ہیں۔"

"بھارت روانگی کا فیصلہ ہوجانے کے بعد میں نے بھی کچھ پڑھا ہے اور نقشے دیکھے ہیں" میری بات سن کر غزالہ مسکراتے ہوئے بولی "ہماری اور بھارت کی سرحد قصور سے شروع ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ لاہور میں بھی نہیں بلکہ سندھ کے انتہائی جنوب میں بحیرۂ عرب اور رن کچھ سے شروع ہوتی ہے۔ پورے سندھ کی سرحد بھارت سے ملتی ہے۔ پنجاب میں بھی رحیم یار خان سے بھارتی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ یہ کام رن کچھ سے جموں تک کہیں بھی ہوسکتا ہے، پھر لاہور ہی کیوں؟"

"ہر مجرم اپنے ٹھکانے اور شہر میں شیر ہوتا ہے" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اس بات سے ظاہر ہورہا ہے کہ اب آپ نے چوہدری عظمت کو مجرم تصور کرنا شروع کردیا ہے؟"

"مجبوری ہے۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود واقعات اس کے خلاف جارہے ہیں۔ اسمگلنگ سندھ کے راستے بھی ہوتی ہے مگر وہاں آبادیاں بہت کم ہیں۔ راستے طویل، ریگستانی اور دشوار گزار ہیں۔ اس علاقے کے حالات مختلف ہیں۔ فوجی اور سیاسی معاملات سازگار ہوں تو دونوں طرف، سرحد کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی ہوتی ہے اور پھر وہ مہنگا کیمیکل ٹینکروں سے نہیں آتا، اس کے دو چار سو چھوٹے ڈرم بھی دولت کی برسات کردیتے ہوں گے۔"

روم سروس کا ایک ویٹر کھانے کی ٹرالی کے ساتھ آگیا اور وہ گفتگو وہیں رہ گئی۔

وقت کافی گزر چکا تھا۔ ہم دونوں کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اشتہا انگیز خوشبوؤں والے کھانے سامنے آتے ہی ہم نے ڈنر کا آغاز کردیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ غزالہ کے ابتدائی فقروں سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کراچی کی کال تھی اور دوسری طرف سے ویرا بول رہی تھی۔ ویرا کو اپنی مرضی کے خلاف کراچی میں رکنا پڑا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ غزالہ سے کوئی تلخ و ترش بات نہ کہہ بیٹھے۔ میں نے بڑھ کر غزالہ سے ریسیور لے لیا۔

"... اس پر نظر رکھنا" میرے کانوں میں ویرا کی آواز آئی۔ اسے علم نہیں ہوسکا تھا کہ ریسیور غزالہ سے میرے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ وہ اپنی دانست میں غزالہ سے ہی بات کررہی تھی "میں نے ڈینی کو قریب سے دیکھا ہے۔ سفر میں وہ بالکل بدل جاتا ہے۔"

"ہرگز نہیں بدلتا۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "تم غزالہ کو میری طرف سے بھڑکانے کی کوشش کیوں کررہی ہو؟"

"مجھے کسی کو بھڑکانے کی ضرورت نہیں" غزالہ کے بجائے میری آواز سن کر ویرا کے لب و لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا "میں غزالہ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ تم رفتہ رفتہ خدائی فوج دار بنتے جارہے ہو۔ جہاں جاتے ہو، کسی نہ کسی سے الجھ پڑتے ہو۔ سنا ہے کہ لاہور میں بھی

Downloaded from https://paksociety.com

تم چین سے نہیں بیٹھے۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟" میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"مجھے الہام نہیں ہوتا' یہ خبر اول خان نے دی تھی" ویرا نے چیخ کر جواب دیا "کراچی میں ہونے والے دھماکے کے بارے میں اول خان کو بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ تم کو تازہ ترین واقعات کا علم تھا۔ کچھ کیے بغیر آدمی اتنا باخبر نہیں رہ سکتا۔"

"بس ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ وہ سوچتا رہ گیا۔ میں نے جلال کو فون کرلیا تھا۔"

"کراچی میں خون آشام دہشت گردی کے بعد بھارتیوں کا لب ولہجہ بدل گیا ہے۔ اگر تم نے آج کے اخبارات دیکھے ہوں تو تمہیں علم ہو چکا ہوگا کہ انہوں نے جو گیندر پال کے قتل کی ذمے داری پاکستانی ایجنسیوں پر ڈال دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھری آبادی میں صرف ایک بھارتی اہل کار کی موت منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ اسے نشانہ بنا کر مارا گیا ہے۔"

"میں نے آج کے اخبارات نہیں دیکھے لیکن ان کا یہ موقف میرے لیے متوقع تھا۔ تم اسے کیوں دہرا رہی ہو؟"

"کشیدگی بڑھنے کے امکانات ہیں۔ اس سے آگے تم خود سوچ سمجھ سکتے ہو۔ مجھے مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس واقعے کو بھول جاؤ۔ بہت سی باتیں محض ریکارڈ کے لیے رسمی طور پر کہی جاتی ہیں' جو کچھ طے ہو چکا ہے اس پر عمل ہوگا۔"

"میں خود ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتی لیکن تم کو باخبر رکھنا میرا فرض تھا تاکہ بعد میں تم شکایت نہ کرو کہ میں نے تم سے دور رہ کر اپنے فرائض سے روگردانی کی ہے۔ میں الگ رہوں یا کسی کے ساتھ' میری کارکردگی یکساں رہتی ہے۔"

"اخباری اطلاعات کا دہرانا کمال نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ لاہور میں بھی اخبارات چھپتے ہیں اور ان میں وہ سب اہم خبریں ہوتی ہیں جو کراچی کے اخباروں میں شائع ہوتی ہیں۔"

"یہ نہ بھولو کہ ابھی تم نے اخبار نہ دیکھنے کا اعتراف کیا ہے" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خبر پھر خبر ہوتی ہے۔ ہر حال میں سفر کرتی ہوئی متعلقہ لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تم یہ سناؤ کہ سلطان شاہ کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟"

"پہلے وہ اپنے کمرے میں پڑا پشتو گانے سنتا رہا۔ اب کہیں نکلا ہوا ہے۔ بس گزر رہی ہے۔"

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس وقت تک ان دونوں کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے قدرے سکوت کے بعد پوچھا "جہانگیر کا کوئی فون آیا تھا؟"

"نہیں۔ وہ ہمیں کیوں فون کرے گا؟ لاہور میں بھی وہ تمہارے دماغ سے چپکا ہوا ہے۔"

ویرا کی جھلاہٹ پر میں بے ساختہ ہنس پڑا "وہ مجھے بلاوجہ یاد نہیں آیا۔ اس سے کراچی ائرپورٹ پر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی زوجہ اسی پرواز سے لاہور آئی ہے۔ جس سے ہم نے سفر کیا تھا۔"

"پھر واقعی حیرت ہے" ویرا قائل ہوگئی "اگر جہانگیر کو معلوم ہے کہ تم شہر سے باہر ہو تو پھر اسے مجھ کو ضرور فون کرنا چاہیے تھا۔ بے چارہ ہمیشہ میرے ساتھ تخلیے کو ترستا ہے۔ مگر آج تک اسے اپنے دل کی بات زبان پر لانے کا موقع نہیں مل سکا۔ پتا نہیں اس کی یہ حسرت کب پوری ہوگی۔"

"وہ اب بھی کبھی کبھی حیران ہوتا ہے کہ تم ہی بلیک کوئن کے روپ میں اس کے اوسان خطا کیا کرتی تھیں۔ اسے کئی بار تمہارے ساتھ بیٹھنے اور پینے کا موقع ملا ہے لیکن شاید یہی تصور اس کی زبان کا قفل بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تم کو بہت پسند کرتا ہے۔"

"آزاد خیال اور خوش رو لڑکیوں کے لیے ہر مرد ندیدا اور دل پھینک ثابت ہوتا ہے۔ تم اسے الزام نہیں دے سکتے۔"

"یہی خواص تم میں بھی پائے جاتے ہیں" میں نے کن انکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اطمینان سے بستر پر دراز ہو چکی تھی اور ٹیلی وژن کی طرف متوجہ تھی۔ بظاہر میرا جواب گول مول لیکن ویرا کے لیے واضح تھا۔ اس کی اداس آواز ابھری "یہ پارینہ قصے ہوگئے۔ تمہیں علم ہے کہ میں اپنے ماضی کو دفن کر چکی ہوں۔"

"یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔ میں نے تمہارے والدین کی تدفین کے بارے میں سنا تھا۔ آج تم نئی بات بتا رہی ہو۔"

"تم بہت بے رحم ہو۔ نشتر زنی پر تل جاتے ہو تو کسی کو معاف نہیں کرتے۔ شاید ہر مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جہانگیر خوشامدی ہے۔ جب وہ بات بات پر کھسیس نکال کر ہنستا ہے تو مردانگی اس کے چہرے سے مفقود ہو جاتی ہے۔"

"اب وہ خطرناک ہوگیا ہے۔ اس کا فون آجائے تو ذرا محتاط رہنا۔ میں کسی فساد کی بُو سونگھ رہا ہوں۔"

"کیسا فساد!" میرے الفاظ نے اسے چونکا دیا "کیا اب تمہیں اس میں بھی کیڑے نظر آنے لگے یا مجھے اس سے دور

Downloaded from https://paksociety.com

"نہ اس میں کیڑے ہیں نہ میں تمہارے بارے میں اتنا فکرمند ہوں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ اس بار لاہور میں سلمٰی کا ماموں میری نظروں میں آگیا ہے۔ بات بڑھے گی تو سلمٰی فوراً اسے بتائے گی اور وہ تم پر چڑھ دوڑے گا۔"

"اوہ...!" اس کے ایک گہرے سانس کی آواز آئی "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم وہاں واقعی کچھ نہ کچھ کر رہے ہو۔ تمہارے بارے میں اول خان کی پریشانی بلاوجہ نہیں ہے۔ کل وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارا لاہور جانا ٹھیک نہیں ہے۔ کراچی میں رکے رہتے تو تمہاری سرگرمیاں سب کے سامنے ہوتیں۔ وہاں تم بے لگام ہو سکتے ہو۔"

"وہ عمر میں مجھ سے بڑا اور زیادہ تجربے کار ضرور ہے مگر میرا سرپرست نہیں ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ میرے بارے میں اتنی تشویش میں مبتلا نہ رہا کرے۔"

"اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ سلمٰی کے ماموں کا کیا چکر ہے' تم اس سے کیسے بھڑ گئے؟"

"ابھی بھڑنے کی نوبت نہیں آئی لیکن آثار اچھے نہیں ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر سلمٰی کے ماموں کا پیچھا نہیں کیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں جس شخص کی راہ پر لگا وہ بعد میں جہانگیر کا ماموں سسر ثابت ہوا۔ ابھی سلمٰی اندھیرے میں ہے۔ بات کھلے گی تو وہ پھر جائے گی۔ میری پوری کوشش ہے کہ میں پس پردہ رہوں۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں سلمٰی کے ماموں سے کیا پرخاش ہے۔ تم اس کے پیچھے کیوں لگے ہو؟" ویرا کی آواز میں تجسس امڈ آیا۔

"تم بہک رہی ہو۔ میں اس کے ماموں کے پیچھے نہیں لگا۔ ایک مشتبہ شخص کے پیچھے لگا تھا۔ اس کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو پتا چلا کہ وہ سلمٰی کا ماموں ہے۔"

"چلو... یوں ہی سہی مگر یہ تو بتاؤ کہ اس بے چارے کا کیا قصور ہے؟"

"ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہونے والے اہم ترین کیمیکل کی بھارت سے اسمگلنگ پر اس کی اجارہ داری معلوم ہوتی ہے۔"

"تمہاری زبان کالی ہے۔ ابھی تم شبہ ظاہر کر رہے ہو مگر مجھے یقین ہے کہ تم کوئی نہ کوئی چکر چلا کر اسے اس معاملے میں پھانس لوگے اور وہ بری طرح رگڑا جائے گا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لاہور جا کر تمہیں ان سب الجھنوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے الجھنیں مول لینے کا شوق نہیں ہے" میں نے ناگواری سے کہا "ہم کراچی میں رہتے ہیں اور وہاں ہیروئن استعمال کرنے والوں کے اڈے کوئی ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ خالد لاہور کا اول خان ہے۔ یہ لوگ بلاوجہ کسی بات پر فکرمند نہیں ہوتے۔"

"مجھے ڈر یہ ہے کہ تمہارا چہرہ آئندہ چند دنوں میں نارمل ہونے کے بجائے مزید بگڑ نہ جائے" ویرا کی آواز متاسفانہ تھی۔

"یوں کھل کر بددعائیں نہ دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔"

یکایک ویرا کا لہجہ بدل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی "تم ہوٹل میں ہو جہاں ایکسچینج ہونے کی وجہ سے سی ایس ڈی استعمال نہیں ہو سکتی پھر بھی تم بے خوف و خطر ہر بات کیے جا رہے ہو۔ میں بھی بھول گئی تھی کہ ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ شاید تم لاہور میں اپنی گردن پھنسوانے کا مصمم ارادہ کر چکے ہو..."

"اس بارے میں اول خان مجھے کلیئرنس دے چکا ہے۔ شاید یہاں کے ایکسچینج میں کوئی ایسا خودکار نظام ہے کہ آپریٹر ایک مرتبہ کال منتقل کرنے کے بعد دوبارہ اس میں مداخلت کر سکتا ہے نہ دونوں طرف کی گفتگو سن سکتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال سکتی ہو۔"

"اگر تمہیں اور تمہارے اول خان کو اس سسٹم پر اتنا اعتماد ہے تو تم جانو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم ہم کو نظرانداز کر کے لاہور میں اپنی من مانیاں کرنے کے لیے آزاد ہو تو پھر میں بھی کسی کی پابند نہیں ہوں۔ جو ذہن میں آئے گا' کر گزروں گی۔"

"تم سنتی کب ہو؟ جو دل میں آتا ہے کر ڈالتی ہو۔ اب تمہاری کھوپڑی میں کیا لاوا پک رہا ہے؟"

"میں کوئی روگ نہیں پالتی' بے فکری کی زندگی گزارتی ہوں" اس کی طرف سے جواب آیا "مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ تم مصروف ہو گئے تو مجھے بھی ہاتھ پیر مارنے چاہئیں۔ ہم تینوں بھارت چلے گئے تو جان امتھ کراچی میں دبکا رہے گا۔ اسے ہراساں کرنا ضروری ہے کہ وہ بھی کراچی بلکہ پاکستان سے نکل بھاگے ورنہ بھارت میں کوئی لطف نہیں رہتے ہیں۔ خالد نے لاہور کا جو نقشہ کھینچا وہ کراچی سے بھی زیادہ دل دوز ہے۔ یہاں بھی ہیروئن غریب اور مزدور طبقے سے نکل کر عزت دار گھرانوں میں پھیل رہی ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان اس نشے کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ یہ سب سن کر کوئی بے حس آدمی ہی غیر جانب دار رہ سکتا ہے۔"

"میرے لیے یہ اطلاع مزید حیران کن ہے کہ تم صرف سنی سنائی باتوں پر میدان میں کود پڑے ہو۔"

"یہ دیکھنا ضروری ہے کہ سنانے والا کون ہے۔ خالد لاہور کا اول خان ہے۔ یہ لوگ بلاوجہ کسی بات پر فکرمند نہیں ہوتے۔"

"مجھے ڈر یہ ہے کہ تمہارا چہرہ آئندہ چند دنوں میں نارمل ہونے کے بجائے مزید بگڑ نہ جائے" ویرا کی آواز متاسفانہ تھی۔

"یوں کھل کر بددعائیں نہ دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔"

یکایک ویرا کا لہجہ بدل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ وہ کہہ رہی تھی "تم ہوٹل میں ہو جہاں ایکسچینج ہونے کی وجہ سے سی ایس ڈی استعمال نہیں ہو سکتی پھر بھی تم بے خوف و خطر ہر بات کیے جا رہے ہو۔ میں بھی بھول گئی تھی کہ ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ شاید تم لاہور میں اپنی گردن پھنسوانے کا مصمم ارادہ کر چکے ہو..."

"اس بارے میں اول خان مجھے کلیئرنس دے چکا ہے۔ شاید یہاں کے ایکسچینج میں کوئی ایسا خودکار نظام ہے کہ آپریٹر ایک مرتبہ کال منتقل کرنے کے بعد دوبارہ اس میں مداخلت کر سکتا ہے نہ دونوں طرف کی گفتگو سن سکتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال سکتی ہو۔"

"اگر تمہیں اور تمہارے اول خان کو اس سسٹم پر اتنا اعتماد ہے تو تم جانو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم ہم کو نظرانداز کر کے لاہور میں اپنی من مانیاں کرنے کے لیے آزاد ہو تو پھر میں بھی کسی کی پابند نہیں ہوں۔ جو ذہن میں آئے گا' کر گزروں گی۔"

"تم سنتی کب ہو؟ جو دل میں آتا ہے کر ڈالتی ہو۔ اب تمہاری کھوپڑی میں کیا لاوا پک رہا ہے؟"

"میں کوئی روگ نہیں پالتی' بے فکری کی زندگی گزارتی ہوں" اس کی طرف سے جواب آیا "مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے کہ تم مصروف ہو گئے تو مجھے بھی ہاتھ پیر مارنے چاہئیں۔ ہم تینوں بھارت چلے گئے تو جان امتھ کراچی میں دبکا رہے گا۔ اسے ہراساں کرنا ضروری ہے کہ وہ بھی کراچی بلکہ پاکستان سے نکل بھاگے ورنہ بھارت میں کوئی لطف نہیں

Downloaded from https://paksociety.com

آئے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کا صفایا ہونا ضروری ہے۔ اس نیک کام کے لیے پڑوسی ملک کی زمین زیادہ مناسب رہے گی۔"

ویرا نے دور کی بات سوچی تھی۔ ہم پہلے ہی طے کرچکے تھے کہ کسی طرح جان اسمتھ کو نئی دہلی کا رخ کرنے پر مجبور کیا جاسکے تو اسے وہاں ٹھکانے لگادیا جائے۔ اگر ہم تینوں پاکستان سے نکل جاتے تو اول خان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ حدود سے تجاوز کرکے جان اسمتھ کو دہشت زدہ کرسکے۔ کراچی چھوڑنے سے پہلے وہ اہم نکتہ میرے ذہن میں نہیں آسکا تھا۔

ویرا وہ کام عمدگی سے کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ جان اسمتھ دباؤ میں آکر کراچی چھوڑ دیتا تو چند ہفتوں سے پہلے اس کی واپسی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس دوران میں ہم سرحد پار کرکے بھارت پہنچ جاتے اور اس کی بے پروائی سے فائدہ اٹھاکر اطمینان سے اپنا کام کرگزرتے۔

میں نے اس کی تجویز کے بارے میں اپنی پسندیدگی چھپاتے ہوئے جواب دیا "وہ کراچی میں مقیم ضرور ہے مگر اس کا پورے جنوبی ایشیا میں سی آئی اے کے آپریشنز دیکھنے پڑتے ہیں۔ وہ بھارت اور دوسرے ملکوں کا کثرت سے سفر کرتا رہتا ہے۔ ہماری موجودگی میں دہلی ضرور آئے گا۔ اس بارے میں تمہیں کوئی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"زحمت نہیں، میں اس کام کو اپنا فرض تصور کررہی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم مسلمانوں میں موذی کو ایذا پہنچانے کا موقع ملنے سے قبل ہی مار دینے کا نظریہ رائج ہے۔ جان اسمتھ بہت بڑا موذی ہے۔ اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کوشش کو کارِ ثواب کا درجہ حاصل ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں کہ کوئی بات تمہارے دماغ میں گھس جائے تو اسے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے چھیڑ چھاڑ میں تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ سلطان شاہ کے سوا کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکے گا۔ میمن گوٹھ میں پیش آنے والے واقعات کے بعد امریکی بہت محتاط ہوچکے ہیں۔ تمہارا مشتبہ سایہ بھی ان کے بھڑکنے کا سبب بن جائے گا۔"

"یہ رٹی رٹائی باتیں دہرانے کا شکریہ۔ جہانگیر کو میرا ماضی یاد رہتا ہے مگر تم ہمیشہ بھول جاتے ہو کہ میں تمہاری ایک کوئن رہ چکی ہوں جس کی دہشت سے عادی مجرم تک کانپ اٹھتے تھے اور کسی کو بھنک نہیں ملتی تھی کہ چست، نئے لباس میں کون ان کے دماغوں پر حکمرانی کررہا ہے۔"

"میں تمہیں صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ کسی بات سے روک سکتا ہوں، نہ کوئی کام کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں۔ یاد رکھنا کہ ماضی پر زیادہ ناز کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ تم نے جرائم پیشہ لوگوں پر حکمرانی کی تھی۔ سیکرٹ ایجنٹ ان سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہم سب کو تمہاری ضرورت ہے، تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم میری ضرورت محسوس کرتے ہو۔" ویرا کی آواز مسرت آمیز تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں صرف اپنی نہیں، سب کی بات کررہا تھا۔ سب تمہاری زندگی اور خیریت کے خواہاں رہتے ہیں۔"

"میں دوسروں کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ تم کہہ رہے ہو تو میں بہت محتاط رہوں گی۔ شاید بات فون کالز تک ہی محدود رہے گی۔"

"اپنا نام بھول کر بھی استعمال نہ کرنا" میں نے تاکید کی "ڈینی اور ویرا کے ناموں سے انہیں نفرت ہے۔ جب وہ میرے خلاف دفترِ خارجہ میں شکایت کرسکتے ہیں تو تمہارے بارے میں بھی ایسا ہی شور مچاسکتے ہیں۔ اپنی شناخت ہرحال میں پوشیدہ رکھنا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ بھارتی سرزمین پر آخری وقت آنے سے پہلے اسے معلوم نہیں ہوسکے گا کہ اسے ہانکنے والی کون تھی۔ شاید تمہیں کوئی تجربہ نہیں ہوا لیکن میں فیشن زدہ پاکستانی عورتوں جیسی لولی لنگڑی انگریزی بھی بہت مہارت سے بول لیتی ہوں۔"

"ویری گڈ... سلطان شاہ آجائے تو اسے میری طرف سے دعا اور پیار کہہ دینا" میں نے ہنس کر کہا۔

میرا وہ پیغام سنتے ہی ویرا چیخ اٹھی "وہ اتنا ننھا اور بھولا نہیں ہے۔ تم نے بلاوجہ اسے اپنا لے پالک بناکر سر پر مسلط کیا ہوا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک مرد کی طرف سے دوسرے مرد کے لیے ایسا پیغام کہیں بھی پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔"

"تم ہر بات کا غلط مفہوم نکالنے میں ماہر ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ مجھے کتنا عزیز ہے۔ تمہیں برا لگتا ہے تو اسے میری دعا ہی پہنچا دینا۔"

"پہنچادوں گی" اس کی بے پروایانہ آواز آئی "وہ جس اشتیاق سے آج کل بیجان انگیز پشتو گانے سن رہا ہے، اس میں کمی کے لیے اسے دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ اس کا انہماک دیکھ کر مجھے ہر دم اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ کسی مسرت زدہ شاہین کی طرح اپنی دم کے بل ٹھمکنا شروع نہ کردے۔"

میں اپنی بے ساختہ ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ ویرا صرف [illegible] واقفیت تھی [illegible]

Downloaded from: https://paksociety.com

والے قبائلیوں سے وہ براہِ راست ان ہی کی زبان میں مذاکرات اور سودے بازی کرتی تھی۔ شاید سلطان شاہ بھول چکا تھا کہ ویرا پشتو گانوں کا پورا مفہوم سمجھتی ہے۔ اس کی یہ کمزوری اسے کسی بھی وقت ویرا کے ہاتھوں میں کھلونا بنا سکتی تھی۔

چند الوداعی فقروں کے تبادلے کے بعد ویرا سے وہ نتیجہ خیز گفتگو ختم ہوگئی۔

"ویرا آپ سے بہت لمبی گفتگو کرتی ہے" غزالہ نے ہنس کر کسی طنز کے بغیر کہا۔

"وہ عادت سے مجبور ہے۔ ہر بات میں بحث ضروری سمجھتی ہے۔ تم بحث سے اپنا دامن بچاتی ہو۔ تم سے اس کی باتیں زیادہ طول نہیں پکڑتیں۔ ویسے بھی وہ دوسری عورتوں سے بہت مختلف ہے۔ زیورات، کپڑوں اور خوشبوؤں کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتی۔"

"مجھے بھی ان خرافات سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے کبھی آپ سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔"

"چلو، پھر ان خرافات کو کچھ دیر کے لیے فراموش کردو" میں ہنستا ہوا بستر پر دراز ہوگیا "تم ان کے بغیر بھی اچھی لگتی ہو۔"

○☆○

خالد صبح نو بجے ہوٹل آپہنچا۔ اس نے ہوٹل کی لابی سے انٹرکام پر اپنی آمد کی اطلاع دی تو اس کی آواز سے تکان مترشح تھی۔

ہم دونوں پچھلی رات کو وقت سے سوگئے تھے اور گہری نیند لے کر کافی دیر پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ میں نے خالد کو فوراً اوپر بلالیا۔ لابی کے مقابلے میں کمرے میں سکون سے بیٹھ کر ہم زیادہ بے فکری سے گفتگو کرسکتے تھے۔

خالد اوپر آیا تو اس کے چہرے پر شگفتگی مفقود تھی۔ آنکھوں پر ہلکا سا ورم آیا ہوا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ پچھلی رات اس نے بے خوابی میں گزاری تھی۔

ہوٹل میں ملنے والی سہولیات کے بارے میں ہمیں کوئی شکایت نہیں تھی مگر خالد اس بارے میں فکرمند تھا۔ وہ ہماری گفتگو کا ابتدائی موضوع تھا پھر اس نے بتانا شروع کیا کہ اس نے ہیومن سوسائٹی اور چوہدری عظمت کی سرگرمیوں کے بارے میں رات سے ہی بھرپور پیمانے پر کام شروع کردیا تھا۔

چوہدری عظمت کی سرگرمیوں کا دائرہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ دور افتادہ مقامات سے عطیات جمع کرنا اور پھر انہیں مستحقین تک پہنچانا اس اکیلے کے بس کا کام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اس کا دوست ملک اقبال ترک بڑا اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا

تنخواہ دار ملازمین میں شاہد اپنے سربراہ کا معتمد خاص تھا وقت کی پروا کیے بغیر ضرورت کے ہر موقع پر پیش پیش تھا۔ عملی طور پر وہ تینوں مل کر ہیومن سوسائٹی کو چلا رہے تھے۔ کام کا زیادہ بوجھ شاہد نے سنبھالا ہوا تھا کیونکہ وہ ا فلاحی ادارے کا کل وقتی اور تنخواہ دار ملازم تھا لیکن چوہد عظمت نے سب کچھ اسی کی صوابدید پر نہیں چھوڑا ہوا تھ خود باقاعدگی سے ہیومن سوسائٹی کے دفتر آتا تھا۔ اس آمدورفت کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ اس کا ایک سب بہت واضح تھا کہ وہ ہیومن سوسائٹی کے بکھیڑوں کے ساتھ کاروبار بھی چلا رہا تھا۔

خالد کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ ہیومن سوسا کے پاس گاڑیوں کا کوئی بڑا بیڑا تھا۔ ان کے پاس بند آ باڈی والے کل چار چھوٹے ٹرک تھے۔ ان میں سے تی ٹرک لاہور اور اس کے مضافات سے عطیات جمع کر بادامی باغ میں واقع ہیومن سوسائٹی کے گودام میں پہنچا تھے۔ وہاں چھانٹی کے بعد وہ استعمال شدہ ساز و سامان نئی ا اور کھانے پینے کی اجناس چوتھے ٹرک کے ذریعے صوبہ سرح کے لیے روانہ کردی جاتی تھیں۔ بقیہ سامان کرائے کے ٹرکوں سے بھیجا جاتا تھا جن پر سوسائٹی کے بینر لگادیے جا تھے۔

ہیومن سوسائٹی والے اس بات کی تشہیر نہیں کر تے تھے لیکن وہ ادارہ محکمہ سماجی بہبود میں باقاعدہ رجسٹرڈ تھا یو اسے خود بہ خود ایک این جی او کا درجہ ملا ہوا تھا۔ مخیر لوگوں طرف سے ان کو خاصی مالیت کے نقد عطیات بھی ملتے تھے بیشتر کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا تھا لیکن بعض صاحب حیثیت او دردمند لوگ بھاری رقوم دینے کے باوجود اپنا نام ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہ مجبوری حقیقی تھی۔ انکم ٹیکس کے گوشواروں میں اپنی اصلی آمدنی چھپانے والے یہ اہل ثرو کارِ خیر میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ان کے کارہائے خیر کے زیا چرچے ہونے لگتے تو ان کے لیے انکم ٹیکس کے سنگین مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔ جہاں لوگ خال خال ہی اپنی اصل آمدنی ظاہر کرتے ہیں۔

وہ سب مثبت پہلو تھے۔ چونکانے والی بات صرف ایک تھی کہ ہیومن سوسائٹی کے اخراجات کا محتاط تخمینہ اس کی مقامی آمدنی سے کہیں زیادہ تھا۔ ان معلومات کے حصول کے لیے خالد کو خفیہ ذرائع تک رسائی کے لیے خاصی تگ و دو کرنی پڑی تھی۔ بیرونی امداد کے بارے میں اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کردیا تھا مگر اسے فوری طور پر کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ معلومات کسی بھی وقت سامنے آسکتی تھیں۔

Downloaded from https://paksociety.com

سازوسامان جمع کرکے لانے والے ایک ٹرک کی آمد سے پہلے شاہد بذات خود بادامی باغ کے گودام میں موجود رہتا تھا اور پھر عملے کی کسی تبدیلی کے بغیر وہ ٹرک اسی رات صوبہ سرحد میں اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ کردیا جاتا تھا۔

ہیومن سوسائٹی کا کام پھیلا ہوا تھا۔ تین افراد اس کا نظام چلا رہے تھے اور وہی اس کے وسائل پر قابض تھے لیکن ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہر کام خود کرلیتے۔ انہیں اپنی ہر بڑی سرگرمی کے لیے کچھ نہ کچھ ملازموں کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ لوگ سر جھکا کر اپنے بڑوں کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ لیکن سامنے آنے والی ہر غیر معمولی بات ان کے حافظے میں محفوظ ہوجاتی تھی۔

رفتہ رفتہ وہ غیر معمولی باتیں بھی ان کے معمول میں شامل ہوگئی تھیں۔ وہ لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ نہایت نیک نامی کے ساتھ چلائی جانے والی فلاحی این جی او کی آڑ میں کوئی مذموم کھیل کھیلا جارہا ہوگا۔

ایس ٹی ایف کے محنتی کارندوں نے بادامی باغ والے گودام کے چوکیداروں اور نچلے درجے کے دوسرے ملازموں کو مالی لالچ دے کر خاصی مشکل سے وہ معلومات حاصل کی تھیں جو مجھے کام آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی نظر آرہی تھیں۔

"وہ لوگ اتنا جانتے ہیں تو انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ خاص ٹرک کس علاقے سے آتے ہیں" غزالہ نے پوچھا۔

خالد کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے معلوم تھا کہ یہ سوال ضرور اٹھے گا۔ اس پر میں نے خود رات کالی کی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ قصور اور اس کے گردونواح سے لوٹنے والے ہر ٹرک کے لیے شاہد پہلے سے بادامی باغ والے گودام میں موجود رہتا ہے۔"

"میں قصور کبھی نہیں گیا لیکن سنا ہے کہ ان اطراف میں سرحدی گاؤں بہت قریب واقع ہیں" میں نے چونک کر کہا۔

"قصور اور بھارتی شہر فیروزپور کے درمیان کئی گاؤں آباد ہیں۔ فوجی چوکیاں بھی موجود ہیں مگر پھر بھی سرحد کے ہر انچ کی نگرانی ممکن نہیں ہوتی" خالد نے بتایا۔

"تم صرف اندازے کی بات کررہے ہو۔ اس بارے میں کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہوسکی؟" میں نے سوال کیا۔

"اس ٹرک پر ہمیشہ ڈرائیور اور کلینر کی ایک ہی جوڑی ہوتی ہے۔ وہ دونوں شاہد اور چوہدری عظمت کے رازداں معلوم ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ قصور سے بادامی باغ کے راستے طورخم تک آنے جانے والے مشتبہ ٹرک پر ہمیشہ وہی دونوں ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو [illegible]

والے عطیات کی بعض رسیدوں سے لوگوں کو یہ سن گن ملی ہے کہ وہ دونوں اسی راستے پر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"آدمی وہی رہتے ہیں۔ راستہ ایک ہے۔ یہی اس قصے کی کلید معلوم ہوتی ہے" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"ہماری کوششوں کے ابتدائی نتائج حوصلہ شکن تھے مگر پھر جمود ٹوٹا اور باتیں سامنے آنے لگیں۔ مجھے سو فیصد یقین ہوچکا ہے کہ ہیومن سوسائٹی کی آڑ میں کوئی بہت گندا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ انہیں چھوٹ دے کر بہت بڑی غلطی کی گئی تھی۔"

"چھوٹ؟" میں نے حیرت سے پوچھا "کیا انہیں یہاں کسی قسم کی چھوٹ بھی ملی ہوئی ہے؟"

"کیمیکل کی اسمگلنگ کا سراغ لگانے کے لیے جب بھی اچانک چوکیاں بناکر گاڑیوں کی جانچ پڑتال کی گئی' ایمبولینسوں اور رفاہی اداروں کی گاڑیوں کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔ یہ چھوٹ نہ دی گئی ہوتی تو یہ لوگ بہت پہلے گرفت میں آگئے ہوتے۔"

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس وقت سے پہلے کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا" غزالہ نے اس کے متاسفانہ لہجے پر تشفی دی "اب ان کا وقت پورا ہوچکا ہے۔ ان کے لیے تمہارے ذہن میں کیا تجویز آئی ہے۔"

"جب سے حقائق سامنے آئے ہیں' میں ڈھنگ سے کوئی بات سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ رہ رہ کر غصہ آرہا ہے کہ ہیومن سوسائٹی والے ہماری ناک کے نیچے جرائم کا ارتکاب کررہے تھے اور ہم ان کو نظرانداز کیے بیٹھے تھے۔ پتا نہیں تمہاری توجہ ان کی طرف کیسے مبذول ہوگئی۔"

"ان کا وقت پورا ہوگیا تھا ورنہ ان کا نام اتفاقاً ہمارے سامنے آیا تھا" میں نے اسے بتایا "غزالہ نے شہر بھر میں لگے ہوئے دیواری اشتہاروں کا ذکر نہ کیا ہوتا تو مجھے ہیومن سوسائٹی کا خیال بھی نہ آتا۔ وہ این جی او ہے اور میں این جی اوز کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ ان کے تابوت میں دوسری کیل تم نے ٹھونکی تھی۔ اگر تم ان کی غیر معمولی ایمان داری اور نیک نامی پر زور نہ دیتے تو پھر بھی میں شاید انہیں بھول جاتا۔ پاکستان میں صرف ایک ہی شخص ہے جو مفت کے مال کو اپنی پوری صلاحیتوں کے مطابق صحیح مصرف میں لاتا ہے۔ اس سے نیک نیتی میں فیصلے کی کوئی غلطی ہوتی ہو تو وہ الگ بات ہے مگر وہ مخلص آدمی ہے۔"

"آپ شاید عبدالستار ایدھی کی بات کررہے ہیں؟" غزالہ بولی "بعض لوگ تو اس پر بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

[illegible] ایدھی کو نہیں

Downloaded from https://paksociety.com

بخشتے' چوہدری عظمت کیسے اس سے آگے ہو سکتا ہے۔"

"یہ مشاہدے اور تجربے کا کمال ہے" خالد نے سر جھکا کر کہا "بات اتنی معمولی ہوتی تو کسی اور کے ذہن میں بھی آسکتی تھی۔ یہاں ایک سے ایک گھاگ افسر بیٹھا ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا انتظامی تجربہ میری کل عمر سے بھی زیادہ ہوگا۔"

"ویسے تمہاری عمر کیا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"تیس برس ہونے والی ہے" اس نے میرے چبھتے ہوئے سوال کا برا منائے بغیر جواب دیا۔

"پھر تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے' مسلسل ایک سوال میرے ذہن پر طاری ہے کہ اتنی کم عمری میں اسپیشل ٹاسک فورس کے اسٹیشن کمانڈر کیسے بن گئے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس عہدے پر ادھیڑ عمر اور تجربے کار ریٹائرڈ فوجی مقرر کیے جاتے ہوں گے۔"

"یہ کوئی پیرا ملٹری فورس نہیں ہے" خالد نے بلا توقف جواب دیا "فورس کے قیام کے مقاصد بہت محدود اور مخصوص ہیں۔ اس میں ریٹائرڈ فوجی افسروں اور جوانوں کی خاصی تعداد شامل ہے مگر مجھ جیسے متعدد کارکن باہر سے بھی لیے گئے ہیں۔"

"یہ بات پھر رہ گئی کہ ہیومن سوسائٹی کے خلاف کیا قدم اٹھانا چاہیے؟" غزالہ نے ٹوکا۔

"ہمیں کچھ دن انتظار کرنا ہوگا۔ جب بھی ان کا اگلا ٹرک قصور کی طرف جائے' ہمیں ناکابندی کرلینی چاہیے۔ واپسی پر ٹرک رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔ اس میں سے کیمیکل یا کوئی بھی مشتبہ سامان برآمد ہوتے ہی ہیومن سوسائٹی کے اہل کاروں پر ہاتھ ڈال دیا جائے گا' دفتر اور گودام کو سیل کیا جاسکتا ہے۔ ثبوت کی موجودگی میں کوئی اس کارروائی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکے گا۔"

"تم اس معاملے کو اب بھی شہری اداروں کے ذریعے نمٹانے کے بارے میں سوچ رہے ہو" میں نے پوچھا۔

"یہ دوسری ایجنسیوں کا کیس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کئی ادارے اس کیس پر کام کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کسی کو صحیح سراغ نہیں مل سکا۔ ثبوت کے ساتھ سراغ ملے گا تو وہ آناً فاناً میں چوہدری عظمت اور اس کی این جی او کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔"

"یہ معاملہ طول پکڑ جائے گا" میں نے پرتشویش انداز میں کہا "ہوسکتا ہے کہ ہیومن سوسائٹی میں ہی یہ بات پھیل جائے کہ باہر کے کچھ لوگ اس کے ملازمین سے پوچھ گچھ کرتے پھر رہے تھے۔ چوہدری عظمت' ملک اقبال اور شاہد کو اس بازپرس کی خبر بھی ہو گئی تو وہ تمام ثبوت ہی ہوا میں

گے۔"

"میں دوسروں کے دائرہ کار میں کیسے مداخلت کر سکتا ہوں؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔

"مداخلت کی بات نہیں ہے۔ تم خود مجھے بتا چکے ہو کہ لاہور میں یہ وبا بہت بڑھ چکی ہے۔ تم اس بارے میں پریشان تھے۔ اگر دوسروں کو کامیابی نہیں ہوتی تو ضروری نہیں کہ تم دور سے تماشا دیکھتے رہو۔ جرم کی سرکوبی کے لیے تم ہر وقت بڑھ کر وار کر سکتے ہو" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

"پیشہ ورانہ دیانت کا تقاضا ہے کہ پہلے میں متعلقہ اداروں کو اپنی معلومات سے آگاہ کروں پھر ان کی اعانت اور اجازت سے کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایس ٹی ایف میں ڈسپلن کے سوا کچھ بھی نہیں' میں ایک یونٹ کا کمانڈر رہتے ہوئے اس ڈسپلن کو کیسے توڑ سکتا ہوں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ نئی سگریٹ سلگانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا "قصور کی طرف ان کا ٹرک کتنے دنوں بعد جاتا ہے۔"

"کوئی وقفہ مقرر نہیں ہے" اس نے براہِ راست میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ وقفہ ایک ہفتے سے ایک ماہ تک ہوجاتا ہے۔ آخری بار ٹرک دس دن پہلے ادھر ہو کر آیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا اگلا پھیرا کب ہوگا۔ میں نے اپنے دو آدمی قصور جانے والے راستے کی نگرانی پر مامور کر دیے ہیں۔ ٹرکوں پر لکھی ہوئی اردو اور انگریزی عبارت میں ہیومن سوسائٹی کا نام نمایاں ہے۔ وہ دور سے پہچانے جاسکتے ہیں۔"

چوہدری عظمت کے ہر کام میں چالاکی اور مکاری مضمر تھی۔ لاہور سے بھارتی سرحد کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر وہ قصور کے راستے کیمیکل اسمگل کر رہا تھا۔ سرحد پار سے جو کچھ آتا تھا' وہ اس کی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا تھا' گودام میں شاید مال کی جانچ پڑتال کر کے اسے فوری طور پر آگے روانہ کر دیتا تھا۔ شاید وہ اپنے خریداروں کی ضروریات کے مطابق مال منگواتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ بھارتی اسمگلروں سے اس کے مواصلاتی رابطے رہے ہوں۔ چوہدری عظمت کی فون کال پر بھارتی اسمگلر مال مقررہ مقام پر پہنچا دیتے ہوں۔ وہاں سے چوہدری عظمت کا دو نفری عملہ مال لاہور لے آتا ہو۔

وہ چوہدری عظمت کے گھناؤنے دھندے کا سب سے مضبوط احتیاطی پہلو تھا۔ اس کے گھر' ہیومن سوسائٹی کے دفتر یا گودام پر چھاپا مار کر کچھ برآمد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو کچھ تھا' وہ بھارتی زمین پر تھا یا طور خم سے آگے خیبر کے پہاڑی سلسلے میں تھا۔ پاکستان کو اس کیمیکل کی گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ [illegible] سفر پکڑا جاسکتا تھا۔ شاید

Downloaded from https://paksociety.com

خالد نے وہ سب سوچنے کے بعد اپنے آدمیوں کو لاہور اور قصور کے درمیانی راستے کی نگرانی پر لگایا تھا۔

"میری عقل بھی ماؤف ہو کر رہ گئی ہے" میں نے کچھ دیر تک ان پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد خالد سے کہا "شاید اول خان مجھے کوئی بہتر مشورہ دے سکے۔"

خالد میری چال کو نہیں سمجھ سکا۔ سعادت مندانہ انداز میں بولا "مشورہ کرنا ہمیشہ سود مند ثابت ہوتا ہے۔"

خالد میں سب دوستانہ خوبیاں تھیں۔ وہ ہماری دیکھ بھال کر رہا تھا' میری بات مان رہا تھا مگر فیصلے کے لیے میرا کوئی مشورہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں ایک بار اس تجربے سے گزر چکا تھا اور اسے دہرانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں جو بات بیٹھ چکی تھی اسے نکالنا میرے بس سے باہر تھا جب کہ اول خان نے میرے ہر مشورے کو بے چون وچرا قبول کر کے میری عادت بگاڑ دی تھی۔

میرے ایما پر غزالہ نے آپریٹر سے لائن لے کر کراچی میں اسٹیشن فور کا نمبر ملایا۔ وہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ ادھر سے حامد نے غزالہ کو بتایا کہ اول خان اپنے گھر سے نکل چکا تھا اور راستے میں ویرا اور سلطان شاہ کے پاس رکا ہوا تھا۔ ہم دونوں کے لاہور آجانے کے بعد وہ ان دونوں کی خبر گیری کو اپنا فرض تصور کر رہا تھا۔ اس کے لیے ایک سہولت یہ بھی تھی کہ ہمارا گھر اول خان کے گھر اور دفتر کے درمیان واقع تھا۔ وہ آتے جاتے ہوئے اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی وقت وہاں رک سکتا تھا۔

غزالہ نے ہمارے گھر کا نمبر ملایا تو ادھر سلطان شاہ تھا۔ اس سے خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد غزالہ نے اول خان کے بارے میں پوچھا اور ریسیور مجھے دے دیا۔

"سنا ہے کہ لاہور میں تم جہانگیر کے ماموں سسر سے الجھ پڑے ہو؟" میری آواز سنتے ہی اول خان نے پوچھا۔

"ویرا نے تمہارے کان بھرے ہوں گے" میں نے ہنس کر کہا "بس اس کے ستارے گردش میں آگئے تھے۔ اب بات کافی آگے بڑھ گئی ہے۔ معاملہ اس کے خلاف کارروائی تک آگیا ہے مگر یہاں میرے کچھ تحفظات ہیں۔ شاید خالد کے لیے بھی کوئی قدم اٹھانا آسان نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا' کیا جائے" فون پر بات کرتے ہوئے میری نظریں خالد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

اول خان حاضر دماغ شخص تھا۔ میرے تحفظات اور خالد کی مشکل کا ذکر سنتے ہی بات کی تہ تک پہنچ گیا "معلوم ہوتا ہے کہ خالد سے تمہاری بھرپور ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ اگر وہ کوئی فیصلہ کر چکا ہوتا تو تم اس کو سمجھا لیتے۔"

"اس وقت ہم دونوں سر جوڑے بیٹھے ہیں اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے" میں نے اسے بریف کیا۔

"ذرا مجھے تفصیل بتاؤ پھر خالد سے میری بات کرا دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس وقت کم ہے۔ تم لاہور چھوڑنے سے پہلے اس معاملے کو اس کے انجام تک پہنچانے کے خواہش مند ہو گے۔ اگر اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تو شاید میں خالد کو سمجھا لوں گا۔"

"یہ سب تفصیل خالد سے سن لو تو بہتر رہے گا۔ میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔ دراصل میں شاہد نامی ایک شخص کو ٹھکانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں خالد سے اب تک کوئی تازہ بات نہیں ہوئی۔ کل شام تک شواہد نہیں تھے اور خالد کو اس پر ہاتھ ڈالنے میں تھوڑا سا تامل تھا۔ اب حالات میں نمایاں تبدیلی آچکی ہے" اول خان کے لیے وہ اشارے کافی تھے۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ میں لاہور میں کیا دقت محسوس کر رہا تھا۔

خالد اور اول خان کے درمیان خاصی دیر تک بات ہوتی رہی۔ خالد کو کچھ دیر کے لیے تخلیہ فراہم کرنے کی نیت سے میں غزالہ کے ساتھ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جہاں سے روشنیوں میں ڈوبے ہوئے مال روڈ پر رواں ٹریفک کا خوبصورت منظر نظر آرہا تھا۔

وہ ہوٹل کا بند کمرا تھا مگر خالد اتنا محتاط تھا کہ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد مجھے ڈپٹی کے بجائے مظہر بھائی کہہ کر پکارا اور میں نے لپک کر اس سے ریسیور واپس لے لیا۔

ریسیور کان سے لگاتے ہی مجھے ویرا اور سلطان شاہ کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں کسی بات پر الجھ رہے تھے اور اول خان ان کی بے خبری میں اسپیکر فون آن کر چکا تھا "تم سن رہے ہو کہ یہ دونوں آپس میں کس طرح لڑ رہے ہیں" دبی دبی ہنسی کے ساتھ ریسیور میں اول خان کی تیسری آواز سنائی دی "انہوں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ میری موجودگی میں ایک آدھ جھڑپ ضرور ہو گی۔ جھگڑا یہ ہے کہ ناشتے کے برتن کون دھوئے گا؟"

"انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنے دفتر جاؤ۔ تم سے وہیں بات ہو گی۔ یہ دونوں تمہارا دماغ بھی خراب کر دیں گے۔"

"تمہیں ہمارے معاملات میں دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں" ویرا کی آواز آئی "ہم اپنے جھگڑے خود نمٹا سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ سلمیٰ کے ماموں کا کیا بنا؟"

"کچھ دیر کے لیے خاموش اور متوجہ رہو گی تو ہر بات خود بہ خود سمجھ میں آجائے گی" وہ اول خان کی آواز تھی' وہ ویرا

Downloaded from https://paksociety.com

"السلام علیکم!" اول خان کے خاموش ہوتے ہی سلطان شاہ کی آواز آنے لگی "تمہاری دعائیں مل گئی تھیں۔ ویرا سے تم نے دوسری بات کیا کہی تھی؟ وہ کہہ رہی ہے کہ اسے عملی طور پر مجھ تک پہنچائے گی۔ رات سے اس نے مجھے الجھن میں ڈالا ہوا ہے۔"

"اسے بھول جاؤ۔" میں نے دل ہی میں ہنستے ہوئے سلطان کو جواب دیا "ویرا ابھی بھول جائے گی۔"

اچانک سب آوازیں معدوم ہوگئیں۔ شاید اول خان نے بھنا کر اسپیکر فون بند کردیا تھا۔ لمحہ بھر بعد صرف وہ بول رہا تھا "واقعات میری سمجھ میں آگئے ہیں۔ شاہد کو اس طرح اٹھایا جائے گا کہ کسی کو کانوں کان پتا نہ چل چکے۔ بازپرس کے دوران میں اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایس ٹی ایف کا قیدی ہے تاکہ آزادی کے بعد وہ فورس کے خلاف کوئی زہر افشانی نہ کرسکے۔"

"شاہد کی آزادی کی بات کررہے ہو" میں نے بے یقینی سے کہا "جو نتائج ہم نے اخذ کیے ہیں وہ صحیح ثابت ہوجاتے ہیں تو وہ کسی رعایت کا حق دار نہیں رہے گا۔ اسے تو مار کر کہیں دفن کردینا ہی سب سے بہتر ہوگا۔ لوگ سمجھتے رہیں گے کہ وہ خوف زدہ ہوکر باہر بلکہ بھارت بھاگ گیا ہے۔"

"نہیں.... ایسا نہیں ہوگا" اول خان کی آواز سرد اور سپاٹ تھی "اس کے مستقبل کا فیصلہ خالد پر چھوڑ دو۔ یہ کیس بن جاتا ہے تو پاکستان کو عالمی سطح پر سرخروئی حاصل ہوگی۔ اس وقت پوری دنیا منشیات کے مسئلے سے پریشان ہے۔"

"حیرت ہے کہ فریڈم انٹرنیشنل اور صحرا کے تجربات کے بعد بھی تم اس خوش گمانی میں مبتلا ہو۔ تم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ این جی اوز کو وہی قوتیں پروان چڑھا رہی ہیں جو تمہاری بدخواہ اور دشمن ہیں۔ وہ ہیومن سوسائٹی کی چیخ کنی پر بھی شور مچائیں گی۔"

"وہ این جی اوز میں سیاسی اور معاشی مقاصد کے حصول کے لیے سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ منشیات کے فروغ کے تصور سے ان کی جان نکلتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ کیمیکل کا دھندا چوہدری عظمت کی ہوسِ زر کا نتیجہ رہا ہوگا۔ آدمی کے پاس دولت کا ڈھیر جتنا بڑھتا جاتا ہے' ہوس میں اسی قدر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کاروباری آمدنی' عطیاتی فنڈز اور این جی اوز گرانٹ کے بعد اسے اپنا منہ کالا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی اس کے لیے آواز نہیں اٹھائے گا۔"

"یہ اچھا ہوا کہ تمہاری اور خالد کی بات ہوگئی۔ میں اس کے لیے کوئی دشواری پیدا نہیں کروں گا۔ مجھے صرف شاہد کے اعترافات کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہاری [illegible] تمہارے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔"

میں نے فون بند کردیا۔ میرے فارغ ہوتے ہی خالد بولا "اول خان میری اس رائے سے متفق ہیں کہ چوہدری عظمت کو براہِ راست نہ چھیڑا جائے بلکہ تمہاری ابتدائی تجویز کے مطابق شاہد کو استعمال کیا جانا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے جلد از جلد اسٹیشن تھری پہنچا دیا جائے۔ اس کے قابو میں آتے ہی تمہیں مطلع کردیا جائے گا۔ سنا ہے کہ تمہاری بازپرس کے سامنے بڑے بڑے ضدی مجرم بے بس ہوجاتے ہیں۔"

"وقت آنے پر دیکھا جائے گا کہ شاہد کے معاملے میں ہمیں کتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔"

وہ رات بھر کا تھکا ہوا تھا۔ نئی سرگرمیوں کے آغاز سے پہلے کچھ دیر کے لیے آرام کی شدید ضرورت محسوس کررہا تھا۔ صرف چائے پی کر کچھ دیر بعد واپس چلا گیا۔

"میں محسوس کررہی ہوں کہ خالد کے ساتھ کام کرنے میں آپ کچھ دشواری محسوس کررہے ہیں" اس کے جانے کے بعد غزالہ نے ہلکی سی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "شروع سے ہی آپ دونوں کا رویہ مدافعانہ ہے۔ اس میں اول خان والی بات نہیں ہے۔"

"شروع میں اول خان بھی اتنا مددگار نہیں تھا۔ مفاہمت کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ وہ میرے بارے میں سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرکے اپنی نوکری کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ کچھ دن کے لیے ہمیں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تو شاید یہ اول خان کو بھی پیچھے چھوڑ دے۔"

ہم دونوں ناشتے سے فارغ ہوچکے تھے۔ غزالہ کی تجویز پر ہم نے کپڑے تبدیل کیے اور لاہور کی سیر کے لیے ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔

لاہور کی قدیم تاریخی شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔ پرانے شہر کی حدود میں جابہ جا تاریخی عمارات و یادگاریں بکھری ہوئی ہیں لیکن شہر کے مزاج سے واقفیت کے لیے سب سے بہتر مقام یادگارِ پاکستان ہے جہاں متعدد نئی اور پرانی یادگاریں ہر آنے والے کو مسحور کردیتی ہیں۔ شاہی قلعہ' بادشاہی مسجد' مینارِ پاکستان' منٹو پارک' سب آس پاس واقع ہیں اور ان کی تفصیلی سیر کے لیے کئی دن بھی ناکافی ہیں۔ میں ٹیکسی لے کر اسی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں کی گوناگوں دلچسپیوں میں ہم بہت آرام سے اپنا وقت گزار سکتے تھے۔ جس وقت بھی تھکن محسوس ہوتی' بقیہ سیر اگلے دن کے لیے موقوف کرکے واپس آسکتے تھے۔

ہوٹل سے روانگی کے وقت غزالہ بہت پرجوش تھی [illegible] اور حسین منظر دیکھنے

Downloaded from https://paksociety.com

کے بعد ہم بادشاہی مسجد کی حدود میں داخل ہوئے تو اندازہ ہوا کہ کافی وقت گزر چکا تھا۔ بادشاہی مسجد اور اس کے احاطے میں علامہ اقبال کے مزار سے لوٹتے ہوئے شام کے سائے دراز ہونے لگے تھے۔ کئی گھنٹوں تک پیدل چلنے کی وجہ سے ہم دونوں تکان محسوس کر رہے تھے۔ مسجد کے دوسرے دروازے سے نکل کر ہم واپس چل دیے۔

ہوٹل میں ہمارے لیے دو پیغام موجود تھے۔ دونوں خالد کی طرف سے تھے۔ وہ ہمارے جوابی فون کا منتظر تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے انٹیشن تھری کا نمبر ملایا تو وہ وہاں موجود تھا۔

"اب میں مایوس ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کہیں دور نکل گئے تھے" اپنی ہیلو کے جواب میں مجھے خالد کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔

"زیادہ دور نہیں' بس بادشاہی مسجد تک گئے تھے۔ تمہاری کال کی توقع ہوتی تو ہوٹل میں ہی رکے رہتے۔"

"شاہد بہت اوباش اور رنگین مزاج آدمی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے گھیرنے کے لیے کیوں نہ کوئی رنگین جال ڈالا جائے۔ وہ کوئی مزاحمت کیے بغیر' بہت آسانی سے ہمارے قابو میں آجائے گا۔ کوئی اور طریقہ اختیار کیا تو وہ ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بار خطرے کی بو سونگھ لی تو دوبارہ قابو میں نہیں آسکے گا" وہ بتا رہا تھا "کسی کو ملازمت کی تلاش میں ہیومن سوسائٹی بھیجا جائے تو شاہد ضرور اسے رجھانے کی کوشش کرے گا۔"

اس کی وہ تجویز سنتے ہی میں سوچ میں پڑ گیا کہ چارے کے طور پر اس کے ذہن میں کس کا نام تھا۔ میں نے بہت محتاط رہتے ہوئے پوچھا "اس کام کے لیے تم کسے بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" مجھے ڈر تھا کہ میں نے اس کی تجویز کی تائید کی اور اس نے غزالہ کا نام لے دیا تو بات بہت سنگین ہو سکتی تھی۔

"معاملہ بہت نازک ہے۔ کرائے کی کسی لڑکی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا" اس کی تمہید پر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں مگر خالد کے مزاج میں گستاخی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ وہ میل جول اور مراتب کے آداب سے واقف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں سوچ رہا ہوں کہ فرزانہ کو وہاں بھیج دوں۔"

میرے دہانے سے بے اختیار اطمینان کا ایک گہرا سانس خارج ہو گیا "میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تمہاری بیوی ایک خالص گھریلو عورت ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ساتھ شاہد کا رویہ کیا ہو گا۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا! یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ غزالہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ ہتھیار چلا لیتی ہے' مارشل آرٹس سے واقف ہے پھر بھی میں اسے یہ کام نہیں سونپ سکتا۔ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو زندگی بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"بیگم صاحبہ' بالکل ناموزوں ہیں۔ ان کے بولنے سے پہلے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ لاہوری نہیں ہیں۔ کوئی خوش شکل مقامی لڑکی ہی یہ کام کر سکتی ہے" اس نے غزالہ کا نام یکسر مسترد کر دیا "میں اس تجویز کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہ رہا تھا۔ طریقہ مناسب سمجھو تو میں کسی اور کو ڈھونڈتا ہوں۔"

"اگر اس نے ہیومن سوسائٹی کے دفتر ہی کو اپنا عشرت کدہ بنایا ہوا ہے تو تجویز خطرناک ہے۔ لڑکی اسے اس کی کچھار سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ کوشش ضرور کی جانی چاہیے۔ کسی شور شرابے کے بغیر ہمارا کام پورا ہو جائے گا۔"

خالد سے بات ختم ہو گئی لیکن میرے دل و دماغ پر اس کی پیشکش کے گہرے اثرات چھائے رہے۔ جب تک وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا' شاہد کو چھیڑنے پر بھی آمادہ نہیں تھا لیکن جب اس اقدام کی افادیت اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تو وہ اسے پھانسنے کے لیے اپنی بیوی کو بھی آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ وہ مقصد سے لگاؤ کا بے مثال ثبوت تھا۔ جو لوگ اپنے کام سے مخلص ہوں' وہ مقصد کی تکمیل کے لیے نہ صرف سب کچھ کر گزرتے ہیں بلکہ اپنی جانوں پر بھی کھیل جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دم قدم سے قومیں روئے زمین پر فخر سے اپنا سر بلند کر کے اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں اس قبیل کا آخری آدمی موجود رہتا ہے۔

سات بجے خالد نے فون پر اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اسے اپنی خواہش کے مطابق ایسی کوئی لڑکی نہیں مل سکی تھی جسے شاہد کے لیے چارے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

"اس وقت شاہد کہاں ہے؟" میں نے اس کا مایوسانہ جواب سن کر پوچھا۔

"ہیومن سوسائٹی کے دفتر کی نگرانی ہو رہی ہے' ابھی وہ وہیں موجود ہے۔"

"پھر تم فوری طور پر ہوٹل آجاؤ۔ میں ہوٹل کی لابی میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"کسی تیاری کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دو" کچھ پوچھ گچھ کے بغیر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ تم لاہور سے واقف ہو اور مجھے آسانی سے اسٹیشن تھری تک بھی پہنچا سکتے ہو۔ اس وقت یہی دو بنیادی ضروریات ہیں۔"

"آل رائٹ! میں پندرہ منٹ میں تمہارے ہوٹل پہنچ رہا ہوں" اس جواب کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا۔

Downloaded from https://paksociety.com

وہ خالد کی فون کال تھی۔ میں نے جو کچھ کہا' وہ خالد کے جواب میں کہا تھا۔ غزالہ کو گمان تک نہیں تھا کہ یوں اچانک کوئی پروگرام بن جائے گا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ فون بند ہونے کے بعد اس کی زبان کھل گئی "یہ آپ نے کیا کیا؟ طے ہو چکا تھا کہ آپ یہاں کسی لمبے بکھیڑے میں نہیں الجھیں گے لیکن آپ ہیومن سوسائٹی کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ ملوث ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟"

"میں جو کچھ کر رہا ہوں' اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ چکر جلد از جلد ختم ہو جائے۔ وہ اپنی بیوی تک کو میدان میں اتارنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ یہ جان لینے کے بعد مناسب نہیں تھا کہ میں اپنی طرف سے کوئی پیش کش نہ کرتا۔ تم فکر نہ کرو' میں تھوڑی دیر بعد ہوٹل لوٹ آؤں گا۔"

"شاہد موم کا کوئی پتلا نہیں ہے۔ وہ جسیم' پھرتیلا اور حاضر دماغ نظر آ رہا تھا۔ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا" غزالہ فکر مند تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ الٹ کر اس کے سامنے کر دیا "یہ انگوٹھیاں دیکھ رہی ہو۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ زیادہ ہاتھ پیر نہیں چلا سکے گا۔"

"یہ انگوٹھیاں وغیرہ اس وقت کام کریں گی جب وہ آپ کو اپنے قریب آنے کا موقع دے گا۔ بظاہر وہ انجان بن کر اپنے دفتر سے نکلتا چلا گیا تھا مگر مجھے شبہ ہے کہ وہ ہم دونوں کو دیکھ چکا ہے۔ اس نے دور سے آپ کو پہچان لیا تو وہ گولی چلانے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

"تمہاری باتوں سے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے میں خود کشی کرنے کے ارادے سے جا رہا ہوں اور تم مجھے اس سے روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ خطرے کی صورت میں ہم اس سے دور رہیں گے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کریں گے۔ مجھے بھی اپنی جان بہت عزیز ہے۔"

غزالہ نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ خالد سے پروگرام طے کر لینے کے بعد میرا پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے مسائل اور اگلے پروگرام صرف ہمارے علم میں تھے۔ خالد کو ان کی بھنک نہیں ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے میری پیشکش پر کسی تردد کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن پر بس ایک دھن سوار تھی کہ شاہد کو اغوا کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ ہر قیمت پر وہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے تھا۔

اپنی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد غزالہ نے نصیحتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ بولتی رہی۔ میں کپڑے بدلنے کے دوران میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ تیاری مکمل ہو گئی تو اسے دلاسا دے کر میں ہوٹل کے کمرے سے نکل گیا۔

لابی میں مجھے زیادہ دیر تک خالد کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد وہ آ پہنچا۔ دروازے پر اس کی جھلک دیکھتے ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خالد نے میری گود میں ایک چھوٹا سا اپریٹس ڈال کر کہا کہ میں اسے آن کر دوں۔ پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکالتے ہوئے اس نے میرے استفسار پر بتایا کہ وہ ٹرانسمیٹر اس کے ان آدمیوں سے رابطے کا ذریعہ تھا جو ہیومن سوسائٹی کی نگرانی کر رہے تھے۔

میں نے اپریٹس آن کر دیا۔ اس پر ہلکے ہلکے ریڈیائی شور کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے اپریٹس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ذرا معلوم کرو کہ اب وہ کہاں ہے؟"

خالد نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ دوسرے سے اپریٹس کا بٹن دبا کر اپنا سوال نشر کیا۔ لائن اوور ہوتے ہی اسے رپورٹ مل گئی۔ شاہد بدستور دفتر میں تھا۔ چوہدری عظمت کا اس روز بھی دفتر میں کوئی پتا نہیں تھا۔ خالد نے پیغام سننے کے بعد گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"تم اس سے دفتر میں ملنے کا ارادہ تو نہیں کر چکے؟" چند لمحوں کے سکوت کے بعد خالد نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں مجھ سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے" میں نے ہنس کر جواب دیا "ہماری کوشش ہوگی کہ راستے میں اسے کسی ویران جگہ پر رکنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ ایک بار ہم اس کے قریب پہنچ گئے تو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش کر دیا جائے گا۔"

"تمہارے جسم سے پرفیوم کی خوشبو آ رہی ہے۔ میرا پسینہ زیادہ بدبودار نہیں ہے پھر وہ کیسے بے ہوش ہوگا؟" اس نے ہنس کر سوال کیا۔

میں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اسے دکھائی "اس میں نگینے کی جگہ کیپسول ہے۔ دباؤ پڑنے سے کیپسول میں بھرا ہوا سریع الاثر محلول ایک ننھی سی کھوکھلی سوئی سے گزر کر آٹو انجکشن کے اصول کے تحت اس کے جسم میں داخل ہو جائے گا۔"

"نایاب اور کارآمد انگوٹھی ہے" خالد نے حیرت اور مسرت سے کہا "ایسی انگوٹھیاں کہاں سے مل سکتی ہیں؟"

میں نے اول خان کا نام لینا مناسب نہ سمجھا "میرے پاس بھی یہ اکلوتی انگوٹھی ہے' جس دن اس کا کیپسول خالی ہو گیا' یہ ناکارہ ہو جائے گی۔ ایک دوست نے بہت پیار سے تحفے میں دی تھی۔ بازار میں کہیں دستیاب نہیں ہوگی۔"

میری توجہ اچانک خالد کے سکون نظر آنے لگا۔ اگلا موڑ کاٹتے ہوئے وہ بولا "ہمیں سب کچھ طے کر لینا چاہیے۔ میں

Downloaded from https://paksociety.com

اسے دوسری نشست پر دھکیل کر اس کی گاڑی سنبھال لوں گا۔ تم اس گاڑی میں میرے پیچھے آؤ گے۔ اسے ہم گاڑی سمیت اسٹیشن تھری لے جائیں گے۔ اس کی گاڑی شہر میں لاوارث کھڑی ہوئی دیکھ لی گئی تو معاملہ گڑبڑ ہوجائے گا۔ حالات نے اجازت دی تو اسے گاڑی سمیت کہیں واپس چھوڑ دیا جائے گا۔"

"مجھے اس کی آزادی کی توقع نہیں ہے۔ اگر ہمارے منصوبے کا پہلا حصہ مکمل ہوجاتا ہے تو تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ شاہد کو اس کے اعترافات سمیت کس ادارے کے حوالے کیا جائے۔"

"اس کیس میں پولیس سے اینٹی نارکوٹکس فورس تک سارے سویلین ادارے دلچسپی لیں گے۔ میرا ارادہ پولیس والوں سے تعاون کرنے کا ہے۔"

"میری رائے میں یہ کیس اینٹی نارکوٹکس والوں کو جانا چاہیے تاکہ منشیات اور این جی اوز کے حوالے سے اس کی تشہیر ہوسکے۔ ایک عام پولیس کیس بننے کی صورت میں اس کی اہمیت ختم ہوکر رہ جائے گی۔"

"اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ میری دعا ہے کہ ہم اپنی ابتدائی کوشش میں کامیاب ہوجائیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم ہیومن سوسائٹی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ خالد نے گاڑی اس عمارت سے کچھ پہلے ایسی جگہ پارک کردی جہاں روشنی کم تھی اور پہلے سے چند گاڑیاں پارک کی ہوئی تھیں۔ خالد اور اس کے آدمیوں کے پاس لاسلکی مواصلاتی آلات موجود تھے مگر وہ غیر ضروری طور پر انہیں استعمال نہیں کررہے تھے۔ جب سے خالد نے ان سے رپورٹ لی تھی' اس کے آدمیوں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔

"نمبر ون کالنگ فار نمبر ٹو..... اوور!" کئی منٹ کے طویل اور بوجھل انتظار کے بعد خالد نے ٹرانسمیٹر پر پیغام نشر کیا۔

"نمبر ٹو کالنگ سر!" اپریٹس پر ہلکی سی بھرائی ہوئی مردانہ آواز ابھری "صورتِ حال ابھی تک جوں کی توں ہے۔ وہ اندر ہے۔ اس کی کالی ٹویوٹا باہر کھڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت کے دو دروازے ہیں۔ ہم دونوں ان کی الگ الگ نگرانی کررہے ہیں۔ ابھی تک نمبر تھری نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ وہ ادھر سے نکلا تو نمبر تھری فوراً لائن پر آکر رپورٹ دے گا۔ کچھ ہونے تک ہم دونوں اسٹینڈ بائی پر ہیں' اوور!"

"گڈ! اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ میں قریب ہی موجود ہوں..... اوور اینڈ آل!" گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

اس رات شاہد نے ہمارے اعصاب جھنجھوڑ کر رکھ دیے۔ تقریباً نصف گھنٹا یوں ہی بے کار جیسے گزر گیا لیکن شاہد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی۔

آٹھ بجے کے بعد اپریٹس پر دوسری آواز ابھری۔ بولنے والا پرسکون تھا مگر خبر ہیجان انگیز تھی۔ شاہد ہیومن سوسائٹی کے دفتر کے صدر دروازے سے باہر آرہا تھا۔

"فوراً گاڑی میں جاؤ۔ میں اپنی جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ تم پروٹوکول فارمیشن لوگے اور سگنل کے بغیر کسی معاملے میں مداخلت نہیں کروگے۔ یہ بہت اہم ہے۔ اس کی گاڑی کا رخ کس سمت میں ہے' اوور!"

"گاڑی کا رخ جنوب کی طرف ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سیدھا جائے گا یا یوٹرن لے گا۔ وہ گاڑی تک پہنچ چکا ہے' اوور!"

خالد نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کرلیا اور اضطراری لہجے میں بولا "وہ بہت تیز ڈرائیونگ کا عادی ہے۔ تم پوزیشن بتاتے رہو' اوور!"

"گاڑی چل پڑی ہے۔ وہ جنوب کی طرف چلا ہے۔ ہم بھی حرکت میں آگئے ہیں۔ آپ جہاں بھی نظر آئے' ہم پیچھے ہوجائیں گے' اوور!"

"وہ اسی طرف آرہا ہے" خالد ٹرانسمیٹر گود میں رکھ کر بڑبڑایا۔ اسی لمحے کالے رنگ کی ایک نئی ٹویوٹا بہت تیزی سے ہمارے سامنے سے گزری۔ خالد کی گاڑی بھی اچھل کر سڑک پر آگئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک تیسری بڑی گاڑی ہمارے پیچھے تھی جس کی رفتار یکایک کم کی گئی تھی۔

چند ثانیوں بعد تینوں گاڑیاں سڑک پر تیزی سے سفر کررہی تھیں۔ عقب نما آئینوں کے زاویے خالد کی مدد کررہے تھے مگر میں نے گردن گھما کر دیکھ لیا تھا کہ تیسری گاڑی مناسب فاصلے سے ہمارے پیچھے چلی آرہی تھی۔

شاہد کی کار تیزی سے گلیوں میں سفر کررہی تھی۔ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ جلد از جلد کسی خاص سڑک تک پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ آخر کار اس کی کار بائیں طرف مڑ کر ایک کشادہ اور دورویہ سڑک پر آگئی۔

"یہ کیمپس سے ہوتا ہوا نہر عبور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے" خالد ایک بار پھر اپریٹس پر بات کررہا تھا "اس کا رخ پارک ٹاؤن کی طرف ہے۔ تم کہیں بھی آگے نکل جاؤ۔ تمہیں کسی سنسان مقام پر اس کی گاڑی سے ہلکا سا تصادم کرنا ہے۔ اسے روکنے کے بعد تمہارا کام پورا ہوجائے گا' اوور!"

اس دوران میں' میں سڑک کے وسطی سبزے پر لگے ہوئے کنکریٹ کے بورڈ پر سڑک کا نام پڑھ چکا تھا۔ تینوں گاڑیاں علامہ اقبال ٹاؤن کی مین بولیوارڈ سے گزر رہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد جان دار انجن والی ایک تیز رفتار پک اپ عراقی اور اپنی ہوئی ہماری گاڑی سے آگے نکل

Downloaded from https://paksociety.com

گئی۔ وہ ہمارے عین پیچھے سے نمودار ہوئی تھی اور یقینی طور پر خالد کے آدمیوں کے استعمال میں تھی۔

یونیورسٹی کیمپس کے آغاز سے پہلے ڈیزل پک اپ نے اپنا کام دکھادیا۔ وہ سڑک۔۔۔ اپنی کشادگی کے اعتبار سے خاصی مصروف معلوم ہوتی تھی مگر اس وقت وہاں زیادہ ٹریفک کا دباؤ نہیں تھا۔ پک اپ کے ڈرائیور نے ہلکا سا سائڈ دیا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ کالی ٹویوٹا کے فینڈر سے ٹکرایا۔ شاہد کی کار سڑک پر لہرائی اور پھر کنارے پر رک گئی کیونکہ پک اپ نے اس کے دوبارہ سڑک پر چڑھنے کا راستہ مسدود کیا ہوا تھا۔

پلک جھپکتے میں ہماری گاڑی بھی کالی ٹویوٹا کے قریب پہنچ گئی۔

میں نے گاڑی رکنے سے پہلے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگادی کیونکہ کالی ٹویوٹا کا دروازہ ایک بار کھل جاتا تو شاہد کو زیر کرنا مشکل ہوجاتا۔ بات بڑھتی تو سڑک پر تماشا دیکھنے والی گاڑیوں کی خاصی تعداد رک سکتی تھی۔ اس وقت تک پک اپ سے کوئی نیچے نہیں اترا تھا۔

شاہد اشتعال کے عالم میں مغلظات بک رہا تھا۔ اپنی گاڑی کا انجن بند کرنے کے بعد اس نے ہینڈ بریک کھینچا ہوگا۔ اس کے بعد اسے اپنا دروازہ کھولنا نصیب نہ ہوسکا۔ جوں ہی اس نے دروازے کے لیور پر ہاتھ ڈالا میں نے گھٹنا لگا کر دروازہ وہیں روک دیا اور اترے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر شاہد کے داہنے رخسار پر ایک ہلکا سا گھونسا رسید کردیا۔ وہ ضرب برائے نام تھی۔ اصل مقصد کیپسول کا سیال اس کے جسم میں اتارنا تھا۔ اس میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک بہت وزنی گالی اس کے منہ میں ادھوری رہ گئی اور بیٹھے بیٹھے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

شاہد کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی میں لپک کر ٹویوٹا کے دوسرے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس اثنا میں خالد اپنی گاڑی پارک کرکے وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے شاہد کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے۔ خالد نے پائیدان سے اس کی ٹانگیں اٹھائیں اور چشم زدن میں اسے پسنجر سیٹ پر پہنچادیا گیا۔ خالد نے پورے اطمینان سے کالی ٹویوٹا کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں پرسکون انداز میں ٹہلتا ہوا خالد کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سب واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوئے کہ سڑک پر سے گزرنے والی کسی گاڑی کے مسافروں کو گڑبڑ کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ زیادہ سے زیادہ یہ نظر آیا کہ کسی وجہ سے تین گاڑیاں سڑک کے کنارے رکی ہوئی تھیں۔

سفر کے لیے خالد نے پروٹوکول فارمیشن کا لفظ استعمال کیا تھا جب گاڑیوں نے دوبارہ پرانی ترتیب میں سفر شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ [illegible]

تھی۔ ایس ٹی ایف کا مقامی سربراہ رہنمائی کررہا تھا' مہمان اس کی تقلید کررہا تھا۔ کارکنوں کی ڈیزل پک اپ سب سے پیچھے تھی۔

پنجاب یونیورسٹی کیمپس کے اختتام پر کینال بینک روڈ کا سگنل تھا۔ کالی ٹویوٹا وہاں سے بائیں طرف گھوم گئی مجھے سمتوں کا اتنا ادراک تھا کہ میں نے سمجھ لیا کہ اس وقت ہم مال روڈ کی طرف جارہے تھے جہاں سے اسٹیشن تھری کا راستہ بالکل سیدھا تھا۔

اسٹیشن تھری کا ڈیوٹی اسٹاف اپنی جگہوں پر مستعد تھا۔ شاید ان لوگوں کو علم تھا کہ ان کا اسٹیشن کمانڈر کسی اہم مشن سے لوٹنے والا تھا۔ چیک پوسٹ پر مامور عملے سے سلام لیتا ہوا' خالد اپنی بیرک پر پہنچا تو وہاں بھی کئی سادہ پوش افراد اس کے منتظر تھے۔

"قیدی کو سیل میں ڈال کر کالی گاڑی ورکشاپ میں پہنچا دو۔" خالد نے اپنے ماتحتوں کو ہدایت دی اور مجھے لے کر اپنے دفتر کی طرف ہولیا۔ اس وقت تک ہمارے پیچھے آنے والی ڈیزل پک اپ بھی دھیرے دھیرے کیمپ کے دوسرے حصے میں پہنچ چکی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ تمام تر خطرات کے باوجود ہمارا وہ کام بہت سبک روی سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

دفتر میں پہنچ کر خالد نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر ابتدائی کامیابی پر مبارک باد دی۔ "ایک مرحلہ کامیابی سے سر ہوگیا۔ یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے۔"

"شاہد کو چھت سے الٹا لٹکوا دو۔ کوئی شخص اس کے منہ پر ٹھنڈا پانی ڈالتا رہے تاکہ وہ جلد ہوش میں آسکے۔"

"اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہ کرلیا جائے۔" خالد نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بے سود ہے۔ وہ بہت مضبوط اور ضدی آدمی ہے۔ آسانی سے راہِ راست پر نہیں آئے گا۔" میں نے سگریٹ کا کش لے کر جواب دیا "آنکھ کھلتے ہی خود کو الٹا لٹکا ہوا پائے گا تو اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھنے والوں میں سے ہے۔ نرم و نازک باتیں اس پر کوئی اثر نہیں کریں گی۔"

خالد نے انٹرکام پر کسی آدمی کو قیدی کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے کھانے کے لیے بھی ہدایات دے دیں۔

"ابھی نو بھی نہیں بجے۔ تمہیں ابھی سے بھوک ستانے لگی۔ کیا عام طور پر اسی وقت کھانا کھالیتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کھانا ہم دونوں کے لیے آرہا ہے۔ وقت ہے تو کھانے [illegible] کے بعد شاید موقع نہ

Downloaded from https://paksociety.com